یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری

انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار

نامِ کتاب	انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار
تالیف	حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری
ترجمہ	مولانا اسد علی شجاعتی - سید سعید حیدر زیدی
ناشر	مرکز نشر معارف اسلامی درجہان
طبع اوّل	رمضان ۱۴۱۵ھ - فروری ۱۹۹۵ء
تعداد	۲۰۰۰

فہرست

چوتھا باب
فرائض کے محور پر زندگی کی گردش

پانچواں باب
آرام وسکون کا سرچشمہ کہاں ہے؟

چھٹا باب
زندگی پر نیکیوں کے اثرات

ساتواں باب
قدردانی، پیش رفت کا عظیم عامل

آٹھواں باب
صبرِ وشکیبائی کامیابی کا پُل ہے

نواں باب
حقیقی عزت و شرافت

دسواں باب
مغرور کا ذہنی اختلال

گیارھواں باب
قوتِ ارادی کے کرشمے

بارھواں باب
دوستوں کے انتخاب میں احتیاط

***

مولف کی مختصر سوانح اور خدمات

حجۃ الاسلام والمسلمین آقائی سید مجتبیٰ موسوی لاری، آیت اللہ سید علی اصغر لاری کے فرزند ارجمند ہیں۔ سید علی اصغر لاری کا شمار ایران کے بڑے مجتہدین اور اور معروف سماجی شخصیات میں ہوتا تھا، ان کے والدِ گرامی آیت اللہ حاج سید عبدالحسین لاری تھے جو زمانۂ مشروطیت کے حریّت پسندوں اور انقلابیوں میں سے تھے۔ سید عبدالحسین لاری اپنے وقت کی استبدادی حکومت کے خلاف طویل جدوجہد کے نتیجہ میں ایک مختصر مدّت کے لئے لارستان میں اسلامی حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہوئے۔

آقائی سید مجتبیٰ موسوی لاری ۱۳۱۴ ہجری شمسی میں شہر لار میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اور علومِ اسلامی کے مقدمات کی تحصیل لار ہی میں کی اور ۱۳۳۲ھ-ش میں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے حوزۂ علمیہ قم کا رخ کیا۔ یہاں آپ نے دورانِ تعلیم حوزۂ علمیہ کے بزرگ اور جیّد علماء کرام سے استفادہ کیا۔

۱۳۴۱ھ-ش میں آپ نے دینی و علمی مجلّہ مکتبِ اسلام میں اسلامی اخلاق کے موضوع پر مقالات کا ایک سلسلہ تحریر کر کے اس سے اپنے تعاون کا آغاز

کیا۔ مذکورہ مقالات بعد میں "مشکلاتِ اخلاقی و روانی" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب کی صورت میں نشر ہوئے۔ اب تک اس کتاب کے فارسی زبان میں ۱۴ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ۱۰ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں یہ کتاب "اخلاقی و نفسیاتی مشکلات کا حل" کے نام سے طبع ہو کر اردو خواں قارئین سے سندِ قبولیت حاصل کر چکی ہے۔

۱۳۴۲ھ-ش میں آپ مسلسل علالت کی بنا پر علاج کی غرض سے جرمنی تشریف لے گئے اور چند ماہ علاج معالجہ کے بعد ایران تشریف آوری کے بعد "اسلام و سیمائی تمدّنِ غرب" کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب تالیف فرمائی، اس کتاب میں آپ نے اسلام اور مغرب کے تمدنی مسائل کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی اور ایک جامع، مستدل اور دقیق موازنہ کے ذریعہ مغربی تمدّن پر اسلامی تہذیب کی جامع اور مختلف پہلوؤں پر مبنی برتری کو ثابت کیا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ۸ مرتبہ طبع ہو چکی ہے اردو میں بھی یہ کتاب "مغربی تمدّن کی ایک جھلک" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔

مذکورہ کتاب کو ۱۳۴۹ھ-ش میں ایک برطانوی مستشرق پروفیسر فرانس گولڈنگ (F.J.Goulding) نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ جسے یورپ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا یہاں تک کہ متعدد مغربی اخبار و جرائد میں اس کتاب کے بارے میں مقالات تحریر کئے گئے۔ برطانوی ریڈیو نے بھی کتاب کے مترجم سے ایک انٹرویو کیا اور اس کتاب کے ترجمہ کے سبب اور کتاب کے مباحث کے بارے میں گفتگو کی۔

اب تک اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ۳ مرتبہ برطانیہ میں، ۱۰ مرتبہ ایران

میں اور ۳ مرتبہ امریکہ میں طبع ہو چکا ہے۔

پروفیسر گولڈنگ ہی نے مصنف کا ایک رسالہ بعنوان "خداشناسی" بھی ترجمہ کیا ہے۔ جو اب تک ۷ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

اس رسالہ کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے ۳ سال بعد جرمنی میں یونیورسٹی کے ایک استاد بنام "ڈاکٹر رولف سینگلر" نے جرمن زبان میں اس کا ترجمہ کیا کہ جس نے اپنے پڑھنے والوں پر گہرا اثر چھوڑا حتیٰ جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے ایک رہنما نے مترجم کو خط تحریر کیا جس میں کہا کہ "اس کتاب کے مطالعہ نے مجھ پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ اور اسلام کے بارے میں میرے خیالات کو بدل دیا ہے اور میں اپنے دوستوں کو اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دوں گا۔"

اسی زمانہ میں علماء ہندوستان میں سے جناب مولانا روشن علی نے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کے بعد ہندوستان و پاکستان میں شائع ہوا اور اب تک ۵ مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔ یہ رسالہ اب تک انگریزی، جرمن، اردو، فرانسیسی، اسپانوی، عربی، تھائی، چینی، روسی، ملائی، کُردی، تاتاری اور بوسنیائی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اب بھی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جارہا ہے۔

۱۳۴۳ھ-ش میں آپ نے لار شہر میں ایک فلاحی ادارہ کی بنیاد رکھی اور اسلامی تبلیغات اور دیہی علاقوں میں زندگی بسر کرنے والے نوجوانوں کو اسلامی اصولوں سے آگاہ کرنے کے لئے نیز محتاجوں کی مدد کے واسطے خدمات کا آغاز کیا۔ اس مرکز نے ۱۳۴۶ھ-ش تک اپنا کام جاری رکھا۔ اس ادارہ کے خاص

خاص کام، دیہاتوں میں نوجوانوں اور بچّوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لئے مبلغین کا اعزام، دینی کلاسوں کی تشکیل اور ہزاروں غریب طلباء کو لباس اور کتب و اسٹیشنری کی فراہمی تھا۔ اس ادارہ کے کاموں میں دیہاتوں میں مساجد، امام بارگاہوں، مدارس اور ہسپتالوں کی تعمیر بھی شامل تھے۔ اس ادارہ کی طرف سے اسی طرح کی دوسری خدمات بھی فراہم کی جاتی تھیں۔

آپ نے اخلاقِ اسلامی کے بارے میں مقالات کی تحریر کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۳۵۳ھ۔ش میں ان مقالات کے مجموعہ کو نظرِ ثانی اور اضافات کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں "رسالتِ اخلاق در تکاملِ انسان" کے نام سے نشر کیا جو ایران میں اب تک چھ مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی تالیف کا اردو ترجمہ ہے۔

۱۳۵۷ھ۔ش میں ایک امریکی انجمن کی طرف سے دعوت پر اور معالجہ کی غرض سے امریکہ تشریف لے گئے اس موقع سے استفادہ کرتے ہوئے آپ نے وہاں کے صاحبِ نظر اور ذمّہ دار حضرات سے غیر ملکی زبانوں میں اسلام کے اعتقادی مسائل پر مطبوعات کی نشرو اشاعت کے سلسلہ میں گفتگو کی۔ اس کے بعد برطانیہ و فرانس کا سفر اختیار کیا، واپسی پر مجلّہ سروش میں اسلامی آئیڈیالوجی پر مقالات تحریر کیئے۔ مقالات کا یہ مجموعہ جو اسلامی عقائد کے اصولوں پر مبنی تھا۔ "مبانیِ اعتقادات در اسلام" کے نام سے چار جلدوں میں طبع ہوا جس میں توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد کے موضوعات شامل تھے۔ یہ کتب اب تک چھ مختلف زبانوں میں طبع ہو چکی ہیں۔

۱۳۵۹ھ۔ش میں آپ نے حوزہ علمیہ قم میں "دفترِ گسترشِ فرہنگِ اسلامی

خارج از کشور" کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جس کا نام بعد میں بدل کر "مرکزِ نشرِ معارفِ اسلامی در جہان" رکھ دیا گیا۔

اس مرکز نے آثار اسلامی خصوصاً آنجناب کی ترجمہ شدہ تالیفات اور مختلف نقاطِ عالم میں اسلامی تعلیمات اور قرآنی مفاہیم کی نشرو اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔

اس تبلیغی مرکز کی جانب سے شائع کی جانے والی کتب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہزارہا اداروں، مدرسوں، گروہوں، انجمنوں اور علومِ اسلامی کے تشنہ افراد کو درخواست پر بلاقیمت ارسال کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے بکثرت افراد کے اسلامی حقائق سے روشناس ہونے اور بہت سے غیر مسلموں کے دینِ اسلام قبول کرنے کے سلسلہ میں اس مرکز کی اسلامی و ثقافتی خدمات کے ثمرات و نتائج کا مشاہدہ ان ہزارہا خطوط کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے جو اس مرکز کو موصول ہوئے ہیں۔ اب بھی دسیوں ہزار خطوط اس مرکز کی فائلوں میں محفوظ ہیں اور تاہنوز دنیا کے مختلف علاقوں میں وسیع پیمانے پر اسلامی تبلیغ کا کام جاری ہے۔ اس مرکز نے انگریزی، فرانسیسی، اسپانوی زبانوں میں قرآنِ کریم طبع کیا ہے جو طلب کرنے والوں کو ہدیہ کیا جاتا ہے۔

آذربائیجان میں روسی زبان میں آپ کی کتب کے اثرات کے اعتراف میں ۱۳۷۲ھ۔ش میں باکو میں مستقر اکادمی علوم جمہوری آذربائیجان نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی ہے۔

"میں تو اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔" (پیغمبرِ اسلام)

پیش گفتار

ہم بخوبی محسوس کرتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز تغیّر و دگرگونی کا شکار ہے۔ یہی تغیّر و تبدّل زندگی کا وہ اصول ہے جس پر قانونِ آفرینش استوار ہے۔

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانہ میں

جس طرح ہمیں یہ یقین ہے کہ اس دنیا میں تغیّر و دگرگونی کو ثبات حاصل ہے اسی طرح ہمیں یہ بھی یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا میں کچھ ایسے اصول اور مفاہیم بھی ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہنے والے ہیں۔

یہ پائیدار اور ہمیشہ رہنے والے اصول "اخلاقی اصول" ہیں جن کی پیروی عقلِ سلیم کی رو سے ہم پر لازم ہے اور ہم اس بات کے پابند ہیں کہ اپنی حیات کو ان اصولوں کے سایہ میں بسر کریں۔

کسی معاشرہ کی کامیابی اور ناکامی کا ایک بڑا عامل "اخلاق" ہے اور اجتماعی
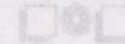
زندگی میں اس کے اثرات اظہر من الشمس ہیں۔

انسان فطری طور پر زیادہ سے زیادہ ترقی و تکامل کا خواہش مند ہے اور اس کی نظر میں ترقی و کمال کی کوئی آخری حد نہیں۔ ترقی کی راہ میں وہ اپنی تمام قوتیں و صلاحیتیں کام میں لاتا ہے۔ یہ توانائیاں انسان کے وجود میں اس وقت ہی سے موجود ہوتی ہیں جب اسے خود اپنی شخصیت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

تعلیم و تربیت کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کے جذبات و احساسات کو کنٹرول کرنا اور انہیں افراط و تفریط سے محفوظ رکھنا انسانی زندگی کا بنیادی ترین مسئلہ ہے۔ انسان کی مرموز صلاحیتوں کی ہر نوع کی نشوونما ایک نا ختم ہونے والے سرمایہ کی مانند ہے اور کیونکہ اسے اپنی حیات کے ہر ہر لمحہ میں اپنی ان اندرونی صلاحیتوں سے سروکار رہتا ہے اس لئے ان صلاحیتوں کی پرورش و نمو کی اہمیت ان علوم و معارف سے کہیں زیادہ ہے جو وہ زندگی کے مختلف ادوار میں حاصل کرتا ہے۔

ہرچند عقل اپنی طبیعی روشنی کے ذریعہ میدانِ زندگی کو روشن کرتی ہے لیکن انسان کے بنیادی غرائز جو اس کی زندگی کے تمام تحرّکات کا سرچشمہ ہیں ممکن ہے عقل کی ماتحتی قبول نہ کریں اور اپنے اصل محور سے انحراف کے ذریعے عقل کے اثر و نفوذ کو اس قدر محدود کردیں کہ انسان بے سوچے سمجھے خلافِ عقل اور خود اپنے لئے نقصان دہ تمایلات کی پیروی شروع کردے۔

یہیں سے ہمیں انسانی زندگی میں اخلاق کی اہمیت اور ان بزرگ ہستیوں کی سنگین ذمہ داری کا علم ہوتا ہے جن کو تربیتی امور سپرد کئے جاتے ہیں۔

دوسری جانب اخلاقی اصولوں پر کاربند ہونے کے سلسلے میں بہت سی

سختیوں اور محرومیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور اکثر ایسے موقعوں پر انسان کے اپنے تمایلات و خواہشات اور ان اخلاقی اصولوں کے درمیان ٹکراؤ اور تضاد کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں اگر انسان اپنی خواہشات پر عمل کرے تو اخلاقی اصول پامال ہوجاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بغیر کسی روحانی سہارے کے اخلاقی تربیت ممکن نہیں رہتی اور منہ زور خواہشات کو دبانا آسان نہیں رہتا۔

جن لوگوں کو یہ روحانی سہارا میسّر نہیں ہوتا وہ بہت جلد تمایلات و خواہشات کے دباؤ کا شکار ہوجاتے ہیں کیونکہ محض اخلاقی تربیت اتنی راسخ اور پائیدار نہیں ہوتی کہ انسان کو ہر حال میں خواہشات کی بے لگامی اور خود سری سے محفوظ رکھ سکے۔

اخلاقی اصولوں کو جامۂ عمل پہنانے کا اہم ترین ضامن اور اخلاقی فضائل کا سب سے بڑا سہارا "مذہبی ایمان" ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو احساسات و جذبات اور نفسانی خواہشات کے خلاف جنگ کے میدان میں انسان کو کامیابی اور فتح یابی کی ضمانت دیتا ہے۔

اس خدا پر ایمان جو خالقِ کائنات ہے، جس کا فرمان پوری کائنات پر جاری و ساری ہے، جو ہر شخص کی اندرونی حالت سے واقف و آگاہ ہے اور آخر کار سب کو اسی کی بارگاہ میں حاضری دینی ہے انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کے پنجوں سے اپنا دامن چھڑا سکے۔

انبیاء کرامؑ خصوصاً پیغمبرِ اسلامؐ ایک ارفع مقصد تک رسائی کے سلسلے میں لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کے افکار کی تطہیر کے لئے مبعوث کئے گئے۔

اسلامی اخلاق کی جس تحریک کی بنیاد پیغمبرِ عالی قدرؐ نے رکھی وہ اپنے تعمیری پہلو، گہرائی و گیرائی اور احساسات کے لحاظ سے یگانہ و بے مثل ہے۔ اور اس پہلو میں بھی یکتا ہے کہ اس میں انسانی نفس کی تمام باریکیوں اور گہرائیوں کو مدِّنظر رکھا گیا ہے اور ہر اس جنبش و حرکت اور فکر و ادراک جس کا سرچشمہ انسانی نفس کے اندر موجود ہے، پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

اس تحریک کا بے مثل نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بے مایہ اور زبوں حال قوم قعرِ مذلّت سے بلند ہو کر اوجِ آسمانی پر جا پہنچی۔ اس منحط معاشرہ نے ایمان و ہدایت کی مشعل کو ہاتھ میں لے کر ایک نئی حیات کی بنیاد رکھی اور ترقی و کمال کے میدان میں اس قدر آگے نکل گیا کہ اخلاق و انسانیت کا نمونہ قرار پایا، ایک ایسا نمونہ جس کی مثال آج تک تاریخ میں نہیں ملتی۔

آج بیسویں صدی میں بھی مغربی دنیا اخلاق سے بے بہرہ ہے۔ آج بھی جب اس معاشرہ کے پروردہ افراد آغوشِ اسلام میں پناہ لیتے ہیں تو ان کے جذبات و احساسات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ خود امریکی دانشوروں کا اعتراف ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد امریکی سیاہ فاموں میں ایک گہری اور تعمیری تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔ اس کے باوجود کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کا قبول کیا ہوا اسلام نقائص سے خالی نہیں۔

امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں مذہبی معاشروں پر ریسرچ کے شعبے کے سربراہ پروفیسر آئزک لنکن اپنی ایک تقریر میں (جس کا موضوع "امریکہ میں اسلام کے اثرات" تھا) کہتے ہیں۔

"امریکی سیاہ فاموں پر اسلام کے اثرات غیر معمولی ہیں۔ اسلام قبول

کرنے سے قبل یہ لوگ بدترین حالات میں زندگی گزارتے تھے۔ لیکن اب اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے وہ بہت بلند معیار پر ہیں۔

سیاہ فام مسلمانوں کے گھرانوں میں وہ انحرافات اور نشہ آور اشیاء کے استعمال کی وہ حالت سرے سے نہیں پائی جاتی جس میں آج امریکی معاشرہ وحشت ناک حد تک مبتلا ہے۔ اسی طرح نشے کے عادی غیر مسلم افراد جب دینِ اسلام قبول کرتے ہیں تو ان کی کچھ اس انداز سے تربیت ہوتی ہے کہ وہ نشے کی عادت ترک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں سے بہت سے لوگ اب معاشرے کے مفید شہری بن چکے ہیں۔ امریکہ کے سیاہ فام مسلمان کبھی دوسروں کو تکلیف دینے کے درپے نہیں ہوتے اور صرف اس صورت میں کہ جب انہیں کسی کی طرف سے خطرہ محسوس ہوتا ہے یا کوئی ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ تمام قوت اور شدّت کے ساتھ اپنا موثر دفاع کرتے ہیں۔ (روزنامہ اطلاعات شمارہ ۱۴۸۱۲-۱۷ر ستمبر ۱۹۷۶ء)

انسان کا باطن اور اس کی روح ہی اس کی تمام حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کا سرچشمہ ہوتی ہے اور کیوں کہ آج کی دنیا میں رائج نظام و قوانین انسانی روح اور اس کی معنویات پر کوئی اثر نہیں رکھتے اس بناء پر ایک صحت مند معاشرہ کی تعمیر میں ان قوتوں سے استفادہ اور انسانوں کو وسیع افق کی حامل آسمانی صفات سے متصف نہیں کرپاتے۔

انسان دو مختلف اور متفاوت قوتوں یعنی روح اور جسم کا مرکب ہے لہٰذا وہ آسمانی پہلو کا حامل بھی ہے زمینی پہلو کا مالک بھی، ابدی اور جاویدانی بھی ہے فانی

اور ناپائیدار بھی۔

مفکرین اور دانشور بخوبی آگاہ ہیں کہ روح اور جسم باہم اس قدر پیوستہ و وابستہ ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انحراف کا اثر دوسرے پر باآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی ایسا تربیتی پروگرام جو انسان کے محض ایک پہلو (یعنی جسمانی یا روحانی) پر توجہ دیتا ہو انسان کی تمام شعبہ حیات میں ترقی و خوش بختی کا ضامن نہیں ہوسکتا۔

آج کے تمام معاشرے فکری نظام کے حوالے سے بے اعتدالی کا شکار ہیں اور سب ہی افراط و تفریط کی انحرافی راہوں پر گامزن ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر یا تو محسوس اور مادّی پہلو پر ہے یا پھر معقول اور نفسیاتی پہلو پر۔ ان کے خیال میں یا تو انسان کو اصالت حاصل ہے یا کائنات کو۔ لیکن اسلام کے تربیتی مکتب میں انسان کو اس کی ازلی اور پیدائشی فطرت کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے اور ہر اخلاقی اور تربیتی مکتب سے زیادہ اُسے اس کے وظائف و ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

یہ جامع اخلاقی اور اصولی مکتب "اسلام" فردی اور اجتماعی زندگی کے لئے کلّی و جزئی اور مادّی و معنوی پہلوؤں پر محیط ایسے قوانین کا مجموعہ ہے جو بشریّت کی کامیابی، کمال اور نجات کے ضامن ہیں اور افرادِ معاشرہ ان قوانین کی پیروی کے ذریعہ قیمتی اور خوش بخت انسان بن سکتے ہیں۔

اصلاحِ معاشرہ کا آغاز انسان کو خود اپنی ذات سے کرنا چاہئے۔ بے شک اگر ہر فرد جو معاشرہ کے پیکر کے ایک عضو کی حیثیت رکھتا ہے اپنی اصلاح کا بیڑہ اٹھا لے اور نہایت صبر و جرات کے ساتھ اپنے اندر نیک اور اچھے فضائل کی

افزائش اور اپنی نفسیاتی قوتوں میں اضافے کے لئے کوشاں ہوجائے تو ان افراد میں شامل ہوجائے گا جو نوعِ بشر کی فلاح و بہبود کے لئے حالتِ جہاد میں ہیں کیونکہ معاشرہ کی اصلاح کا بڑا ذریعہ خود افرادِ معاشرہ کا انفرادی تکامل ہے۔

امید ہے زیرِ نظر کتاب کے مطالب جو اسلامی تعلیمات کے لبریز مصادر سے ماخوذ ہیں، اور اسلامی تعلیمات کی روح کے مُعترِف ہیں اور ضمنی طور پر جن میں تربیتی و نفسیاتی مسائل کے بارے میں مغربی دانشوروں کی آراء و نظریات کو بھی شامل کیا گیا ہے، اخلاقی و اجتماعی رہنمائی کے لئے سود مند ثابت ہوں گے۔ نیز امید ہے یہ کتاب تربیت کے حقیقی مقصد کی نشاندہی میں معاون و مفید ثابت ہوگی۔ اگر خداوندِ عالم کی توفیق شاملِ حال رہی اور میں اس مجموعہ میں ان عظیم حقائق کے ایک گوشہ کو بھی منعکس کرسکا جو رہبرانِ اخلاق و انسانیت کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں تو میرے لئے خوشی و مسرّت کا باعث ہوگا۔

یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ایک خلاصہ (جو اس کتاب کے ایک تہائی سے بھی کم ہے) حوزۂ علمیہ قم سے شائع ہونے والے دینی و علمی مجلّے "مکتبِ اسلام" میں چھپ چکا ہے۔ وہی باتیں کتابِ ہذا میں زیادہ جامع اور کامل صورت میں محترم قارئین کے سامنے پیش کی جارہی ہیں۔

خداوندِ متعال سے دعا ہے کہ وہ اسلام کی سعادت بخش تعلیمات کے سائے میں سب کو نجات حاصل کرنے اور کمال و ترقی کی منزلیں طے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ اسی کی جانب سے ہے اور ہماری حیثیت اس کے سامنے محض نقشِ دیوار کی سی ہے۔

سید مجتبیٰ موسوی لاری

قم المقدس

پہلا باب

فطرت اور انسانی قوتیں

انسان کمال کا شیفتہ ہے

ہر انسان جو اس وسیع و عریض کائنات میں آنکھ کھولتا ہے خواہ وہ کسی بھی معاشرے اور ماحول کا پروردہ ہو' اپنی فطرت کے حکم اور عقل کے تقاضے کے زیرِ اثر کمال کا خواہاں ہے۔ اور اس کمال کے حصول کے لئے ہر طرح کی مشکلات و مصائب برداشت کرتا ہے' اپنے ابتدائی نقص سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور ہر ہر قدم پر اپنے کمال میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ روح اور تفکر و تعقل کا حامل ہونے کی بناء پر اس کا کمال اس قدر سریع' قوی اور گہرا ہوتا ہے کہ وہ ابدیت تک جا پہنچتا ہے۔

کمال سے عشق کی یہ جبلّت صرف انسانوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ حیوانات بھی اس کے حامل ہوتے ہیں اور اس راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو پیروں تلے روندتے ہوئے' ہر ضرر رساں چیز سے گریز کرتے ہوئے اپنے ہدف کی جانب تیز رفتاری سے سفر جاری رکھتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ بے انتہا چھوٹے ذرّات "ایٹم" سے لے کر بڑے بڑے اجرام تک تمام مظاہرِ قدرت' سب اسی کارواں کے شریک ہیں۔

ایک دانشور لکھتا ہے:

"گندم کا دانہ بھی حرکت رکھتا ہے جس کے ذریعہ اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ گلاب کے پھول میں بھی حرکت ہوتی ہے جس کی بدولت وہ خوبصورت اور خوشبودار بن جاتا ہے اور انسان بھی ایک حرکت کا حامل ہے جس کی طاقت سے وہ عقل و محبت کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ پس اگر ہمیں گندم کی نشوونما' گلاب کی خوبصورتی اور خوشبو اور روحِ بشر کی پاکیزگی میں خلل اور کمی نظر آئے تو یہ حرکت کا قصور نہیں ہے بلکہ اس کا سبب وہ رکاوٹ ہے جو اس حرکت کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔

اب ہم یہ جان سکتے ہیں کہ صحیح فکر کی تشکیل میں ہدف ہماری کس قدر مدد کر سکتا ہے اور ہمیں بتا سکتا ہے کہ یہ دنیا جس کا ہم ایک چھوٹا سا وجود ہیں ایک ذی شعور کائنات ہے اور ہم ہرگز ایک آشفتہ' مضمحل اور تاریک دنیا کے باسی نہیں۔ اور یہیں سے ہمیں یہ بھی جاننا چاہئے کہ کائنات میں پائی جانے والی ان حرکتوں کی پشت پر مسلّمہ طور پر ایک محرک موجود ہے اور تمام اشیاء کی خلقت میں ایک عظیم شعور کارفرما ہے۔ اور ہمارے لئے یہ اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ زندگی ایک عظیم شعور اور پرشکوہ چیز کا نام ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہم اپنے آپ کو کم از کم اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ خود کو کائنات کی اس فکری روح کے ساتھ ہم آہنگ کر لیں اور جان لیں کہ اس سے روگردانی ہماری زندگی کا زیاں ہے۔"

(انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا)

انسان کی مادّی نشوونما اس کے اختیار کی حدود سے باہر ہے لیکن روحانی کمال اس کے اختیار میں ہے۔ اس بناء پر مناسب نہیں کہ انسان حصولِ کمال کے فطری طریقے سے انحراف کرے اور کائنات کے تکامل پذیر نظام میں ناقص رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا اندرونی کمال ایک غیر مادّی چیز ہے۔ انسان مسلسل تحقیق اور پیہم تجربات کی مرہونِ منت مادّی اکتشافات میں تو کامیاب ہوجاتا ہے لیکن وہ اس مادّی روش پر چلتے ہوئے کمال کی منزلوں کو طے نہیں کرسکتا اور روح کو اوجِ کمال پر نہیں پہنچا سکتا۔

بالکل اسی طرح جیسے ایک درخت کو حصولِ کمال کے لئے مختلف مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نباتی بیماریوں' کیڑے مکوڑوں' زیرِ زمین پتھروں اور دوسری رکاوٹوں کا مقابلہ کرتا ہے اور حصولِ کمال میں معاون قوتوں جیسے دھوپ' پانی' روشنی اور ہوا وغیرہ سے مستفید ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی ترقی و کمال کے لئے ایسے طاقتور عوامل سے لیس ہونا چاہئے جو ابدیت تک رسائی میں اس کے معاون ثابت ہوں اور ایسے عوامل و عناصر سے جنگ کرنی چاہئے جو کمال کی جانب سفر میں اس کے مانع ہوں۔

انسانی وجود کے گوناگوں پہلوؤں کو مختلف جہتوں سے اس طرح منظم ہونا چاہئے کہ وہ اپنی تمام مادّی اور معنوی خواہشات و احتیاجات کا جواب دے سکے اور ایک نظم و ترتیب سے استفادہ کے ذریعہ نہایت مناسب طور پر زندگی گزار سکے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جو ہر قسم کے تضاد' ظلم' زیادتی' جہل اور گناہ سے پاک ہو تاکہ انسان انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ سکے۔

انسانی وجود مختلف پُرہیجان خواہشات کا مجموعہ ہے یہ خواہشات اپنی فطری

شکل اور حدِّ اعتدال میں ہوتے ہوئے نہ صرف یہ کہ بے سود اور ضرر رساں نہیں ہوتیں بلکہ انسان کی روح کی بالیدگی کا سبب بنتی ہیں لیکن اگر یہی خواہشات و میلانات بے مہار ہوجائیں تو حصولِ کمال کی راہ میں مانع ہوجاتی ہیں' اور انسان خواہشات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت کی بلند چوٹی سے قعرِ مذلّت کی اتھاہ گہرائیوں میں جاپڑتا ہے۔

حیوان اپنی خواہشات و میلانات کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن انسان مطیعِ مصلحت اور پیروِ عقل ہے' اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ زیاں بار خواہشات کو کچل دے اور سود مند خواہشات کا مثبت جواب دے۔ کیونکہ جس طرح انسان کی سرشت میں مادّی خواہشات پائی جاتی ہیں اسی طرح اس میں حقیقت جوئی اور مفید و مثبت چیزوں کو اپنانے کی لگن بھی ہوتی ہے اور یہی لگن انسان کو اعلیٰ ترین روحانی مقام پر فائز کردیتی ہے اور اسی کی وجہ سے انسان اپنے اندر پاکیزگی' جرات' شرافت اور سچائی کی روح کی پرورش پر قادر ہوتا ہے۔

تزکیۂ نفس کمال کا ذریعہ ہے

یہ بات بلاشک و تردید کہی جاسکتی ہے کہ انسان اگر اپنی زندگی میں کسی اصول اور ضابطے کی پیروی کرنا چاہے' خواہ وہ ضوابط مذہبی ہوں یا غیر مذہبی تو یقینی طور پر وہ اپنی زندگی کی ایک راہ و روش اور منزل کا تعین کرلے گا۔ اور ایسی چیزوں سے پرہیز کرے گا جو اس راہ کو طے کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہوں۔ جلد ختم ہوجانے والی لذات اور ہوا و ہوس کو اگر زندگی کے مقصد اور اصول و ضوابط کا مخالف پائے گا تو ان سے دوری اختیار کرے گا' اپنے نفس پر

قابو حاصل کرے گا اور اس کی پاکیزگی کا خیال رکھے گا۔

نفس کا تزکیہ یعنی اسے برائیوں سے پاک رکھنا، ہر اُس انسان پر لازم ہے جو انسانیت سے بھرپور اور معقول زندگی گزارنا چاہتا ہو۔ انسان لامتناہی خواہشات اور قوتِ فکر کا حامل ایک وجود ہے اگر وہ کسی ضابطہ حیات کو نہ پہچانے اور اس پر کاربند نہ ہو تو اپنی درندگی اور خون آشامی سے کائنات کو تہ و بالا کرسکتا ہے۔

انسان کی ترقی اور عظمت صرف مادّی امور سے وابستہ نہیں۔ مادّی ترقی کا فائدہ محض اتنا ہوتا ہے کہ سہولتوں کے اعتبار سے کچھ پیشرفت ہوجاتی ہے جن کا تعلق صرف جسم سے ہوتا ہے لیکن اس طرح انسان حقیقی کمال کو نہیں پاسکتا۔ سائنسی ترقی انسان کے تمام پہلوؤں کو کمال نہیں بخش سکتی۔

انسان کا حقیقی کمال یہ ہے کہ خود کو منہ زور شہوانی لذّتوں کے پنجے سے آزاد رکھے، انسانیت کی سمت اور اپنے شعور کو بلند کرنے اور اپنی فطرت کو پاکیزگی بخشنے کے لئے قدم بڑھائے اور بلند افکار اور وسیع افق سے آشنا ہو۔

انسانی روح میں کمالِ مطلوب کے حصول کی بہت گہری خواہش پائی جاتی ہے۔ اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو انسان اپنے بچپن کی حدود سے آگے نہ بڑھ پاتا اور ایک نہایت وسیع افق پر پرواز کے قابل نہ ہوتا۔ اعلیٰ اقدار میں اتنی کشش اور جذّابیت پائی جاتی ہے کہ انسان نہایت شوق و رغبت کے ساتھ ان کی جانب بڑھتا ہے۔ ان کے حصول کے لئے اس کے جذبات میں بہت گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے جو اسے سخت جدوجہد پر اکساتی ہے۔

یہ تمام باتیں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انسانی روح میں کمال

سے عشق پنہاں ہے اور جوں ہی مناسب مواقع میسّر آتے ہیں اس کی تجلیاں ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔

انسانی بدن کے عضلات ورزش کے نتیجے میں طاقتور اور توانا ہوجاتے ہیں۔ روحانی صفات کا بھی یہی حال ہے، اگر ہم انہیں پختہ کرنا چاہیں تو ہمیں روحانی ریاضت کی ضرورت ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی طاقت محدود ہوتی ہے اور یہ محدودیت جسم کی ساخت اور اس کے خلیوں کی توانائی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ جو ہم انسانی تاریخوں میں غیر معمولی اور حیرت انگیز کارناموں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ تمام کے تمام طاقتور روح کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ اور روح کو یہ قوت مادّی رکاوٹوں کو عبور کرنے اور معرفت کے افق کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتی رہتی ہے۔

انسانی روح درحقیقت خلقت کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ ایک ایسی شے ہے جو اپنی قدرت نمائی، فعالیت، مادّیات پر تسلط کے ذریعے اور خصوصاً اس توانائی کے ذریعہ جو انسان کو انحطاط، ضعف اور نارسائی سے اوجِ کمال پر پہنچانے کا سبب ہے اپنا تعارف کرواتی ہے۔

جس طرح انسانی جسم کو بعض کاموں کی انجام دہی کے لئے سختی اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح روح کو بھی اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار اپنانے کے لئے کچھ رنج و مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ تربیت کے حوالے سے تمام افکار و نظریات روح ہی کے محور کے گرد گھومتے ہیں، روح تربیت اور تہذیب کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مراتب کی بلندی کا سبب روح ہی ہے، روح ہی انسانیت کی اعلیٰ صفات اور فضیلت کی بنیادوں کو کسب کرتی اور

معنوی کمال سے عشق رکھتی ہے' اور یہ روح ہی ہے جو انسان کے لئے اخلاقی اصول مرتب کرتی ہے جن سے تمام حیوانات بے بہرہ اور بے نیاز ہیں۔

فرانسیسی دانشور ڈاکٹر "کارل" کہتا ہے :

"ہمیں نور کو ظلمت اور صدا کو سکوت سے تمیز دینے کی عادت ہونی چاہئے۔ خوبی اور بدی میں فرق کرنا چاہئے۔ ایسی عادت کے بعد ہی ہم برائیوں سے پرہیز کر سکیں گے اور اچھائیوں کو اپنا سکیں گے۔ لیکن بدی سے پرہیز کے لئے ایک عمدہ جسمانی اور روحانی بنیاد کی ضرورت ہے۔ روح اور جسم کا انتہائی کمال تزکیۂ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔ جو لوگ روح کو اعلیٰ اور پاکیزہ بنانا چاہتے ہیں ان کے لئے کسی قسم کا افراط جائز نہیں۔ روحانی اعتدال ہمیشہ نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ ح اور جسم کی یہ کیفیت انسانی شخصیت کی بنیادی ضروریات کو تشکیل دیتی ہے اور اس رن وے کی مانند ہے جس سے روح اوجِ کمال کی جانب پرواز کرتی ہے۔

ترقی اور سربلندی کا راستہ صدیوں کی طولانی مسافت کے بعد بھی ختم نہیں ہوتا۔ دورانِ سفر اکثر مسافر سبز کائی پر پھسل جاتے ہیں' گہری کھائیوں میں گر پڑتے ہیں یا پھر لبِ دریا خوشنما باغات کی رونقیں ان کے قدم روک لیتی ہیں اور وہ وہیں پڑ کر ہمیشہ کے لئے سو رہتے ہیں۔

انسان کو چاہئے کہ غم ہو یا خوشی' فارغ البالی ہو یا تنگدستی' سلامتی ہو یا بیماری ہر حال میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہے اور اگر ناکامی کا تلخ گھونٹ پینا پڑے تو ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کھڑا ہو جائے اور کمرِ

ہمت باندھ کر ایک بار پھر کمال کی شاہراہ پر سفر کا آغاز کر دے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اس میں حصولِ کمال کا شوق اور اس کی جانب بڑھنے کا ارادہ قوی سے قوی تر ہوتا چلا جائے گا' اسی طرح اپنے مقصد پر ایمان پختہ ہو گا' اسی طرح روح بدن کی اور بدن روح کی مدد کے لئے زیادہ سے زیادہ آمادہ ہوں گے اور آخرکار اسے ہر مرحلے پر کامیابیاں نصیب ہوں گی۔" (راہ و رسمِ زندگی۔ ص ۹۹-۱۰۰)

آج دنیا بد نظمی اور بے اعتدالی کا شکار ہے۔ اجتماعی و انفرادی' جسمانی اور روحانی زندگی میں نظم و ضبط اور اعتدال کا نام و نشان نظر نہیں آتا۔ جب انسان اپنی انسانی خصوصیات کو فراموش کر دیتا ہے اور جب اپنی ان خصوصیات کو جو زمین پر خلیفۂ خدا کی حیثیت سے اس کی ذات کا لازمہ ہیں' کچل دیتا ہے اور اس کے باوجود کہ اسے انسان خلق کیا گیا ہے اپنی عظمت و شرف کی نفی کرتا ہے اور اپنی سرشت و طینت کو پامال کر دیتا ہے اور بالآخر اس کی زندگی ہوا و ہوس کی پرستش پر مبنی ہو جاتی ہے تو ان حالات میں جب کہ اس کی ہستی اس قدر پستی و ذلالت سے آلودہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنے وجود کے فطری مقصد سے منحرف ہو جاتا ہے' فطرت اسے اس کے غیر اصولی اور بچکانہ طرزِ عمل کی سزا دیتی ہے اور اس سے سخت انتقام لیتی ہے۔

آج بھی انسانیت اپنے کئے کی سزا بھگتنے میں مصروف ہے اور اپنی ناہنجاریوں کا تاوان وہ آرام و سکون' سعادت و خوش بختی اور اپنی انسانی خصوصیات سے محروم ہو جانے کی صورت میں ادا کر رہی ہے' جس کے نتیجے میں معاشرے میں طرح طرح کے انحرافات اور مظالم و جرائم میں مسلسل اضافہ

ہو رہا ہے۔ کوئی ایک منٹ ایسا نہیں گزرتا جس میں دُنیا کے کسی حصّہ میں کوئی بڑا جرم، ظلم و تعدی، گناہ، عزت و عفت کی پامالی، دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ اور قتل و غارت کا کوئی واقعہ رونما نہ ہوتا ہو۔ یہ مسئلہ اقوامِ عالم کو درپیش بڑے مسائل میں سے ہے اور اسے بشریّت کی ایک ایسی عظیم مشکل قرار دیا جاسکتا ہے جس نے پورے روئے زمین کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

دنیا کی حکومتیں ہر سال اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصّہ جرائم، مظالم، بے راہ روی اور فحاشی کی روک تھام یا مجرموں کی تلاش اور انہیں سزا دینے کے لئے مخصوص کرتی ہیں، یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ جسے جان کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے۔

مغربی معاشروں میں حد درجہ بڑھی ہوئی سنگدلی، درندگی اور انسانی روابط سے بے اعتنائی کا ایک سبب مغربی فلاسفہ کے نظریات میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جرمنی کے معروف فلسفی "نطشے" نے اپنے طرزِ فکر کی بنیاد بے رحمی اور نسلی برتری پر رکھی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں کس قدر وحشیانہ خونریزی اور تباہ کن جنگیں وقوع پذیر ہوئیں۔

"نطشے" کہتا ہے:

"نرمی اور نرم دلی کو دور پھینک دینا چاہئے، نرمی عاجزی کی علامت ہے، فروتنی اور فرمانبرداری کا سبب فرومائیگی کا احساس ہے، حلم، برداشت، عفو و اغماض بے ہمتی اور سستی کی دلیل ہیں۔"

"آخر اپنے نفس کو کیوں مارا جائے؟ نفس کو تو پروان چڑھانا چاہئے۔ خود خواہی اور خود پرستی کوئی بُری چیز نہیں، ضعیف و ناتوان کو زندگی

کی قید سے آزاد کر دینا چاہئے۔"

(ماخوذ از "سیر حکمت در اروپا" جلد سوم)

جرائم کے اسباب

جرائم کے اسباب اور مجرموں کی نفسیات پر تحقیق کرتے ہوئے دیکھنا چاہئے کہ آیا یہ پیدائشی طور پر مجرمانہ فطرت کے حامل ہیں؟ طرح طرح کی اخلاقی خرابیوں میں مبتلا اور قسم قسم کے جرائم و مظالم کا ارتکاب کرنے والے یہ لوگ آیا پیدائشی مجرم ہیں؟ یا ان کے جرائم کا سبب وہ نفسیاتی عوارض ہیں جن کا یہ شکار ہیں؟ ان لوگوں کے علاج کی کیا صورت ہے؟

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ مجرم اور فتنہ پرور افراد پیدائشی طور پر ایسے ہوتے ہیں اور ارتکابِ جرم کی صفت ان کی فطرت کا حصّہ ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر مجرم فطرتاً مجرم ہوتا ہے۔ ایسے افراد میں کچھ ایسی غیر معمولی علامات بھی پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں دیگر لوگوں کے درمیان بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔

اٹلی کے معروف جرُم شناس "لومبروز" کا یہی نظریہ تھا۔ وہ اپنے اس نظریہ پر بہت زور دیتا تھا اور اس سلسلہ میں اس کے بہت سے طرفدار بھی پائے جاتے تھے۔ بلکہ اس نے اپنے زمانہ کے بہت سے مصنّفین کی توجہ بھی اپنے نظریات کی جانب مبذول کرلی تھی۔

بے شک انسان پند و نصیحت قبول کرنے والا ایک موجود ہے۔ وہ اپنے ارادے سے بعض امور انجام دیتا ہے اور ارادے ہی کے زور پر بعض دیگر امور سے پرہیز کرتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اختیار و آزادی کا حامل ہو ورنہ

ایسی ہستی کو جو مجبور و لاچار ہو' خود سے کسی ارادے و اختیار کی مالک نہ ہو پند و نصیحت اور رہنمائی کرنا ایک لغو و بے ہودہ عمل ہو گا۔ علماء و دانشور انسان کو عملاً آزاد اور اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

علمائے اخلاق کی وہ تمام کاوشیں جو وہ انسانوں کو سعادت سے ہمکنار کرنے کی غرض سے انجام دیتے ہیں اور ان کی تمام اخلاقی تعلیمات کی اساس اسی اصول پر رکھی گئی ہے کہ انسان کچھ امور کو انجام دے اور کچھ سے پرہیز کرے۔ یہ علما حصول سعادت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان کچھ چیزوں کو اپنائے اور کچھ سے اجتناب برتے۔

اگر ایسے بچّوں کا جائزہ لیا جائے جو دماغی امراض کے اسپتالوں میں زیرِ علاج ہیں۔ یا زندانوں میں قید ہیں تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے غیر صالح خاندانوں یا تربیت کی ضرورت سے غافل گھرانوں میں پرورش پائی ہے اور ذاتی طور پر انہوں نے پاکیزہ زندگی کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

ایسے لوگ جو کسی قسم کے جرائم سے نہیں چُوکتے اور جن کے ہاتھ ہر قسم کے گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہوتے ہیں ان کی غالب تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جنہوں نے ایسے کنبُوں میں آنکھ کھولی ہوتی ہے جو اخلاقی فضائل اور مہرو محبت کی گرمی سے عاری اور مختلف قسم کے مفاسد کا شکار ہوتے ہیں۔ یا پھر ایسے لوگوں کی پرورش انحطاط پذیر معاشروں میں ہوئی ہوتی ہے اور یہ خاندانی اور معاشرتی اسباب اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ یہ لوگ اچھائی پر بُرائی کو ترجیح دینے لگتے ہیں اور امن و راحت کی جگہ فتنہ و فساد پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔

انسان کی اہم ترین ذمہ داری

انسان کی اہم ترین ذمہ داری تربیت ہے۔ بشریت نے اپنی حیات کی صبح طلوع ہوتے ہی تربیت کی اہمیت کو جان لیا تھا اسی بناء پر جوں جوں اسے اپنی حقیقت کا ادراک ہوا اور جس قدر اپنے فرائض و ذمہ داریوں کا علم ہوا اسی تناسب سے اس نے اپنے ماحول کے مطابق قواعد و اہداف وضع کیے۔ ہر چند کہ یہ اہداف اور ان کی بنیادیں کبھی درست ہوتی تھیں اور بعض مواقع پر نادرست بھی۔

ہم انسانی تاریخ میں مختلف مکاتبِ فکر کے پیدا کردہ ان تغیّرات کا بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں جن کے نتیجے میں انسانی زندگی کی کایا یکسر پلٹ گئی۔ نیز تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ انسان ذاتی طور پر شیطانی فطرت لے کر پیدا نہیں ہوا ہے۔ اگر انسان پیدائشی طور پر شریر اور شرپسند ہوتا تو اس کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کی جانے والی تمام مساعی لغو اور بے فائدہ ہوتیں اور تمام پیغمبرانِ الٰہی کی کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتیں۔

اگر جزیرہ نمائے عرب کے لوگوں کی فطرت میں قتل و غارت اور جرم و جنایت کی صفات شامل ہوتیں تو ممکن نہ تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ ان لوگوں میں اس قدر وسیع اور مختلف پہلوؤں پر محیط انقلاب پیدا کردیتے اور ان کی شخصیت و ماہیت کو بدل کر رکھ دیتے۔

یہ درست ہے کہ انسان ابتداً مادّی قوتوں اور رجحانات سے سروکار رکھتا

ہے اور دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اس کے قویٰ یکے بعد دیگرے ظاہر ہو کر اپنی فعالیت کا آغاز کرتے ہیں۔ البتہ مادّی طاقتوں کے مقابلے میں انسان میں روحانی ترقی کے لئے بکثرت صلاحیتیں اور قوتیں پائی جاتی ہیں اور اس سلسلے میں اس کے وجود میں حد سے زیادہ شوق و امکانات موجود ہیں۔ یہ قوتیں اپنے استعمال سے مختلف رنگ اختیار کرسکتی ہیں اور مختلف میدانوں میں کام آتی ہے۔ ہرچند یہ مرحلہ انسان کے طبیعی مراحل کے بہت بعد آشکار ہوتا ہے۔

بلند آرزوؤں میں یہ قوت ہوتی ہے کہ دوسری صلاحیتوں کو اپنے اہداف کے حصول کے لئے استعمال کریں۔ لیکن یہ کام موثر خارجی مدد اور توجہ و رہبری کا متقاضی ہے۔ کیونکہ اگر یہ مدد میسر نہ ہو تو خواہشات انحراف و کج رَوی کا شکار ہو جائیں گی۔ البتہ یہ ذہن نشین رہے کہ خارجی مدد کوئی غیر فطری بات نہیں بلکہ انسانی فطرت کا ایک حصّہ ہے۔ جیسے کہ بچّے میں پیدائش کے دن سے ہی بات کرنے کی فطری استعداد پائی جاتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دوسروں کی رہبری اور تعلیم کے ذریعہ بات کرنا سیکھتا ہے۔

قرآنِ کریم اصولِ تکامل کی ان الفاظ میں تصویر کشی کرتا ہے کہ :

"یا ایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیه"

"اے انسان تو اپنے پروردگار کی جانب جانے کی کوشش کررہا ہے تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔" (سورۂ انشقاق ۸۴۔آیت ۶)

اور یہ بھی ارشاد ہے کہ

"وان الی ربک المنتھی"

"اور بے شک سب کی آخری منزل پروردگار کی بارگاہ ہے۔"

(سورۂ نجم ۵۳۔آیت ۴۲)

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کائنات کی وسعتوں میں لامحدودیت کی جانب پرواز کے لئے پیغمبرانِ الٰہی کے عطا کردہ لائحہ عمل سے (کہ جو جامع تعلیمات کا حامل ایک محکم مکتب ہے) الہام حاصل کرے تاکہ اس کے اندر خدا کی صفات جھلکنے لگیں اور اپنے ہدفِ مطلوب کمال، نجات اور کامیابی سے ہمکنار ہوسکے۔

"گستاف لوبون" لکھتا ہے کہ۔

"فلسفہ مسلسل آزمائشوں کے بعد اس نکتہ کو سمجھ چکا ہے کہ ماوراء مادہ تک اس کی رسائی نہیں۔ لہٰذا ایسے روحانی معالجوں کے متعیّن کردہ اصولوں کی پیروی ناگزیر ہے جو انسان کی روحانی خصوصیات سے آگاہ اور اس کے معنوی کمال کے ضامن ہیں۔

یہ روحانی معالج انبیاء الٰہی اور خداوندِ عالم کے منتخب بندے ہیں۔ یہی ہستیاں انسانی روح کی اصلاح کے واسطے ایسے پروگرام پیش کرتی ہیں جو منبعِ وحی سے حاصل کئے گئے ہیں تاکہ انسان کو اس کے حقیقی کمال تک پہنچادیں۔"

قرآنِ کریم انسان کی ذات کا تعارف کراتے ہوئے انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔(ملاحظہ کیجئے سورۂ زخرف ۴۳ آیت ۱۴، سورۂ ابراہیم ۱۴ آیت ۳۳، سورۂ تین ۹۵ آیت ۴، سورۂ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۲۹)

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اگر آدمی کی بنیادی تربیت نہ ہو تو اس کی طوفان سے بھی زیادہ سرکش مادّی قوتیں آگے بڑھ کر عقل و ضمیر کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور یوں نفسانی احساسات کو مادّی اغراض و مقاصد کی راہ پر لگادیتی ہیں۔

انسان کی خلقت کا سب سے بڑا اعجاز یہی ہے کہ اس کی فطرت دو مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مختلف رنگ قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ایک خاص راہ پر اس کی رہنمائی سے چشم پوشی نہیں برتنی چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ۔

"ان بذوی العقول من الحاجة الی الادب کما یظمأ الزرع الی المطر"

"عقل مند انسان کو ادب سیکھنے اور تربیت کے حصول کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ کھیتی کو بارش کے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔" (غرر الحکم جلد ۲ ص ۵۱۳ حدیث نمبر ۳۴۷۵)

اگر تربیت کے قواعد و اصول ایسے عناصر پر استوار نہ ہوں جو انسانی صلاحیتوں کو اعتدال عطا کرسکیں بلکہ انسانی قوتوں کو اس کی ابتدائی اور بے رنگ سطح ہی پر چھوڑ دیا جائے تو انسان ہمیشہ کے لئے ابتدائی اور مادّی مرحلے (یعنی محض اپنے حیوانی غرائز) ہی میں پڑا رہ جائے گا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں انسان کے افعال و اعمال کو اچھے یا بُرے اور نیک و بد کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور ان پر سزا و جزا کا تعیّن ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ۔

"قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسّٰھا"

"بے شک وہ کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کرلیا۔ (سورۂ شمس ۹۱۔ آیت ۹-۱۰)

سزا و جزا کا دار و مدار انسان میں پائی جانے والی خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیتوں پر ہے۔ لہٰذا ذہنی و جسمانی لحاظ سے ناقص شخص کو ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جاسکتا ہے۔

بعض جدید مکاتبِ فکر کے اس نظریہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں کہ۔

"جرائم پیشہ افراد بے قصور ہیں کیونکہ انہیں معاشرے میں پائی جانے والی خرابیاں یا صحیح رہبری کا فقدان جرائم پیشہ بنا دیتا ہے اور گو کہ انسان خیر و شر میں تمیز کی فطری صلاحیت رکھتا ہے پھر بھی وہ ایک کمزور و ناتواں مخلوق ہے۔"

البتہ کوئی بھی تربیت کی اہمیت کا منکر نہیں اور اس سلسلہ میں معاشرہ پر جو عظیم و خطیر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

درست ہے کہ جرم کی ذمہ داری ارتکابِ جرم پر ابھارنے والے مختلف عوامل پر تقسیم کی جاسکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ارتکابِ جرم کرنے والا بری الذمّہ قرار دے دیا جائے۔

بے شک بعض مجرموں کی اصلاح معمولی سی پند و نصیحت کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ دراصل یہ لوگ ایک طرح کی روحانی سستی کا شکار ہوتے ہیں اور یہی مرض ان کے جرائم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ یا پھر یہ لوگ غیر صالح

افراد کی صحبت اختیار کرنے کی وجہ سے اس حال کو پہنچتے ہیں۔ پس اس قسم کی بیماریوں کی جلد تشخیص کرکے ان کی دوا کرنی چاہیے۔

جرائم کو محض سختی اور دباؤ کے ذریعے جڑ سے ختم کرنا ممکن نہیں۔ مجرم کو سزا دینا ضروری ہے کیونکہ بہرحال یہ اس کے کیئے کا بدلہ ہے۔ نیز سماج میں توازن و عدالت کے قیام اور سماجی زندگی کو خطروں سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی سزا ضروری ہے لیکن تنہا سزا دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سے زیادہ ضروری مجرموں کی از سرِ نو تربیت ہے۔ تاکہ انہیں راہ راست پر لگایا جاسکے اور قانون شکنی کی روح تمام افرادِ معاشرہ میں سرایت نہ کرجائے۔

کیا پیدائشی مجرم بھی پائے جاتے ہیں؟

"لومبروزو" اور اس کے ہم خیال دانشوروں کے اس نظریہ کو کہ "مجرموں میں یہ صفت فطرتاً پائی جاتی ہے" آج ماہرین اور اس فن کے صاحبِ نظر حضرات مسترد کرچکے ہیں۔

"لومبروزو" نے اطالوی فوج میں ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے یہ مشاہدہ کیا کہ اکثر مجرموں کو اپنے جسم پر نقش و نگار گدوانے کی عادت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ یہیں سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ عام لوگوں کی نسبت مجرموں کے بدن کم حساس ہوتے ہیں اور ان کی اخلاقی حس میں نقص کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس کے بعد ایک راہزن کے دماغ کے آپریشن کے دوران وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بعض پہلوؤں سے اس کا دماغ پست فطرت اور بدنام زمانہ افراد کے دماغوں سے مشابہ ہے۔ اور یہی بات "پوشیدہ موروثی صفات کے ظہور"

کے نظریہ کا مقدمہ بن گئی۔

"لومبروزو" بعض خصوصیات کو کسی کے جرائم پیشہ ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان خصوصیات میں گھونگریالے بال، آنکھوں کا ترچھاپن، جبڑوں کا ٹیڑھا ہونا، چہرے کا کرخت ہونا، ابروؤں کا کمانی دار ہونا، سر کا غیر معمولی طور پر بڑا یا چھوٹا ہونا، کانوں کا بڑا ہونا، چہرے کا جسم کے ساتھ ناموزوں ہونا، پیشانی کا پچکا ہوا ہونا شامل ہیں۔ لومبروزو کے مطابق جس وقت کسی شخص کے اندر ان صفات میں سے چند یا ایک پائی جائے تو قطعی طور پر اس کے جرائم پیشہ ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے اور ان خصائص کو وہ "پستی کے داغ" کا نام دیتا ہے۔

فرانسیسی دانشور ڈاکٹر "کارل" کہتا ہے۔

"لومبروزو جس "پیدائشی مجرم" کا معتقد ہے اس کا کوئی وجود نہیں۔ درحقیقت اکثر جرائم پیشہ افراد عام آدمیوں ہی کی مانند ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض غیر معمولی حد تک ذہین ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوشیالوجی کے ماہرین یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ ان سے زندانوں میں کیسا سلوک کیا جائے۔ ایسے راہزن اور سرمایہ دار، جن کے جرائم کی تفصیلات سے اخبارات و جرائد بھرے رہتے ہیں۔ نہایت ذہین اور بسا اوقات ظاہری حسن سے مالامال ہونے کے باوجود اخلاق کی نعمت سے تہی دست ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں کہ جن میں محض بعض نفسیاتی تجلیات نمایاں ہوتی ہیں۔ آج کی دنیا کی یہ بے اعتدالی اور آشفتگی ہمارے زمانے کی

نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کے باوجود کہ ہماری شہری زندگی مادّی آسائشوں سے پُر ہے پھر بھی تعلیم و تربیت کے امور پر خطیر رقوم صرف ہونے کے باوجود فکری و اخلاقی تربیت ممکن نہیں ہوپائی ہے۔ حتیٰ آج کے معاشروں میں موجود نمایاں افراد تک سے ظاہر ہونے والی شعوری حرکات و سکنات ہم آہنگی اور قدرت سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے اعمال پر بدی چھا چکی ہے اور اچھائیاں کمزور پڑ چکی ہیں اور کبھی کبھی تو ان میں سے بعض اچھائیوں سے بہرے ہی سے محروم ہیں۔

مفید ترین اور خوش بخت ترین افراد وہ ہیں جن کی فکری اور اخلاقی سرگرمیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مبنی بر اعتدال ہوں۔ جو چیز ان لوگوں کی دوسروں پر فوقیت و برتری کا سبب ہوتی ہے وہ ان کی سرگرمیوں کی کیفیت اور ان کے تکامل کا معیار ہے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہماری مساعی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ معاشرے کو اعلیٰ صفات کے حامل افراد فراہم کئے جائیں کیونکہ ایک عظیم و مستحکم تمدّن ان ہی افراد کے ہاتھوں وجود میں آسکتا ہے۔" (انسان موجودِ ناشناختہ ص ۱۵۰)

عصرِ حاضر کا ایک ماہرِ نفسیات لکھتا ہے کہ

"آج یہ بات فلسفی و علمی طور پر ثابت ہوچکی ہے اور اس میں معمولی سی تردید کی گنجائش بھی نہیں رہی کہ (فطرتاً) کوئی آدمی بُرا نہیں ہوتا۔ محض بیمار آدمی پائے جاتے ہیں۔ اس مفہوم کو جان لینا اس

قدر اہمیت کا حامل ہے کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی خلقت کی ابتداء سے اب تک اور آئندہ بھی سعادتِ بشر کے لئے کوئی اختراع و اکتشاف اس سے زیادہ موثر و مفید نہیں۔ یعنی جس روز لوگ واقعاً اس حقیقت کو درک کرلیں گے اور جب معاشرہ اور اس کو چلانے والے اداروں کی بنیاد اس مسلّمہ حقیقت پر رکھ دی جائے گی تو انسانی سماج سے رنج و مصائب اور باہمی دشمنی و عداوت کا بڑی حد تک خاتمہ ہوجائے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب یہ بات سب کے علم میں ہوگی کہ خود غرضی' حسد' خوف' چالبازی' دھوکا دہی' منافقت' بے انصافی اور ایسے ہی دوسرے سینکڑوں معائب روحانی بیماریوں کا نتیجہ ہیں اور بالکل اسی طرح قابلِ علاج ہیں جیسے نزلہ' زکام' گلے کا درد اور بد ہضمی وغیرہ جیسے جسمانی امراض' تو ہم بُرے آدمیوں کو روحانی مریض سمجھنے لگیں گے اور اسی روز سے ہمیں دو قطعی اور مفید نتائج حاصل ہوں گے۔ ایک یہ کہ خود یہ مریض آج جنہیں "بُرے" نام سے پکارا جارہا ہے امید و آرزو کے ساتھ اپنے علاج کی جانب متوجہ ہوں گے' جس کے نتیجہ میں یہ بھی اچھے اور صحت مند افراد میں تبدیل ہوجائیں گے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگ انہیں بُری نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دیں گے بلکہ ان سے ایک قابلِ رحم مریض کی مانند برتاؤ کریں گے۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ان دو نظریات اور ان کے نتائج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج کی ترقی یافتہ اقوام کے اکثر مدارس میں یہاں تک کہ وہاں کی جیلوں میں بھی

یہی اصول لاگو ہے اور رفتہ رفتہ یہی رویہ اختیار کیا جارہا ہے اور اس سے نہایت مفید نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔ انسان دوست مصنفین کا فرض ہے کہ وہ غیر معمولی حد تک مفید ان حقائق کو زیادہ سے زیادہ منظرِعام پر لائیں تاکہ پوری دنیا ان سے استفادہ کرسکے۔"

(روانکاوی۔ص ۷)

یہ علمی و فلسفی نظریہ جسے آج کی سائنسی دنیا کی ایجاد قرار دیا جارہا ہے چودہ سو سال قبل اسلامی متون و مصادر میں پیش کیا جاچکا ہے۔

قرآنِ کریم منافقین کو ان کے نفاق' دو رخی' کینہ توزی اور ایذا رسانی کی صفات کے سبب "بیمار" قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

"فی قلوبھم مرض"

"ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری پائی جاتی ہے۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۱۰)

بعض ماہرینِ اخلاق اور مذاہبِ باطن کے پیروکار انسان کو ناپاک و آلودہ وجود کے بطور متعارف کرواتے ہیں۔

"جان دیوی" کہتا ہے۔

"ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ کتے کو پہلے بدنام کرو پھر اسے مار ڈالو تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اخلاقیون انسانی صفات کو اسی مانند بدنام کرکے مسلسل ملامت کا نشانہ بنا رہے ہیں اور کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ اگر آپ انسانی اخلاق کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انسانی صفات کو ہمیشہ شک و تردد اور بداعتمادی کی

نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ابتداء ہی سے اسے قبیح اور بدنام صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اخلاق کا کام محض یہی قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ ان سرکش صفات پر قابو پائے۔ یہاں تک کہ بعض افراد کا عقیدہ ہے کہ اگر کہیں انسانی صفات میں یہ نقص' ضعف اور انحطاط کے دیگر عوامل نہ پائے جائیں تو وہاں سرے سے اخلاق کا تصور ہی نہ ہوتا۔

بعض مصنفین جو کسی حد تک گہری فکر کے حامل ہیں انسان کو اس حد تک پست ظاہر کرنے کی ذمہ داری پیروانِ مذہب اور مومنانِ متعصب پر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عظمت ظاہر کرنے کے لئے انسان کا مقام حد سے زیادہ گرا دیتے ہیں۔ انصاف کی بات ہے کہ ان کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیندار لوگ کفار اور بے دین افراد سے زیادہ انسان کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ بدبینی مناسب نہیں۔ کیونکہ اگر آدمی اس حد تک بُرا ہے تو کس طرح وہ خود اپنے دعوے کے مطابق اپنا تزکیہ نفس کرتے ہیں اور دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔" (اخلاق و شخصیت۔ص ۴۷)

پاک و بے آلائش فطرت

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے۔

"کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی یکون ابواہ

يهودانه اوينصرانه"

"ہر نومولود پاک و بے آلائش فطرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور اس پر اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک اُس کے والدین اُسے یہودی یا نصرانی نہ بنادیں۔" (بحار الانوار ج ۲ ص ۸۷)

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند سے فرماتے ہیں کہ۔

"وانما قلب الحدث کالارض الخالیه ما القی فیها من شئی قبلته فبادرتک بالادب قبل ان یقسو قلبک ویشتغل لبک"

"جوان آدمی کا دل ایسی زمین کی مانند ہے جس پر کچھ کاشت نہ ہوا ہو جو بیج بھی اس میں ڈالا جائے گا وہ اسے قبول کرے گی۔ اے میرے بیٹے! میں نے تمہاری تربیت کے لئے تمہاری کم سنی ہی میں اقدام کیا' قبل اس کے کہ تمہارا نقش پذیر قلب سخت ہوجائے اور اس سے پہلے کہ تمہاری عقل مختلف مسائل میں الجھ جائے۔"

(نہج البلاغہ فیض ص ۹۳)

کوئی شخص فطری طور پر مجرم نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ہر انسان کے وجود میں ایسی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو اسے مسلسل نیکی کی جانب مائل کرتی ہیں اور جوں ہی انسان اپنی فطری روش سے منحرف ہونے لگتا ہے تو یہ قوتیں اسے سرزنش کرتی ہیں اور اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ فلاسفہ کی اصطلاح میں ہر طبیعت جب کج روی میں مبتلا ہوتی ہے تو اس میں اپنے طبیعی حالات کی طرف لوٹنے کا رجحان و میلان پیدا ہوجاتا ہے۔

نہایت قدیم زمانے ہی سے بعض فلاسفہ کا یہ نظریہ رہا ہے کہ عقلِ نظری انسان میں موجود اعلیٰ ترین طاقت ہے۔ اگرچہ اس طاقت کے ادراک کا پیمانہ محدود ہوتا ہے اور اس کے اجراء کی ضمانت غیر معمولی طور پر زیادہ نہیں۔ منصفانہ فیصلے کرنے' مجرموں کو سرزنش کرنے اور سعادت آفرین اوامر کے صدور جیسے معاملات میں عقلِ نظری ناقص ثابت ہوتی ہے اور اسی بناء پر انسان میں ایک ایسی مستقل طاقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو تمام نیکیوں' فداکاریوں اور راہِ کمال کی جانب کوششوں کا سرچشمہ ہو۔ تاکہ انسانی اخلاق کو سنوارا جاسکے۔

قرآنِ مجید کا اعلان ہے کہ ایمان کی جانب میلان و رغبت اور گناہ و سرکشی سے نفرت و کراہت کے جذبات انسانی سرشت میں رکھے گئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ انسانی طینت میں سرچشمہ ہستی پر عقیدہ اور حسِ خداشناسی ودیعت کی گئی ہے بلکہ انسانی قلب کو خوبیوں سے بھی آراستہ کیا گیا ہے اور اسے گناہ و عصیان سے پرہیز و برایت کے فطری ہونے کی بھی یاد دہانی فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ روحِ انسان خود بخود فضائل و عمدہ خصائل کی جانب بڑھنے لگتی ہے۔

"ولکن الله حبب الیکم الایمان و زینه فی قلوبکم وکره الیکم الکفر والفسوق والعصیان"

"اللہ نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنادیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کردیا ہے اور کفر' فسق اور معصیت کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دے دیا ہے۔" (سورہ حجرات ۴۹ آیت ۷)

خواجہ شیرازی کے بقول۔

این همه مهر و وفاں که میان من و توست
باخود آوردم از آنجانه به خود بر بستم

(میرے اور تیرے درمیان یہ جو اس قدر مہر و وفا ہے یہ یہاں تک خود بخود پہنچی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں خود کچھ نہیں کیا۔)

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے کہ۔

"قدیم خیال یہ تھا کہ بنیادی طور پر فضیلت [illegible]رے پر مبنی ہے اور یہ فرض کیا جاتا تھا کہ ہمارا وجود خواہشاتِ بد سے لبریز ہے، ور ہم اس کی ایک مجرد (غیر مادّی و غیر مرکّب) طاقت یعنی ارادے کے ذریعہ نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اور ظاہراً ان بُری خواہشات کو جڑ سے ختم کرنا ناممکن نظر آتا تھا اور محض ان کی نگرانی کئے جانا ہی ممکن معلوم ہوتا تھا۔

یہ بالکل مجرم اور سپاہی کا سا حال محسوس ہوتا تھا۔ کسی کے تصوّر میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ معاشرہ مجرموں سے خالی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں، بہترین کام جو ممکن تھا وہ یہ کہ امن وامان کے قیام کے لئے زیادہ سے زیادہ طاقتیں سرگرمِ عمل رہیں تاکہ لوگ ارتکابِ جرم سے خوف کھائیں اور استثنائی صورت میں اگر جرم عمل میں آئے بھی تو اس کا مرتکب فوراً گرفتار ہو کر سزا کا سامنا کرے۔

لیکن مجرموں کے متعلق جدید نفسیاتی ماہرین نے اس نظریہ پر قناعت نہ کی، ان کا عقیدہ ہے کہ اکثر مواقع پر مناسب تربیت کے ذریعہ جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکا جاسکتا ہے اور جس چیز کا اطلاق

معاشرہ پر ہوسکتا ہے اس کا اطلاق فرد پر بھی ہوسکتا ہے۔"

(در تربیت۔ ص ۲۵)

روسو (Jean Jacques Rousseau) کہتا ہے کہ۔

"ایک ایسا نوجوان جس کی پرورش ایک اچھے اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی ہو وہ فطرتاً نرم و نازک احساسات اور پسندیدہ صفات کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اس کا قلب اپنے ہم نوعوں کے دکھ درد پر رقت بار ہوجاتا ہے، اپنے دوست احباب میل وملاقات پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتا ہے اور کسی صورت اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھوں دوسروں کو دکھ پہنچے۔ ممکن ہے کبھی اسے غصّہ آجائے لیکن یہ غصّہ جلد ہی ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور وہ فوراً اس کی تلافی کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے۔ جیسے اپنی غلطیوں کی تلافی میں سرگرمی دکھاتا ہے بالکل اسی طرح دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے میں تاخیر نہیں کرتا۔

نوجوانی انتقام و نفرت کا دور نہیں، بلکہ ہمدردی، عفو و درگزر اور سخاوت کا زمانہ ہے۔ ہاں میں اس بات کی تاکید کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تجربہ بھی اس کی تائید کرے گا کہ کوئی بچّہ پیدائشی طور پر شروفساد لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اگر بیس سال کی عمر تک اس کی اپنی پاک فطرت محفوظ رہے تو وہ بہترین، سب سے زیادہ سخی، محبوب ترین اور سب سے زیادہ مہربان انسان ثابت ہوگا۔

یقیناً ایسی باتیں آج تک آپ سے کسی نے نہیں کی ہوں گی۔ یہ

فلسفیوں کا قصور نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے مکتبِ فکر کے مطابق
پرورش پائی ہے اور دنیا کو اسی طرح فساد کے ہمراہ دیکھا ہے اس لئے
یہ کیونکر اس کے برخلاف سوچ سکتے ہیں۔"

(امیل Emile (روسو کا مشہور ناول) - ص۲۹)

"والڈو امرسن" بھی یہ لکھتا ہے کہ۔

"یہ فضائل ایک طاقتور روح میں پائے جاتے ہیں اور وہ ان تمام پر
محیط ہوتی ہے۔ روحِ پاکیزگی، عدالت اور نیکی کی خواہاں ہوتی ہے
لیکن خود ان سب سے برتر و بالاتر ہے۔ للذا اگر ہم روح کی سرشت
کو نظر انداز کرکے اس کے فرائض کی تبلیغ کریں (جو انسانی فضائل
ہیں) تو یہ گویا ایک طرح کا تنزّل اور جلد بازی کا مظاہرہ ہوگا۔
ایک نومولود میں طبیعی طور پر تمام فضائل پائے جاتے ہیں۔ ان
فضائل کے حصول کے لئے اسے مشقتوں اور آزمائشوں سے نہیں
گزرنا پڑتا۔ انسان کے دل سے بات کرکے دیکھئے آپ دیکھیں گے کہ
وہ یک بیک صاحبِ فضیلت ہو جائے گا۔" (فلسفہ اجتماعی - ص ۳۵۰)

بنابرایں اسلام اور آج کے حقیقت بین دانشوروں کے نظریہ کے مطابق
انسان پاکیزہ فطرت اور صحیح و سالم روح کے ساتھ دنیا میں قدم رکھتا ہے اور اس
کے اندر پائے جانے والے نقائص عارضی اور غیر اصلی ہوتے ہیں۔ طبیعی
راہوں سے ہٹ جانا یا فطری میلانات کا منحرف ہو جانا، نہ صرف روحانی
بیماریوں کا سبب بنتا ہے بلکہ روح کی پاکیزہ راہ کے راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی
کر دیتا ہے۔ وگرنہ انسان اپنے حقیقی تمایلات کے مطابق اس بات کی صلاحیت

رکھتا ہے کہ تیز رفتاری کے ساتھ کمال کی جانب سفر جاری رکھ سکے۔

البتہ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ جس طرح ایک ہی ماحول میں نشو و نما
پانے والے پودے یکساں نہیں ہوتے اسی طرح ایک ہی ماحول میں رہنے والے
افراد کے دماغی خلئے مختلف اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر فرد ان مخصوص
دماغی خلیوں کا حامل ہوتا ہے جو موروثی طور پر اسے ملتے ہیں۔

دنیا کے کسی فرد کے دماغی خلیات اور مخصوص ترتیب یکساں نہیں ہوتی۔
فزیالوجی (Physiology) کے مطابق یہ اختلاف مکمل طور پر محسوس کیا
جا سکتا ہے۔ جس طرح ماحول کا اثر ہر پودے کے بیج پر مختلف ہوتا ہے اسی طرح
ہر انسان کے دماغ میں موجود خلیوں پر زندگی کے ماحول کا ایک خاص اور جداگانہ
اثر ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر آدمی کی شخصیت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر
آدمی ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد کو
مشترک ماحول اور ایک ہی نسل سے تعلق کی بنا پر اصولی طور پر بظاہر ایک ہی
جیسی صفات کا حامل ہونا چاہئے لیکن اس کے باوجود انکے درمیان ایک حیرت
انگیز تباین پایا جاتا ہے۔

انبیاء الٰہی کی دعوت کی بنیاد فطرتِ توحید اور فطرتِ اخلاق ہی پر تکیہ کرتی
ہے۔ یہ فطری اصول عقل کی مدد سے انسانی تربیت کی بنیادوں کی تشکیل کرتے
ہیں۔ اپنی دعوت کی تبلیغ اور دینِ الٰہی کی ترویج کے سلسلہ میں پیغمبرانِ خدا کا
سب سے بڑا کام انسانی فطرت کو بیدار کرنا تھا۔

ممکن ہے گوناگوں عوامل کی وجہ سے بعض افراد کی فطرت کچھ دیر سے
بیدار ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت ختم اور نیست و نابود نہیں

ہوتی۔ طویل تاریخ میں متعدد رکاوٹوں اور موانع کے باوجود فطرت کی بنیادیں استوار و پائیدار رہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت کی راہ سے انحراف میں فطرت و طبیعت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

ہمارے لئے یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ ہم فطرت کا سہارا لے کر اپنی تربیت اور تزکیہ نفس کرسکتے ہیں۔ البتہ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے اندر موجود منہ زور خواہشات اپنے زور اور دباؤ سے فطری قوت کو کمزور کرتی رہتی ہیں۔ اگر ہم ان توانائیوں کو اعتدال کے ساتھ بروئے کار نہ لائیں تو ہم خود ان کی تندروی اور شدّت کا شکار ہوجائیں گے جس کے نتیجے میں ہماری فطری قوت رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگے گی۔ یہاں تک کہ ایک موقع ایسا آئے گا کہ فطرت اپنا زور کھو بیٹھے گی اور پھر ہم اپنے باطن میں پوشیدہ اس طاقت سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

احساس و عمل میں تعادل و توازن پیدا کرنے کے لئے نقطہ اعتدال کو جاننے اور مسلسل قربانی و ریاضت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ارسطو کہتا ہے۔

"فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ ایک افراط اور دوسری تفریط اور اس کی علّت یہی ہے کہ فضیلت حدِّ اوسط کا ہاتھ آجانا ہے خواہ بات جذبات کی ہو یا افعال کی۔ لہٰذا نیک ہوجانا آسان کام نہیں۔ کیونکہ ہرچیز کی حدِ اوسط کو پالینا آسان کام نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دائرہ کا مرکز معلوم کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں صرف وہی شخص اس مرکز کو تلاش کرسکتا ہے جو اس فن سے واقف ہو۔ غصّہ کرنا اور پیسہ خرچ کرنا اگرچہ بظاہر ہر کسی کو آسان

نظر آتا ہے لیکن اپنی مناسبت سے 'مناسب انداز سے' مناسب وقت پر' مناسب وجہ سے اور مناسب طریقہ سے ایسا کرنا نہ تو ہر کس و ناکس کے بس کی بات ہے اور نہ ہی ذاتاً آسان ہے۔ اسی لئے نیکی کمیاب اور قابل تعریف ہے۔

حدِّ اعتدال کو پالینے کے خواہش مند شخص کو سب سے پہلے ایسی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے جو اس کی فطرت سے تضاد رکھتی ہوں۔ جیسے کہ کالیسپو نے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کشتی کو جھاگ اڑاتی ہوئی زوردار موجوں سے دور رکھو۔" پس ہمیں بھی سب سے پہلے ان ہی امور پر توجہ دینی چاہئے جن کی جانب ہم باآسانی مائل ہوسکتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ فطرت میں جو خرابی پیدا ہوگئی ہے اس کے برعکس صفات کو اپنائیں اور اس وقت تک انہیں اپنائے رکھیں جب تک خرابی پوری طرح دور نہ ہوجائے اور ہم واپس حدِّ اعتدال میں نہ آجائیں۔ ایک خمیدہ لکڑی کو سیدھا کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے مخالف سمت میں موڑا جائے یہاں تک کہ وہ سیدھی ہوجائے۔

ہمیں چاہئے کہ لذّتوں اور لذّت بخش چیزوں سے ہر ممکن پرہیز کریں' احتیاط کریں۔ اس لئے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں ہم عام طور پر غیر جانب دار ہوکر فیصلہ نہیں کرسکتے۔ اگر ہم لذّتوں سے دوری اختیار کریں گے تو ہماری گمراہی کا احتمال کم ہوگا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے بل بوتے پر ہم حدِّ اعتدال کو بہتر طور پر اپنا سکتے ہیں۔"

(فلسفہ اجتماعی۔ ص ۴۷-۴۸)

ہماری زندگی کا سب سے اہم ہدف روح کی پرورش اور اسے منزلِ کمال تک پہنچانا ہونا چاہئے۔ قلب و عقل کے دریچوں کو نیکی و راستی اور مہر و محبت کے قبول کرنے کے لئے کھولنا ہمارے فرائض میں سے ہے۔ یہی چیزیں ہمارے قلب کو منور کرنے اور جِلا بخشنے کا سبب اور خالقِ کائنات کو ہم سے راضی کرنے کا ذریعہ بنیں گی۔

اکثر لوگ زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے کے لئے مادّی ذرائع کے حصول کی غرض سے سخت محنت و جدوجہد کرتے ہیں اور مرتے دم تک زحمتیں اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن آسائشوں کے حصول کے لئے سرگرداں ہوتے ہیں خود انہیں بھی اپنے اوپر حرام کرلیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ خوش بختی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ جب کہ یہ ایک غلط طرزِ تفکر ہے اور ان کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ان لوگوں کو جان لینا چاہئے کہ انہوں نے اپنا راستہ گم کردیا ہے اور وہ سعادت و کامرانی کے جادے سے بھٹک گئے ہیں۔

جلد ختم ہوجانے والی مادّی لذتوں اور بے حساب مال و دولت حاصل کرلینے کے باوجود کوئی مطمئن، آسودہ اور خالی از اضطراب زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس طرزِ عمل کے ذریعہ انسانی حیات نمو نہیں پاسکتی اور پھل پھول نہیں سکتی بلکہ اس کے برعکس انتہائی سرعت کے ساتھ پژمردگی اور نابودی کا شکار ہوجائے گی۔

جو شخص خوش بختی کو ان لذّتوں میں تلاش کرتا ہے اسے پریشانی و اضطراب کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے وجود میں ہر لحظہ سر اٹھانے والی

خانما برباد خواہشات اور بچکانہ رجحانات کو اگر عقل و متانت کی زنجیروں میں جکڑ نہ دیا جائے تو ہماری روح پر حاوی ہوجائیں گے اور ہمیں اپنا اسیر و غلام بنالیں گے اس کے برعکس جوں جوں ہم اپنی ہوس آلود خواہشات کو کم کریں گے اسی قدر سعادت و خوش بختی سے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ مختصر یہ کہ بدبختیاں، رنج و مصائب اور وہ تمام چیزیں جو زندگی کے افق کو تاریک کردیتی ہیں ہمارے وجود پر ہوا و ہوس کے تسلط کا نتیجہ ہیں۔

قید اور آزادی

یہاں قید یا آزادی کی برتری کا مسئلہ زیرِ بحث نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ دو قسم کی قیدوں میں سے کس قسم کی قید کو ترجیح دی جائے۔ بالفاظ دیگر یہاں ایک پلڑے میں قید اور ایک میں آزادی نہیں بلکہ موضوع "آزادی سے آزادی کا موازنہ" ہے۔

انسان صاحبِ اختیار ہے، وہ چاہے تو انسانوں جیسی آزادی کا انتخاب کرے اور چاہے تو جانوروں کی سی آزادی منتخب کرے۔ انسان عقیدے، اخلاق اور فضیلت کا پابند ہوتا ہے اس کے برخلاف حیوان نا ختم ہونے والے غرائز و شہوات کا اسیر۔ جو شخص نفسانی خواہشات کی آواز پر لبیک کہتا ہے اور بِلا سوچے سمجھے ان کا مطیع ہوجاتا ہے اس نے آزادی حاصل کرلی ہے۔ یعنی اس نے انسانی ضوابط کی پابندیوں سے باہر قدم نکال لئے ہیں اور انسانیت، اخلاق اور مذہب کی قیود سے آزاد ہوگیا ہے۔ اس نے نفس کے فریب سے مقابلے کی قوت کھودی ہے اور خواہشاتِ نفس کی قوتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔

یہ فریبی منطق یعنی غریزی خواہشات کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے تمام قیود سے آزاد ہوجانے کی منطق، حقیقی منطق نہیں۔ انسان اس بناء پر بے سوچے سمجھے اپنی ہستی کی نفی کررہا ہے اور اپنے وجود کے فلسفہ سے منحرف ہورہا ہے اور اس کا مستقبل یقینی نابودی و زوال سے دوچار ہوچکا ہے۔

لیکن ایسا شخص جس نے خدا کے ساتھ مضبوط عہد و پیمان باندھا ہے اور زندگی بھر اس کو توڑنے کا تصور بھی نہیں کرتا تو وہ اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کو ایک عزمِ راسخ اور قلبِ قوی کے ساتھ مناسب راہ پر کام میں لاتا ہے۔ جوں جوں اس کے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے ویسے ویسے وہ اپنے عہد و پیمان کا پکّا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا شخص حقیقی معنوں میں خود کو اپنی خواہشات اور ہوس سے آزاد محسوس کرتا ہے۔ یعنی وہ ہوا و ہوس کے دباو اور ان کے جاذبہ و کشش کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے آزاد ہے۔

جب انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنی شرافت مندانہ جہد و کاوش کو آزادی کے حصول کے لئے کام میں لائے یہاں تک کہ کائنات کی ایک فعال قوت بن جائے اور جادۂ کمال پر چلتے ہوئے ایک ایسی منزل پر جا پہنچے جو اس کے شایانِ شان ہو تو وہ کسی صورت بھی ایسی منطق قبول نہیں کرتا جو اس کے حقیقی مقام کے ساتھ ناسازگار ہو۔

مذہبی احکام کے ایک اہم حصّہ کا تعلق خواہشاتِ نفس پر کنٹرول، انہیں حدِّ اعتدال میں رکھنے اور ایک اعلیٰ روح کی پرورش کرنے سے ہے۔ ایک دیندار شخص کے دل میں موجزن ایمان کی قوت کے سوا وہ کونسی قوت ہے جو خواہشات کو اعتدال میں رکھے اور اپنے معنوی اثرات کے زور پر انسان کو کج

روی سے باز رکھے؟

معاشرہ کو بگاڑ سے محفوظ رکھنے اور جرائم و مظالم کے پھیلاؤ کو کم سے کم کرنے کے لئے سب سے اہم چیز لوگوں میں احساسِ ذمہ داری کا پیدا کرنا ہے۔ اور احساس ذمہ داری کا سرچشمہ ایمان ہے۔ ایمان ہی انسان کے افکار و عمل کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام لوگوں کے دلوں میں خدا پر ایمان پیدا کرکے اور اجتماعی و اقتصادی زندگی کی اصلاح کرکے جرائم و بے اعتدالیوں کی روک تھام کرتا ہے اور اس سلسلے میں بہترین طریقۂ کار کا حامل ہے۔ یہ ایک طرف تو نیک عمل انجام دینے والوں کو بہترین جزا کی نوید سناتا ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کو جو خواہشاتِ نفس کی زہر اثر آلودگیوں کا شکار ہوجائیں عذاب کی خبر دیتا ہے۔ اسلام کا یہی طریقہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ لوگ نہایت ذوق و شوق سے اخلاقی کمالات کے حصول کی جانب بڑھتے ہیں اور سزا و عذاب کے ڈر سے قبیح صفات اختیار کرنے سے باز رہتے ہیں۔

عادت اور اس کے مثبت و منفی اثرات

خود عادت کے مثبت اور منفی پہلو انسانی ترقی و کمال اور اسی طرح اس کے انحراف و انحطاط میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں اور انسانی معاشروں کی قسمت بنانے یا بگاڑنے کے سلسلے میں عادت نے اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے۔

ناگوار حوادث کا سامنا کرنے کے لئے مضبوط قوتِ ارادی کی فراہمی اور ان سے محفوظ رہنا اور انہیں ناکام بنانا' روحانی عادت کا مثبت پہلو ہے۔ اس کے

برعکس منفی عادات نہایت ضرر رساں اور وسیع و ناقابلِ تلافی نقصانات کا موجب ہیں۔ پس عادت جس طرح مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے اور ان کے منفی اثرات کو زائل کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اسی طرح روح کے مثبت، مفید اور مسلّم اثرات کو نابود کرنے میں بھی اس کی کارفرمائیوں کا دخل ہوتا ہے۔

منفی عادت حقیقی اقدار، مادّی و معنوی کائنات کے بہت سے اصول و قوانین اور مفید و رہنما نکات کو درک کرنے میں مانع ہے۔ اس عادت کے زیرِ اثر انسان حقائق کا بصیرت کے ساتھ مشاہدہ نہیں کرسکتا اور ان کی اہمیت کا احساس نہیں کرپاتا۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث اور زبردست علمی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ انسان صدیوں سے فطرت کے جو حیرت انگیز قوانین اور اہم ترین مظاہر اپنی لگی بندھی عادت پر چلتے رہنے کی وجہ سے دریافت نہیں کرپاتا تھا انہیں اکثر اوقات صرف ایک لمحہ کے لئے اپنی عادت کے برخلاف غور و فکر کرنے کی بناء پر دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس کے نتیجہ میں انسانیت پر ترقی و پیش رفت کی نئی نئی راہیں کھلیں۔

ممکن ہے کبھی علم بھی روحانی موانع کی صف میں شامل ہوجائے اور اپنی قدر و قیمت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اپنے اثرات کے لحاظ سے جہالت ہی کی مساوی سطح پر آجائے۔ اس لئے کہ منفی عادت کردار میں انحراف کا باعث ہوتی ہے اور روحانی اثرات کی پیشرفت روک دیتی ہے اور عمل کے مرحلہ میں علم کے اجراء کی ضمانت کے اثر کو زائل کردیتی ہے۔ اسی لئے بہت سے ایسے دانا

ملتے ہیں جو اپنی کسی پوشیدہ خو عادت کے اسیر رہتے ہیں اور ان کا علم و دانش ان کے کردار و عمل میں نہیں جھلکتا اور نہ ہی وہ اسے دوسروں کی اصلاح اور بہبود کے لئے استعمال میں لاپاتے ہیں اور نہ ہی ایسے عوامل کی روک تھام کرتے نظر آتے ہیں جن کے ضرر سے وہ بخوبی آگاہ ہیں۔ اس تاریکی اور غفلت کا سبب وہ نفسیاتی عادت ہے جو عقل و دانش کے خلاف نبرد آزما ہونے کے نتیجے میں ان کے اندر پیدا ہوگئی ہے اور جو انسان کو روحانی کمال کی منزلیں طے کرنے سے باز رکھنے کا موجب ہے۔

بہت سے ماہرین اور طبیب اس کے باوجود کہ انہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن معنوی قوتوں کے لحاظ سے ان کا علم بے اثر رہا اور مقامِ عمل پر ان کے اعمال کی اصلاح کے میدان میں یہ علم اجراء سے محروم رہا۔

اسلامی نقطہ نظر سے تمام فضیلتوں کا انحصار علم پر نہیں ہے بلکہ علم و دانش معرفت کی بنیاد ہے، علم کمال اور روحانی ارتقاء کا ایک وسیلہ ہے، کیونکہ یہ غیر فعال اور صامت فضیلت مراحلِ کمال اور اس کے معرفتی مراتب کے بغیر از خود اس بات پر قادر نہیں کہ روحانی میدان میں موثر و فعال حالت اپنالے۔

قرآنِ کریم بے کردار داناؤں پر ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے کہ۔

"یا ایھاالذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عنداللہ ان تقولوا مالا تفعلون"

"اے اہلِ ایمان! آخر وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو

جس پر عمل نہیں کرتے ہو۔" (سورۂ صف ۶۱- آیت ۲-۳)

اسلام بُری عادتوں میں مبتلا ہونے کے احتمال سے بھی محفوظ رہنے کی خاطر ہر موقع پر غور و فکر اور عقل کے استعمال پر زور دیتا ہے۔ غور و فکر کے نتیجے میں بُری عادتوں کے خلاف ڈٹ جانے کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور آدمی میں ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ انسان غور و فکر کے باعث بُری عادتوں کے منفی اثرات سے آگاہ ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ غور و فکر ارادے کو قوی کرنے کے سلسلے میں ایک موثر عامل ثابت ہوتا ہے۔

دنیا میں نظر آنے والے طرح طرح کے انحرافات صحیح و منطقی طرزِ تفکر سے روگردانی کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کے راہِ راست سے بھٹک جانے اور گمراہی و ضلالت کی راہوں پر گامزن ہوجانے کا بنیادی سبب غور و فکر سے پہلوتہی اور اس سلسلے میں سہل انگاری ہے۔ یہیں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے تنہائی میں غور و فکر کرنے کو عبادت سے کیوں تعبیر کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ساعت صحیح غور و فکر کو ستّر سال کی عبادات پر ترجیح دی ہے۔

یہ طرزِ تفکر غفلت و جہالت کی جڑوں کو کاٹ دینے کے سلسلے میں بنیادی عامل ہے آدمی کی روح اور حق و حقیقت کے درمیان پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا دینے کا سبب اور دل میں ایمانِ راسخ پیدا کردینے کا وسیلہ ہے۔ اور اسی سے انسان بدعتوں اور غلط رسوم و رواج اپنانے سے محفوظ رہتا ہے۔

جب غور و فکر کے نتیجے میں آدمی ایک ٹھوس حقیقت دریافت کرلیتا ہے تو صحیح طرز تفکر کے نتیجے میں حاصل ہونے والے محکم عزم و ارادے کے بل بوتے پر وہ اپنے کردار و عمل کو کنٹرول کرتا ہے۔

تفکر کے ذریعہ غیر فعال علم فعال علم میں تبدیل ہوجاتا ہے اور موثر مفاہیم و معانی کی صورت میں اسے حیاتِ نو ملتی ہے اور اس طرح اس کے اثرات نہایت بڑھ جاتے ہیں۔

ناپسندیدہ صفات یا نمایاں اخلاقی خوبیاں جو مسلسل مشق و ریاضت کے بعد انسان کے باطن میں جڑ پکڑتی ہیں، اکتسابی ہونے کے باوجود ذاتی و طبیعی صفات کی مانند پُرنفوذ ہیں۔ جب یہ مصنوعی عادات مستقل اور ثابت خلق و خو کا روپ دھار لیتی ہیں تو رفتہ رفتہ انسان کو اپنی راہ پر لے آتی ہیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"ردالمعتاد عن عادتہ کالمعجز

"کسی سے اس کی عادت ترک کروادینا معجزہ کی مانند ہے۔"

(بحارالانوار-ج ۱۷-ص ۲۱)

" مان" اپنی کتاب اصولِ نفسیات میں لکھتا ہے کہ۔

"ایسی عادات جو کسی وجہ سے پیدا ہوگئی ہوں ممکن ہے اس وجہ کے ختم ہوجانے کے بعد بھی باقی رہیں۔ اس موقع پر کہنا چاہئے کہ عادت اپنے محرّک کی صورت میں ڈھل گئی ہے۔ اس بات کو ایک طرح کی خود مختاری کہا جاتا ہے۔ ان مواقع پر بجائے یہ کہ عادات انسانی احتیاجات اور رجحانات کے تابع ہوجائیں، ان سے جدا ہوکر ایک طرح کی خود مختاری حاصل کرلیتی ہیں۔

اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہم کچھ خاص راستے اختیار کرنا سیکھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ خاص راہیں ہمارے اندر اس قدر پختہ ہوجائیں کہ

امکان کے باوجود ہم اپنی ضروریات کو کسی اور راستے سے رفع نہ کرسکیں۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں کہ "اس راہ کا عادی ہو چکا ہوں"۔

عادت ہمیں ایک معیّن و مقرّر راہ پر ڈال دیتی ہے اور اسی راستے کا اسیر کردیتی ہے اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں اور عام طور پر اسے ترک کرنا ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔ اس مظہر کو عادت کی قوت کہا جاتا ہے اور عادت خود ایک ثانوی محرّک بن جاتی ہے۔

کبھی لوگ اپنی عادت بدل ڈالتے ہیں اور کبھی پیش آنے والے حوادث ان کی زندگی کو یکسر تبدیل کردیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان نئی چیزوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے اور تغیّر و تبدیلی سے خوفزدہ رہتا ہے۔ وہ لوگ جو عمر رسیدہ افراد کی عادات و اطوار کو بدلنا چاہتے ہیں انہیں اس نکتہ سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔" (اصولِ روان شناسی۔ ص ۱۳۹-۱۴۰)

اسلام کی اختیار کردہ روش

عادت انسانی فطرت میں ایک نعمت کی حیثیت رکھتی ہے جو اس کی (محنت و جدوجہد) کے ایک بڑے حصّے کو ایجاد و تخلیق کی راہوں پر لگادیتی ہے۔ لیکن اس عظمت کے باوجود جس کی یہ حالت ہے اگر یہ کامل آگاہی کے ساتھ نہ ہو اور محض ایک گمراہ کن اور فریبی کشش کی صورت اختیار کرلے تو روح کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

جب اسلام کا سورج دنیائے جاہلیت پر طلوع ہوا تو اس وقت کا معاشرہ ایسی ضرر رساں عادات و اطوار میں مبتلا تھا جن میں کوئی ایک بھی کسی ملّت کے زوال و تباہی کے لئے کافی ہے۔

اس تاریک زمانہ میں کہ جب انسانی شعور ناروا عادات اور بُری خصلتوں کے اثرات سے مسخ ہوگیا تھا، اسلام نے ایک عظیم انقلاب بپا کیا جو ہر لحاظ سے دلچسپ اور اپنی نوع کے اعتبار سے بے مثال تھا۔ اس انقلاب نے غفلت زدہ اور خواب آلودہ معاشرہ کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور لوگوں کو غلط عادات و رسوم اور عقل و ضمیر کے خلاف رائج بدعتوں کو ترک کرنے پر آمادہ کیا۔

وہ معاشرہ جو طرح طرح کی توہّمات اور جاہلانہ طور طریقوں میں بُری طرح گھرا ہوا تھا پیغمبرِ اسلامؐ کی گرانقدر تعلیمات کے نتیجے میں بے بنیاد طور طریقوں اور فساد زدہ ماحول کی قید سے آزاد ہوگیا۔ اس نے اپنے اَسلاف کی تمام لغو رسومات کو ترک کردیا اور ان رسومات کے پنجہ سے رہائی کے بعد ایسی نئی راہ و رسم اختیار کی جو سعادت و نیک بختی کی ضامن تھی۔

عالی قدر رہبرِ اسلامؐ کے شیوۂ تبلیغ نے اپنی سادہ زبانی کے ذریعہ روحوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھادیا۔ انسانیت غلط رسوم، رواج کی قید میں تھی، لوگوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور ان بُری عادتوں نے ان کے باطنی حواس اور ان کی عقل و بصیرت کو مسخ کردیا تھا، کمال کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ان کے سامنے حائل تھیں۔ آنحضرتؐ نے مشاہدات اور لوگوں کو محسوس ہونے والے معاملات ہی سے کچھ دلائل اخذ کرکے لوگوں کی توجہات حقیقت کی جانب موڑ دیں جس کے نتیجے میں عمومی افکار میں ہلچل مچ گئی، گہری نیند سوئی ہوئی فکریں

بیدار ہوگئیں، آنحضرتؐ کے پیش کیئے ہوئے ٹھوس دلائل نے لوگوں کو اپنی جانب مائل کرلیا اور لوگ حقائق اور عقلی طور پر مسلّمہ باتوں کو درک اور محسوس کرنے لگے اور مزید حقائق کشف کرنے کی راہ پر گامزن ہوگئے۔

بالآخر اس عظیم اور تاریخی انقلاب کے ذریعہ معاشرہ کے دامن سے توہّمات اور خرافات کے شرمناک داغ مٹ گئے اور انسان ضلالت و جہالت سے نجات پاگیا۔

اس تاریک دور میں ضرر رساں بدعتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ایسا موثر عامل نظر نہیں آتا تھا جو توہّمات کے اس سلسلہ کو ختم کرے اور لوگوں کی عقل و بصیرت کو بیدار کرکے انہیں موجودہ طور طریقوں سے آگے دیکھنے اور سوچنے پر آمادہ کرے اور انسان کی عقل و بصیرت کو حقائق سے منسلک کرے۔

اسلام نے سعادت مند اور خوش بخت معاشرہ وجود میں لانے سے قبل ایک خاص طریقہ کار اپنایا۔ اس نے سب سے پہلے ہر قسم کی عادات کو خواہ ان کا تعلق عقیدے اور فکر سے ہو یا وہ عمل و کردار سے متعلق ہوں ختم کیا اور ان میں سے ہر ایک کے خلاف اس کے خطرات کے تناسب سے اقدامات بروئے کار لایا۔ مثلاً شرک اور غیر خدا سے وابستگی کی مختلف انواع پر کاری اور شدید ضرب لگائی۔ اور ایسی ناپسندیدہ عادات جو افکار و ادراک پر تسلط کے ساتھ ساتھ اقتصادی حالات سے بھی مربوط تھیں جیسے غلامی، سود خوری، شراب نوشی وغیرہ---- ان کو تدریجاً ختم کیا اور اس سلسلہ میں مرحلہ وار اقدامات اٹھائے۔ اس طرح لوگ خود اپنے نفس کے مالک ہوگئے اور تزکیہ نفس اور نفسانی ارتقاء کے لئے ماحول سازگار ہوگیا۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جو کسی معاشرہ

کے افراد کی تعمیر کی بہترین اور ثمر بخش ترین روش ہے۔

معروف فرانسیسی دانشور پروفیسر "کارل" لکھتا ہے کہ۔

"ہمیں ہر چیز سے قبل ان موانع کو دور کرنا ہوگا جو ہماری روحانی و نفسیاتی نشوونما کی راہ میں حائل ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ارتقاء کے سفر کا آغاز کریں، ہمیں ان عادات و عیوب کو ترک کرنا ہوگا جو روحانی ارتقاء کو مفلوج کرتے ہیں۔

جب یہ رکاوٹیں دور ہوجائیں تو کیا کیا جائے؟ اس کے بعد روحانی ارتقاء کا زندگی کے طبیعی رجحانات کے مطابق آغاز کرنا چاہیئے۔

آدمی اس حیرت انگیز امتیاز کا حامل ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے شعور کی مدد سے اپنی روح کی تعمیر کرسکتا ہے۔ اس کے لئے ایک خاص تیکنک کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی حیات کی تنظیم کا طریقہ سیکھ سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ایسا شخص جو اپنی ذات پر اختیار رکھتا ہو ایک ہوائی جہاز کو چلانا سیکھ سکتا ہے۔

روحانی ارتقاء کے لئے دانشمند یا ہوشمند ہونا ضروری نہیں، صرف یہ کافی ہے کہ وہ اس ارتقاء کا خواہشمند ہو۔ بے شک کوئی اس راہ کو تنہا طے کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اور ہر انسان اپنی زندگی میں دوسروں کی رہنمائی و نصیحت کا محتاج ہے۔ لیکن اپنے فکر و جذبات (جو اس کی شخصیت کا جوہر ہیں) کی فعالیت کی تنظیم و پرورش کے لئے کسی سے مدد نہیں لے سکتا۔

اوّلین اصول عقلانی قوتوں کی پرورش نہیں بلکہ اپنے اندر جذبات و

احساسات کے تار و پود کی بنیاد رکھتا ہے جو دوسرے تمام روحانی عوامل کی تکیہ گاہ ہے۔ حسنِ اخلاق کی ضرورت حسنِ بصارت و سماعت سے کم نہیں۔" (راہ و رسمِ زندگی۔ص۹۹۔۹۸)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"غالبوا انفسکم علی ترک المعاصی' یسھل لکم مقادتھا الی الطاعات"

"گناہوں اور آلودگیوں کو ترک کرنے کی ابتداء اپنے نفس پر غلبہ سے کرو۔ اس کے بعد ہی تم آسانی سے اپنے نفس کو اللہ کی بندگی و فرمانبرداری کی طرف لے جاسکو گے۔" (غرر الحکم۔ص۵۰۸)

"غالبوا انفسکم علی ترک العادات و جاھدوا اھوائکم تملکوھا"

"ترکِ عادات کے ذریعہ اپنے نفس پر مسلّط ہوجاؤ' اپنی ہوا و ہوس سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ یہ تمہارے طاقت و ارادے کے زیرِ تسلّط آجائیں۔" (غرر الحکم۔ص۵۰۸)

اسلام انسانی نفس کی تربیت اور اپنے سعادت بخش پروگرام کے اجراء کے لئے عادت کو ایک موثر وسیلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور جب لوگوں کے قلوب اور اللہ کے درمیان ایک زندہ وسیلہ پیدا ہوجاتا ہے اور نیکی و فضیلت کا بیج ان کی سرشت میں پڑجاتا ہے تو اسے عادت میں تبدیل کردیتا ہے۔

تمام مذہبی عادات باطنی خواہش و رغبت اور درونِ ذات سے پھوٹتی ہیں۔ پھر یہی قلبی میلان واضح خصوصیات کے حامل ایک معیّن و عملی کردار میں بدل

جاتا ہے جو بتدریج ایک شعوری اور کمالِ ادراک کی حامل عادت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ تغیّر و انقلاب انسان پر طاقت فرسا اور ناقابلِ برداشت دباؤ نہیں ڈالتا۔

بچپن کی عادتیں

اسلام بچّوں میں عبادات کی انجام دہی' انسانی فضائل کے حصول اور گناہ کی آلودگیوں سے دور رکھنے کی عادات پیدا کرنے کی جو تاکید کرتا ہے وہ ان کی روح میں ایمان کے استحکام کا ایک طاقتور عامل ہے۔ اس عمل کے ذریعہ انہیں ان کی آئندہ زندگی میں معاشرہ و ماحول کے ضرر رساں اثرات سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"مروا صبیانکم بالصلوۃ اذا بلغوا سبعاً"

"جب تمہارا بچّہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے نماز کی تاکید کرو۔" (مستدرک۔ج۱۔ص۱۷۱)

امام زین العابدین علیہ السلام اپنے بچّوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"اتقوا الکذب الصغیر منه والکبیر فی کل جد و هزل فان الرجل اذا کذب فی الصغیر اجترأ علی الکبیر"

"جھوٹ سے پرہیز کرو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا' سنجیدگی سے بولا جائے یا مذاق سے۔ اس لئے کہ آدمی جب چھوٹا جھوٹ بولتا ہے تو اس میں

بڑا جھوٹ بولنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔"

(وسائل الشیعہ۔ج ۳۔ص ۲۳۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"بادروا اولادکم بالحدیث قبل ان یسبقکم الیھم المرجئۃ"

"جتنا جلد ہوسکے اپنے بچّوں کو مذہب سے آشنا کرو اس سے پہلے کہ مخالفین تم پر سبقت لے جائیں اور انہیں خلافِ حق باتوں کی تعلیم دینے لگیں۔" (کافی۔ج ٦۔ص ۴۷)

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے کہ۔

"ایامِ طفلی میں کسی بھی قسم کی بُری عادت کا اپنالینا اچھی عادت کے حصول میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بچپنے میں عادات پیدا کرنا اس قدر اہم شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ابتدأً پیدا کردہ عادات نیک ہوں تو آئندہ زندگی میں بہت زیادہ شوق دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسان بچپن میں جو عادات اختیار کرلیتا ہے بعد کی زندگی میں اس کی خواہشات و میلانات بھی اسی مانند ہوجاتے ہیں اور اسی تناسب سے موثر و مُسلّط ہوتے ہیں۔ اور ان ابتدائی عادات کے منافی جو عادات بعد میں کسب کی جاتی ہیں ان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس قدر تاثیر و تسلّط پاسکیں۔ لہٰذا ابتدائی عادات کے موضوع پر مکمل توجہ دی جانی چاہئے۔" (در تربیت۔ص ۵۸)

دوسرا باب

عقل و ضمیر دو سعادت بخش سرمائے

انسان کا سب سے بڑا امتیاز

انسانی فطرت میں گوناگوں تمایلات و میلانات کے بیج پڑے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اس کی سعادت و ترقی اور اوجِ کمال کی جانب سفر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

انسانی حیات کے پہیوں کو حرکت میں لانے والا سب سے بڑا محرّک یہی فطری تمایلات ہیں۔

جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کے دل میں نئی نئی خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔ اس کی مسلسل و پے در پے کوششوں کا مقصد انہی خواہشات کی تکمیل ہوتا ہے۔ جوں ہی اس کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے فوراً دوسری خواہش سر ابھار لیتی ہے اور اس میں حرکت و جنبش کی روح ایجاد کرکے ایک نئی سمت میں جدوجہد پر لگادیتی ہے۔

بشر طبیعی و فطری ہدایت کے ذریعہ سے اپنی خوش بختی کی راہ پہچاننے اور اس پر گامزن ہونے سے قاصر ہے۔ جبکہ حیوان ہدایتِ تکوینی کے ذریعہ اپنے کمال کی راہیں طے کرتا ہے۔ اپنے مناسب کمال تک پہنچنے کے لئے حیوان کی تکیہ گاہ اس کا غریزہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنی زندگی کو نظم و ضبط عطا کرتا ہے۔

ہر گروہ کے وظائف و فرائض کی حدود قانونِ غریزہ کی بنیاد پر معیّن کی گئی ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی زندگی کی راہ و روش جاننے کے لئے تعلیم و تربیت سے بے نیاز ہے۔

لیکن حیوان کی مانند انسان کی رہبری و رہنمائی اور اسے زوال و انحراف سے محفوظ رکھنا غریزہ کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ انسان کی اوّلین رہنما جو اسے حیوانات کی صف سے جدا کرتی ہے وہ عقل و خرد ہے۔ اور یہی اسے زندگی کی راہ دکھاتی ہے۔ تعقّل و تفکّر کے ذریعہ راہِ سعادت کی تشخیص کی جاسکتی ہے اور حصولِ کمال کے لئے خوش بختی و سعادت کی راہ پر مضبوط قدموں سے آگے بڑھا جاسکتا ہے۔

کاروانِ بشریّت عقل و فکر کے سائے میں مسلسل کمال کی جانب گامزن ہے اور عقل کی مدد سے زندگی کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں مصروف ہے اور ہر روز میدانِ کارزار میں مشکلات کے مورچے فتح کر رہا ہے۔

انسانی نفس کی وسعتوں میں ہمیشہ حرص و ہوس اور عقل و خرد کے مابین جنگ جاری ہے اور پیہم یہ مخالف قوتیں ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ معنوی قوتوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے اور ان کے نقصانات سے محفوظ رہنے کی غرض سے ہمیں خواہشات کی لگام عقل کے ہاتھوں میں دے دینی چاہئے اور اپنی تمام غرائز اور معنوی قوتوں کو عقل کی مکمل اطاعت کا خوگر بنانا چاہئے۔

تعقّل و تفکّر کا عظیم سرمایہ ہمیں حقیقی خطرات سے آگاہ کرتا ہے اور معنوی

صلاحیتوں سے استفادہ کا صحیح طریقہ سکھا کر زندگی کو نظم و ضبط بخشتا ہے۔

البتہ خواہشات کا پیمانہ ہر عمر میں یکساں نہیں رہتا بلکہ تمایلات و غرائز زندگی کے مختلف ادوار اور گوناگوں حالات میں کاملاً متفاوت ہوتے ہیں۔

جیساکہ ممکن ہے انسان عقل اور مضبوط قوتِ ارادی کے زیرِ سایہ اپنی سعادت کی بنیاد تلاش کر لے اور اپنے داخلی دشمن کو روح پر مسلط ہونے کا موقع فراہم نہ ہونے دے۔ لیکن ممکن ہے غرائز کی تُند و تیز موجوں کے مقابل گھٹنے ٹیک دے اور فساد و تباہی کے خوفناک سیاہ گرداب میں جا پھنسے۔ لہٰذا اگر انسان حصولِ سعادت کا مشتاق ہے تو اسے چاہئے کہ فریبی خواہشات سے محفوظ رہنے کے واسطے روح کے لئے ایک مُحکم زرہ تیار کرے۔ نئے سرے سے اپنی راہ و روش کا تعین کرے اور جان لے کہ یہ پُر پیچ و خم راستہ اسے کہاں پہنچائے گا تاکہ اپنی فکر کو نظم و ضبط میں لا کے بہارِ زندگی کو تقویٰ و فضیلت کے سایہ میں گزار سکے۔ کیوں کہ فداکاری و سَرسپُردگی جو ضروریاتِ زندگی میں سے ہے اس کے بغیر پاکیزہ اور پر افتخار زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔

جو شخص اپنی عقلانی زندگی کی ابتداء ہی سے فضیلت و انسانیت کے اصولوں پر خاص توجہ مرکوز رکھتا ہے اور پستیوں سے پرہیز کی عادت اپنا لیتا ہے اس کی روحانی صلاحیتیں بہترین طریقے سے پروان چڑھتی ہیں۔ اور اس کے لئے آئندہ زندگی میں یہ روش جاری رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسی روش پر چلتے ہوئے وہ جوانی کی سرحد عبور کر جائے تو پھر اس کے انحراف کا خطرہ بڑی حد تک کم رہ جاتا ہے۔ اور ایسا انسان ایک حد تک مفاسد سے محفوظ و مصئون ہو جاتا ہے۔

باطنی خواہشات کو بآسانی اور بغیر کسی محدودیت کے قبول کرتے چلے جانے سے نا صرف یہ کہ انسانی شخصیت میں ناپسند و ناگوار آثار باقی رہ جاتے ہیں بلکہ یہ اثرات معاشرتی تزلزل و اضمحلال پر منتج ہوتے ہیں۔ لہٰذا سعادت و خوش بختی کے حصول اور سماجی نظام کی بقاء کے لئے اپنی بعض خواہشات سے چشم پوشی برتنا ضروری ہے۔

پروفیسر "کارل" کہتا ہے کہ:

"ہم نے ابھی تک یہ نہیں سیکھا ہے کہ جس طرح ہم فزکس کے قوانین اور کششِ ثقل کے نظریہ کی اطاعت کرتے ہیں اسی طرح زندگی کے قوانین کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کر لیں۔ آج آزادیٔ انسان اور طبیعی قوانین کے مابین جنگ جاری ہے۔ انسان مطلق خودمختاری کا خواہاں ہے لیکن اس کے باوجود وہ بغیر کسی خطرے کے ممنوعہ مقامات سے باہر اپنی آزادی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

آزادی بھی ڈائنامائیٹ کی مانند ایک موثر لیکن خطرناک ذریعہ ہے جس کو چھونے سے پہلے اس کے استعمال کا طریقہ جاننا ضروری ہے۔

وہی شخص ڈائنامائٹ سے استفادہ کر سکتا ہے جو صاحبِ عقل اور ارادہ کا حامل ہو۔ یہی صورت آزادی کی بھی ہے۔ فطری قوانین کی پیروی کے لئے ضروری ہے کہ ارادے کی آزادی محدود رہے۔

معنوی نظم و ضبط کے بغیر زندگی میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔

انسانی آزادی اور قوانینِ طبیعی کی پابندیوں کے درمیان پایا جانے والا تضاد تزکیہ نفس کے سلسلے میں مشق و ریاضت کی تائید کرتا ہے تاکہ

خود کو اور اپنے بعد رہ جانے والوں کو خطرات سے محفوظ رکھ سکے۔
اپنی بہت سی تمناؤں اور خواہشات کے خلاف ڈٹ جانا چاہئے' فداکاری اور قربانی کے بغیر نظامِ کائنات سے توافق ممکن نہیں۔ ایثار خود زندگی کا ایک قانون ہے۔ اپنی بعض تمناؤں سے چشم پوشی کے ذریعہ ہی سلامتی و توانائی کا حصول ممکن ہے۔ فداکاری و قربانی کے بغیر عظمت و جمال و تقدس کا کوئی وجود نہیں۔
ہر شخص کو ایثار گر ہونا چاہئے کیوں کہ فداکاری و ایثار انسانی حیات کی ضروریات میں سے ہے۔ جب ہمارے اَسلاف میں غریزہ کی جگہ آزاد عقل نے لی تو یہ ضرورت خود بخود اُبھر کر سامنے آئی۔ انسان نے جب بھی اپنی آزادی سے استفادہ کیا ہے' طبیعی قوانین کو پامال کیا ہے اور سخت نتائج بھگتے ہیں۔" (راہ و رسمِ زندگی۔ص ۳۸-۳۹)

عقل کی حدود

عقل ان عظیم نعمات میں سے ہے جن سے خدا نے انسان کو سرفراز فرمایا ہے۔

"قل ھوالذی انشا کم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ماتشکرون"

"آپ کہہ دیجئے کہ خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی نے تمہارے لئے کان' آنکھ اور دل قرار دیئے ہیں۔ مگر تم میں سے بہت کم لوگ شکریہ ادا کرنے والے ہیں۔" (سورۂ ملک ۶۷- آیت ۲۳)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"افضل حظ الرجل عقله ان ذل اعزه و ان سقط رفعه وان ضل ارشده وان تکلم سدره"

"آدمی کا افضل ترین سرمایہ اس کی عقل ہے' کیونکہ اگر وہ ذلّت سے دوچار ہوتا ہے تو عقل اسے عزت دلاتی ہے۔ اگر وہ گرنے لگتا ہے تو عقل اسے سنبھال لیتی ہے۔ اگر وہ گمراہ ہونے لگتا ہے تو عقل اسے راہِ راست کی ہدایت کرتی ہے اور اگر وہ کوئی بات کرتا ہے تو عقل اس بات کو ٹھوس بنا دیتی ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۲۱۲)

اسلام نے عقل کو باطنی حجّت قرار دیا ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"ان لله علی الناس حجتین حجة ظاهرة وحجة باطنة' فاء ماالظاهرة فالرسل والانبیاء والائمة واماالباطنةفالعقول"۔

"خداوندِ عالم نے ہدایتِ بشر کے لئے دو راہنما قرار دیئے ہیں۔ ایک آشکار اور دوسرا پنہاں' خدا کی آشکارا حجّت انبیاء و اولیائے کرام ہیں اور باطنی حجّت عقل ہے۔" (اصولِ کافی۔ج۱۔ص ۱۶)

کیونکہ تمام لوگوں کی عقلی استعداد یکساں نہیں ہوتی' مختلف لوگوں کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے روزِ قیامت ہر فرد سے اس کی عقل و فہم کے مطابق بازپرس ہوگی۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"انما یداق اللہ العباد فی الحساب یوم القیامۃ علی قدر ما اتاھم من العقول فی الدنیا"

"قیامت کے روز خداوندِ عالم اپنے ہر بندے سے اس کی عقل و خرد کے مطابق حساب لے گا۔" (اصولِ کافی' کتاب عقل و جہل)

عقل کے کرشموں نے دورِ حاضر کے انسان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے' وہ محض عقل کا شیفتہ و فریفتہ ہو گیا ہے۔ علمی انکشافات ہی کو اس نے زندگی کا ہدفِ نہائی سمجھ لیا ہے۔

اس طرزِ فکر کے نتیجے میں انسان نے عقل اور انسانی حیات میں اس کے کردار پر ناقابلِ تلافی ضرب لگائی ہے۔ یہ فریفتگی اس بات کا سبب بنی کہ انسان غیر محسوس امور اور مبداء ہستی سے براہِ راست پیوستہ استعداد و توانائیوں سے چشم پوشی برتنے لگا۔ اگر مغرور انسان کی نظر دور تر اور وسیع تر افق پر ہوتی اور وہ وسیع پھیلے ہوئے غیر محسوس میدانوں میں قدم بڑھاتا تو ہرگز محض عقل کی جلوہ آرائیوں پر اکتفا نہ کرتا۔ اسلام عقل کی حدود' حقیقی قدر و قیمت اور اس کے میدانِ عمل سے کاملاً آگاہ ہے اور اسی آگاہی کے مطابق اس کی پرورش و ہدایت کرتا ہے تاکہ انسان ہستی کے حقائق کو دقتِ نظر سے دیکھے۔

قرآنِ کریم عقل کو حکم دیتا ہے کہ جب تک کوئی چیز یقینی طور پر اس کے لئے ثابت نہ ہو' اس کی پیروی نہ کرے اور جب تک قطعی دلائل ہاتھ نہ آجائیں کسی چیز کو قبول کرنے سے احتراز کرے۔

"ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسؤلا"

"اور جس چیز کے بارے میں تمہیں علم و یقین نہ ہو اس پر بھروسہ نہ کرنا کہ روزِ قیامت سماعت' بصارت اور قوتِ قلب سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۶)

آیتِ کریمہ کی تصریح ہر موضوع کو قبول کرنے کے لئے کافی و وافی تحقیق کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ اور اسی طرح ایسے افراد کی کجی پر اشارہ کرتی ہے جن کا علم' یقین پر استوار نہیں ہوتا اور وہ محض ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ پھر تاکید ہے کہ۔

"ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا"

"یہ صرف وہم و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں اور گمان حق و حقیقت کی پہچان کے سلسلے میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا ہے۔" (سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۲۸)

پھر محکم دلائل کے ذریعہ ایسی فکری بنیادوں کو جو اندھی تقلید پر رکھی گئی ہیں' منہدم کرتے ہوئے فاقد العقل مقلدین کو خبردار کرتا ہے کہ آباؤ اجداد کی بے دلیل اور اندھی تقلید سراسر گمراہی ہے۔

"قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا اولو کان اباوھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۷۰)

"کہتے ہیں کہ ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔"

یہ ہدایت و رہنمائی محققانہ طرزِ تفکر اور عقل کے صحیح استعمال کی تلقین اور ظن و گمان کو مسترد کرنے کے لئے ہے۔ اور اس طرح قرآنِ کریم عقل کو تفکّر و تعقل اور گہری سوچ بچار کی ترغیب دیتا ہے تاکہ مختلف قوتوں اور افکار و نظریات کو عقل اپنے کنٹرول میں لے لے۔

اسلام جس قسم کے تفکر و تعقل، غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہ محض اپنی خام خیالی کے محور پر سوچنا اور محسوس حقیقتوں سے بے خبر رہتے ہوئے (ان ہی خیالات کو) فلسفی اندازِ فکر کا نام دینا نہیں۔ قرآنِ کریم تخلیق کے بارے میں آیات بیان کرتے ہوئے انسانی عقل کو بیدار کرتا ہے تاکہ انسان اپنی شعوری قوتوں کو کائنات میں حقِ تعالیٰ کی عظمت و حکمت کی نشانیوں پر گہرے غور و فکر کے لئے کام میں لائے۔ اپنی خام خیالیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے آزاد فکر کے ساتھ حقائق کو درک کرے اور اوہام و خرافات کے تاریک جنگلوں میں سرگرداں و پریشاں نہ ہو جائے۔ اور بالآخر اس کے حواس و ادراک ایک ایسی روحِ حق سے پیوست ہو جائیں جو پوری ہستی میں جاری ہے اور یہ عقل کی اعلیٰ ترین فضیلت ہے۔

یورپی فلسفی "اسپنوزا" کہتا ہے:

"ہمارا ذہن جس اعلیٰ ترین وجود کو سمجھنے پر قادر ہے، وہ خدا ہے یعنی ایک مطلق لامتناہی وجود، کہ جس کے بغیر نہ تو کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ تصور میں آسکتی ہے۔ لہٰذا جو چیز خاص طور پر ذہن کے لئے سود مند ہے۔ یا یہ کہ جو چیز ذہن کے لئے عظیم ترین اچھائی ہے وہ وجودِ باری

تعالیٰ کا علم ہے۔ نیز فکر جہاں تک سمجھتی ہے عمل کرتی ہے اور اس حد تک یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے فضیلت کے مطابق عمل کیا ہے۔ بنا بر ایں ذہن کی فضیلت یہی سمجھنا ہے۔ لیکن والا ترین امر جس تک ذہن پہنچ سکتا ہے جیساکہ اس سے قبل ثابت کیا "خدا" ہے۔ پس فکر کی عالی ترین فضیلت خداوندِ تعالیٰ کو جاننا یا اس کی شناخت ہے۔" (فلسفۂ نظری۔ ص ۹۷)

تفکر و تعقل کا مقصد، انسانی قلب کی اصلاح اور حق و عدالت کے اصولوں پر زندگی کی بنیاد رکھنا ہے۔ جب انسان غور و فکر کے بعد کسی نکتہ تک پہنچتا ہے اور اس سلسلہ میں گہری آگاہی کا حامل ہو جاتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس علم کو عمل میں لائے اور اپنی عملی اور خارجی زندگی میں اس سے استفادہ کرے۔ ضروری ہے کہ یہ بڑھتا ہوا ایمان کُلّی طور پر اعمال و افکار کو اپنے حصار میں لے لے اور کامیابی کے لئے ہر اُس بیہودہ امر سے مقابلہ کرے جو انسانی اقدار کو تباہ و برباد کرنے کا باعث ہے۔

اس کے باوجود کہ عقل خود تشخیص کا سب سے بڑا منبع اور بہترین رہنما ہے لیکن کدورتوں کے غبار سے دھندلا بھی جاتی ہے، جب ہوا و ہوس عقل پر گہرے پردوں کی مانند کھنچ جاتے ہیں اور اس کی تابناکی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں تو یہ عملی طور پر اپنی رہنمائی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم ہوا و ہوس کے گمراہ کن کردار کے بارے میں یوں فرماتا ہے۔

"فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون اھوائھم ومن اضل ممن اتبع ھوىه بغیر ھدی من اللّٰہ ان اللّٰہ لا یھدی القوم الظالمین"

"اگر انھوں نے آپ کی دعوت کا مثبت جواب نہ دیا تو جان لیجئے کہ یہ لوگ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے والے ہیں اور اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔ بے شک خدا ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔" (سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۵۰)

"بل اتبع الذین ظلموا اھواءھم بغیر علم"

"حقیقت یہ ہے کہ ظالموں نے بغیر جانے بوجھے اپنی خواہشات کا اتباع کرلیا ہے۔" (سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۲۹)

"ولو اتبع الحق اھواء ھم لفسدت السماوات والارض ومن فیھن"

"اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جاتا تو بے شک زمین اور آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے تباہ ہو جاتا۔"

(سورۂ مومنون ۲۳۔ آیت ۷۱)

"افرءیت من اتخذ الٰھہ ھوىه واضلہ اللہ علی علم"

"کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے۔" (سورۂ جاثیہ ۴۵۔ آیت ۲۳)

بے شک نفسانی خواہشات کو لگام دینا اور ان پر اپنا تسلط برقرار رکھنا بہت سخت اور دشوار کام ہے۔ احساسات کی تند و تیز موجوں اور سرکشی کو مسلسل ضبطِ نفس اور پیہم کوشش کے ذریعہ ہی قابو کیا جاسکتا ہے اور ان کو عقل کے تابع بنایا جاسکتا ہے۔ یہی وہ راہ ہے جسے اختیار کرکے نفسانی خواہشات اور رجحانات اعتدال کی راہ پر لگائے جاسکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان سے صحیح اور مناسب طریقے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت رسولِ مقبولؐ میدانِ جنگ سے پلٹنے والے مجاہدوں سے فرماتے ہیں۔

"مرحبا بقوم قضوا الجھاد الاصغر وبقی علیھم الجھاد الاکبر، قیل یا رسول اللہ وما الجھاد الاکبر، قال جھاد النفس"

"آفرین ہو ان مجاہدین پر جنہوں نے چھوٹے جہاد سے فراغت پالی اب ان کے ذمّہ جہادِ اکبر باقی ہے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہؐ! جہادِ اکبر کیا ہے؟ فرمایا! نفس کے خلاف جہاد۔" (معانی الاخبار-ص ۱۶)

وہی شخص قرب و جوارِ رحمتِ حق حاصل کرپاتا ہے جو اپنی سرکش خواہشات کو کنٹرول کرلے اور ہوائے نفس کو عقل پر مسلط نہ ہونے دے اور اسے ناپاکی و انحراف کی راہ سے پرے رکھے۔

"واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی"

"اور جو کوئی خدا کے مقامِ ربوبیت سے ڈرے اور خواہشاتِ نفس کی پیروی سے اجتناب برتے تو یقیناً اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔"

(سورۂ نازعات ۷۹ - آیت ۴۰-۴۱)

کیا ضمیر دبی ہوئی خواہشات کا نام ہے؟

تمایلات و نفسانی خواہشات کو حدِ اعتدال میں رکھنے ''ایک بڑا عامل ضمیر ہے۔ اس اوّل روز سے جبکہ انسان نے خاک کی اس وادی (زمین) پر قدم رکھا اور اپنی زندگی کا آغاز کیا آج تک کہ جس کے درمیان برسہا برس کا طولانی زمانہ پایا جاتا ہے، انسان ہمیشہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اچھائی اور خوبی کی جانب مائل اور بُرائی و بدی سے متنفر رہا ہے۔ اور سفرِ حیات میں عقل و ضمیر دوش بدوش، قدم بقدم رہے ہیں۔

جب انسان خار اور گُل میں تمیز کر لیتا ہے، ایک کو پرے پھینکتا اور دوسرے کی خوشبو سے مشامِ جان معطر کرتا ہے، جب پاکی و ناپاکی میں فرق کا قائل ہو جاتا ہے تو یقیناً خوبی اور بدی کے معاملہ میں بھی خطا کا شکار نہیں ہوتا۔

ضمیر کی خصوصیات جہانِ خلقت کے دلچسپ ترین مظاہر میں سے ہیں۔ معتدل روح کا حامل انسان عدل و امانت سے شادمانی اور خیانت و ظلم سے ناگواری محسوس کرتا ہے۔

گو عقل حقیقت کے ادراک کے سلسلے میں ایک خاص امتیاز کی حامل ہے پھر بھی کسی چیز کے بارے میں ضمیر کا یقین عقل کے یقین سے زیادہ واضح اور موثر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ موضوعات جنہیں انسان اپنے وجود کے باہر سے

درک کرتا ہے وہ اس کے ذہن کے آئینے پر منعکس ہو کر عقل کے وسیلے سے یقین میں ڈھلتے ہیں۔ اور وہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ موضوع ایک جداگانہ حقیقت اور ذہن سے باہر ایک چیز ہے۔ حالانکہ یہی یقین جب ضمیر کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے تو اس کی منزل مشاہدے اور دیکھنے کی حدود سے بالا تر ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ انسان اس موضوع کو خود اپنے وجود کا حصّہ تصور کرنے لگتا ہے۔

فرائڈ اور اس کے ہم خیال دانشور اور نفسیات کے بعض ماہرین ضمیر کے فطری ہونے کے منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سماجی پابندیوں اور زندگی کے دوران دبی ہوئی خواہشات جو انسان کے باطن میں اکٹھی ہو جاتی ہیں انہیں ضمیر کا نام دے دیا گیا ہے۔ وگرنہ انسانی روح میں اس کی کوئی گہری بنیاد نہیں پائی جاتی۔

فرائڈ نے نفسیات پر اپنی گوناگوں تحقیقات کے ضمن میں جنسی مسائل کا زیادہ تجزیہ کیا ہے۔ اس نے ان دوسرے باطنی عوامل پر توجہ نہیں دی ہے جو اچھے اور بُرے اعمال کا سبب بنتے ہیں۔

آج تک دنیا میں کوئی ایسی قوم دریافت نہیں ہوئی ہے جو خیانت، وعدہ خلافی، پیمان شکنی اور ظلم و ستم کو شرافت و پاکیزگی قرار دیتی ہو اور امانتداری، عہد و پیمان کی وفا اور عدل و انصاف کو ناشائستہ سمجھتی ہو۔ اور جس کے نزدیک اعمالِ بد اور بُرے اخلاق مایۂ سعادت و خوش بختی ہوں۔

فرائڈ کا نظریہ اس وقت درست مانا جا سکتا تھا جب انسان خوبی اور بدی کو اس کائنات کی درسگاہ سے سیکھتا۔ لیکن ان اچھائیوں اور برائیوں کو جنہیں

کائنات پر بسنے والے تمام انسان خواہ وہ متمدّن ہوں یا غیر متمدن، حتیٰ وہ اقوام بھی جن میں انبیاءؑ و مصلحین بھی نہیں گزرے قبول کرتی ہیں۔ ان صفات کو ہرگز معاشرتی پابندیوں اور دبی ہوئی انسانی خواہشات کی پیداوار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جب فرائڈ ضمیر کا (ان معنوں میں جو علمِ اخلاق میں اسے حاصل ہیں) انکار کرتا ہے۔ اور انسان کو خواہشات و غرائز کا مجموعہ قرار دے کر اس کی تحقیر کرتا ہے تو لازماً اس طرح وہ تمام اخلاقی اقدار کا انکار کر رہا ہوتا ہے۔ اور کُلّی طور پر روح کی گہرائیوں میں عمل کرنے والی معنویات اور پاک و پاکیزہ تمایلات کی قدر و قیمت گھٹا رہا ہوتا ہے۔ اور اس طرح عدالت، رحم، نیکی، باہمی تعاون جیسی چیزوں کو بے مفہوم اور کھوکھلا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرائڈ کے اس عقیدے کی رو سے کوئی بھی شخص فطری خواہشات کو پسِ پشت ڈالے بنا اور طبیعی محرکات کی سرکوبی کئے بغیر جہانِ مطلوب کی جانب ایک قدم بڑھانے پر بھی قادر نہیں اور نہ ہی وہ اپنے ذاتی ارادے کی بناء پر لذائذ سے چشم پوشی برتتا ہے بلکہ اس گریز کا واحد سبب خارجی دباؤ اور جبر ہے۔

اگر یہ سمجھا جائے کہ ضمیر بیرونی عوامل کی پیدا کردہ کوئی چیز ہے تو فرائڈ کا سطحی نظریہ ان اقدامات کی کیا توجیہ کرے گا جو انسان ذاتی نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر محض اعلیٰ مقاصد کے لئے بخوشی و رغبت اٹھاتا ہے، عالی ترین اہداف کے لئے مصائب و آلام جھیلتا ہے، مادّی لذّتوں سے چشم پوشی کرتا ہے..... اس طرح تو یہ مسئلہ ایک لاینحل اور پیچیدہ معمہ کی صورت باقی رہ جائے گا۔

تاریخ کے عظیم مصلحین اور رہنمایانِ بشریّت لوگوں کو ایک پاکیزہ انسانی

کائنات کی تشکیل کی جانب دعوت دیتے تھے اور ان کے ماننے والے بھی ان کی اطاعت زور مندوں اور طاقتوروں کے دباؤ کی بناء پر نہیں کرتے تھے۔

انسان اپنے ارادہ و اختیار سے راہِ فضیلت طے کرتا ہے، اپنی بعض شہوانی خواہشات سے صرفِ نظر کرتا ہے اور کسی عقدۂ نفسانی (Complex) کے بغیر شوق و رغبت کے ساتھ پاک انسانی احساسات کا جواب دیتا ہے اور ایسے نیک کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے جن کی انجام دہی کے بارے میں اس کا دین یا سماج ہرگز اسے مجبور نہیں کرتے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان تاریکیوں کے مخزن خفیہ باطن، اور پست شہوانی خواہشات کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس کی سرشت میں کمالِ مطلوب تک رسائی کی آرزو بھی رکھی گئی ہے اور اس کے اندر ایک ایسی حالت پائی جاتی ہے جو کسی بیرونی، عرفی، دینی یا معاشرتی دباؤ سے قطع نظر آزادانہ طور پر اسے نیکیوں کی دعوت دیتی ہے اور بُرائیوں سے روکتی ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو بے ضمیر زندگی کو ننگ اور غیر شریفانہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کسی صورت اپنے ضمیر کی مخالفت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اگر یہ صورت آپڑے تو وہ اس طرح زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

جب یہ لوگ کسی باطنی عامل کی پیروی کرتے ہوئے کوئی نیک عمل انجام دیتے ہیں تو انہیں اس قدر طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ اس ایک لمحہ کی قدر و قیمت کے مقابل انہیں اپنی پوری زندگی ہیچ نظر آتی ہے۔

اگر انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور اسے تاکید کر دی جاتی کہ "محض ذاتی فوائد حاصل کرنے اور خود کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے سوا کوئی

دوسرا اصول مقدس نہیں" تو دنیا ہرگز ترقی و پیشرفت کے اس مرحلے پر نہیں پہنچ سکتی۔

ضمیر کی قلم رو

ضمیر کے فیصلوں میں خطا اور غلطی کی بہت کم گنجائش ہوتی ہے۔ انسان سے سرزد ہونے والی طرح طرح کی غلطیوں کا سبب موضوعات کی تشخیص میں عقل و حواس کا خطا کر جانا یا ضمیر کا سرکش خواہشات کے مقابلے کی سکت کھو دینا ہے۔

بنابراین انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آنے والی غلطیاں ضمیر کی ناتوانی یا خطا سے مربوط نہیں۔ کیونکہ یہ فطری طاقت اپنی قلم رو و عملداری سے باہر کوئی کام انجام نہیں دیتی۔ ضمیر عقل و حس سے حاصل ہونے والے قوانین اور موضوعات کا جائزہ لے کر ان کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے۔

پاک اور سالم فطرت جرم و گناہ سے پرہیز کرتی ہے۔ لیکن عین ممکن ہے کہ بعض عوامل کی بناء پر جرُم و گناہ سے آلودہ ہو جائے اور انسان کے دامن پر رسوائی کا داغ لگا دے۔ لیکن جوں ہی جرُم سے فارغ ہو کر انسان خود سے راز و نیاز میں مشغول ہوتا ہے، اس پر اس حادثہ کا ناگوار ہونا ظاہر ہونے لگتا ہے اور پھر اس کے باطن میں ایک خلش سی پیدا ہو جاتی ہے اور شرمساری و ندامت کی کیفیت اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ یہ ضمیر ہی کا اثر ہے جو جرُم کے بعد اسُے ملامت کرتا ہے اور ہمیشہ اسُ پر تازیانہ حسرت برساتا رہتا ہے۔

ضمیر نہ صرف یہ کہ ایک قابلِ اعتماد رہنما ہے بلکہ ایک باوفا اور عادل گواہ

بھی ہے جو انسان کے اعمال پر نظر رکھتا ہے اور اسی کے مطابق گواہی دیتا ہے۔

ممکن ہے ایک شخص اپنے حقیقی جذبات کے برعکس کوئی بات کرے یا اپنی حرکات و سکنات سے اختیار و ارادے کو اس طرح سلب کر لے کہ ان کے وسیلہ سے اس کا باطن ظاہر نہ ہو سکے۔ لیکن انسان اس بات پر ہرگز قادر نہیں کہ ضمیر کی آواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے اور اسے سرزنش و لعنت ملامت کرنے سے باز رکھے۔ انسان اپنے ضمیر کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ شاید اس کے لئے یہ تو ممکن ہو کہ دھوکہ و فریب سے اس کی فعالیت کی راہ روک دے اور اسے ایک مدّت کے لئے خوابِ غفلت سے دوچار کر دے۔ لیکن جوں ہی ضمیر سے یہ رکاوٹیں دور ہوں گی اور وہ بیدار ہو گا تو فوراً صراحت کے ساتھ اس کے قبیح اعمال پر اسے ملامت کرے گا اور تازیانہ حسرت سے اسے سخت سزا دے گا۔

انسان کسی چیز کو "اپنی ذات" سے زیادہ محبوب نہیں رکھتا۔ درحقیقت اندر ہی اندر مضطرب ہونا سخت ترین روحانی اذیت ہے۔ اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کا وجود جس آگ کے شعلوں کی زد میں ہے وہ خود اس کے گناہوں کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ لہٰذا انسان کو جرائم سے باز رکھنے والا سب سے بڑا عامل ضمیر ہے۔

اگر آدمی پر پڑنے والی روحانی ضربات اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہوں تو تشویش و اضطراب ضمیر پر حاوی ہو جاتا ہے اور ضمیر پر پڑنے والا سخت جانکاہ دباؤ بعض نفسیاتی کارکردگیوں کو اپنے مخصوص راستوں سے ہٹا دیتا ہے اور اختلال و روحانی بیماریاں جنم لینے لگتی ہیں۔ بعض دیوانوں کا نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ ارتکابِ گناہ کے نتیجے میں پڑنے والے ضمیر کے بے پناہ دباؤ نے انہیں

عقل و خرد سے بے گانہ کر دیا اور وہ حسرت و ندامت کی آگ میں جھلسنے لگے۔

کبھی کبھی تو خواہشاتِ نفسانی اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ اپنے ضمیر کو دھوکہ دے دے اور اس کی تاثیر کے آڑے آجائے۔ لیکن یہ ضمیر کی حیرت انگیز خاصیت ہے کہ وہ طاقتور خواہشات کا بھی سختی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے اور جب تک خواہشات کا دباؤ ختم نہیں ہو جاتا وہ ان کے مقابل ڈٹا رہتا ہے اور اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔

"ہنری باروک" کہتا ہے :

"ضمیر نہایت ثابت قدم ہوتا ہے۔ حتیٰ جب روشنی اس درجہ کم ہوتی ہے کہ دیکھنا مشکل ہوجاتا ہے تب بھی وہ دل کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور اس دم بھی جب اس کی روشنی انتہائی مدہم پڑجاتی ہے وہ اتنی سکت رکھتا ہے کہ اپنی خیرہ کنندہ چمک کا پھر سے آغاز کر سکے۔" (بیمار یہائی روحی و عصبی۔ص ۷۳)

جس نے بھی ضمیر کے فرمان سے روگردانی کی اور فطرت کی راہِ راست سے منحرف ہوا وہ اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے روحانی عذاب کا شکار ہوگیا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے ضمیر کے سرور انگیز نغموں کو کان لگا کر سنا' اس کے فرمان کی پیروی کی' تو انہیں روحانی سکون و راحت نصیب ہوا۔ ایسا سکون جس کے حصول کے لئے گمراہ لوگ فضول راہوں اور سراب کی جانب دوڑتے رہتے ہیں۔

قرآن اور ندائے فطرت

آج اکثر دانشوروں نے فرائڈ کے نظریہ کو مسترد کر دیا ہے اور وہ ضمیر کو

انسانی سرشت کا ایک جز سمجھتے ہیں۔ وہ مفکرین جنہوں نے کائنات اور انسان کی شناخت کے سلسلے میں عقلِ سلیم سے استفادہ کیا ہے' وہ ضمیر کے وجود کے معتقد ہیں۔ نیز ان کا اعتقاد ہے کہ پسندیدہ صفات کی جانب رغبت اور بُرائیوں سے پرہیز کے جذبات انسانی فطرت میں شامل ہیں اور دستِ قدرت نے یہ سعادت بخش سرمایہ ہر انسان کی سرشت میں ودیعت کیا ہے۔

ہم اس بارے میں قرآنِ مجید کی آیات کے ضمن میں بعض مغربی دانشوروں اور محققین کے نظریات پیش کریں گے۔

قرآنِ کریم خیر و شر کو بخوبی درک کرنے والی اس باطنی قوت کو الہامات و افاضاتِ الٰہی میں شمار کرتا ہے۔

"ونفس وما سوّٰها فالهمها فجورها وتقوٰها"

"اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا ہے' پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔" (سورۂ الشمس ۹۱۔ آیت ۷۔۸)

جان روسو (Jean Jacques Rousseau) کہتا ہے کہ۔

"صحیح ہے کہ کوئی شخص اپنی منفعت اور فائدے کو مدِ نظر رکھے بغیر کوئی کام شروع نہیں کرتا۔ لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ایک معنوی سعادت اور روحانی لذّت بھی پائی جاتی ہے جس کے حصول کے لئے نیکوکار لوگ قربانی و فداکاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بنابرایں صرف سنگ دل افراد کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض اپنے مادّی مفادات کے حصول کے لئے کام کرتے ہیں۔

ضمیر کی کارکردگی کو عقلی فیصلوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ

معنوی اور فطری حس کی پیداوار ہوتے ہیں۔ بالفرض اگر ہم اپنی فطرت کے ذریعہ ضمیر کی حقیقت و ماہیت تک نہیں پہنچ سکتے تو بھی ہمارا باطن گواہی دے گا کہ ضمیر یقیناً ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔

اے ضمیر، اے غریزۂ ملکوتی، اے صدائے جاویداں، اے نادان و کم عقل موجودات کی رہنما، اے عاقل و آزاد چیز، اے وہ جو نیکی اور بدی کے درمیان بالکل صحیح صحیح تمیز کرتا ہے۔

تو ہی ہے جو انسان کو خدا سے نزدیک کرتا ہے اسے اس کی فطرت و نیکی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس کے اعمال کو اخلاقی قوانین کے مطابق بناتا ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو میں اپنے وجود میں کسی ایسی چیز کو محسوس نہ کرتا جو مجھے حیوانوں سے برتر قرار دے اور ان سے میرا امتیاز صرف یہ ہوتا کہ میں نامرتب فہم و ادراک اور نامنظم عقل کے ذریعہ گمراہ ہو جاتا اور خطا کے بعد خطا کا مرتکب ہوتا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب ہم فلسفی استدلالات کے وحشتناک شر سے نجات پا چکے ہیں۔ یعنی اب ہم بغیر وقت ضائع کئے انسان بن سکتے ہیں۔ اب ہم اس بات پر مجبور نہیں رہیں گے کہ اپنی عمر کا ایک حصّہ اخلاقی کتب کے مطالعہ پر صرف کریں۔ اور اب ہم معمولی مشقت کے بعد پیچ و خم سے پُر راہوں پر ایک قابلِ اطمینان رہنما کی پیروی کرتے ہوئے اپنی راہ پا سکیں گے۔

لیکن اس رہنما کا وجود ہمارے لئے کافی نہیں بلکہ ہم میں اس قدر صلاحیت کا ہونا ضروری ہے کہ اسے پہچان کر اس کی پیروی کر سکیں۔

اگر وہ تمام لوگوں کے دلوں سے بات کرتا ہے تو پھر اکثر لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ ان کا دل اس کی آواز نہیں سنتا؟ اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتا؟

ہاں جب ہم ضمیر کی صدا پر لبیک نہیں کہتے تو وہ بھی سرد پڑ جاتا ہے۔ پھر وہ ہم سے بات نہیں کرتا، ہمیں جواب نہیں دیتا۔

اور پھر یہ ضمیر کی مسلسل توہین ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے جیسے اس کی صدا کا مسترد کرنا مشکل ہوتا تھا اب سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اگر روحانی لذّتیں انسان سے چھن جائیں تو پھر دوبارہ ان کا ہاتھ میں آنا بہت مشکل ہے۔" (امیل EMILE، ص۳۷۶-۳۷۷)

پروفیسر "فریڈمین" کہتا ہے کہ:

"ضمیر کی یہ صدا تعلیم و تربیت یا کسی اور وسیلہ سے میسر نہیں ہوتی، بلکہ یہ انسانی شخصیت کا ایک جزٗ ہے۔ کوئی شخص معاشرہ میں خواہ کسی بھی اعلیٰ منصب پر فائز ہوا ہے، یا انسانی سماج میں رہبری کے مقام پر پہنچا ہے تو یہ ضمیر کی آواز ہی ہے جس نے نیکی و پرہیزگاری کی جانب اس کی ہدایت کی ہے۔" (روانشناسی درخدمتِ سیاست۔ ص ۳۲)

ایک ماہرِ نفسیات کہتا ہے کہ:

"ضمیر کوئی مصنوعی ردِّعمل نہیں، بلکہ انسانی فطرت کا ایک انتہائی گہرا عامل ہے۔ اور انسان مختلف حیلوں ہتھکنڈوں کے باوجود اسے شکست نہیں دے سکا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ضمیر غیر معمولی طور پر

ثابت قدم ہوتا ہے۔ حتیٰ شدید روحانی بیماریوں کے دوران اور جنون
اور روحانی تنزل کے موقع پر اور اس وقت جب عقل و ہوش بھی
شکست کھا چکے ہوتے ہیں' اس کا باقی رہنا جیسا کہ ہم نے پہلے کہا اس
کی اہمیت اور انسانی روح میں نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی دلیل
ہے۔

بعض دانشور خود سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ضمیر تعلیم و تربیت اور
مذہب کی پیداوار نہیں ہے؟ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ابتدائی زمانہ
میں بھی ضمیر کے اثرات نہایت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جیسے
قدیم قبائل میں استغفار کے نظریہ کا پایا جانا اور بہت سی بت پرست
اقوام میں ضمیر کے اثرات کی موجودگی۔ یہ سب اس بات کے گواہ
ہیں کہ اگر اس حقیقت سے انکار کر دیا جائے تو گویا ایسا ہی ہے جیسے ہم
انسانیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

(بیماریھائی روحی و عصبی۔ص ۶۸-۶۷)

"الم نجعل له عینین ولسانا وشفتین وهدینه
النجدین"

"کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں' زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے ہیں
اور (کیا ہم نے اسے) دونوں راستوں کی ہدایت نہیں کردی
ہے۔" (سورۂ بلد ۹۰۔ آیت ۸'۹'۱۰)

پروردگارِ عالم آنکھ' زبان اور لبوں کی عطا کردہ نعمات کے تذکرہ کے بعد خیر
و شر کے بارے میں انسان کی ہدایت و رہبری کی بات کرتا ہے۔ یہاں سے بخوبی

معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں خیر و شر کے درمیان تمیز کی صلاحیت فطری طور پر
موجود ہے۔

"انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه
فجعلنٰه سمیعا بصیرا"

"یقیناً ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے تاکہ اس کا
امتحان لیں اور پھر اسے ہم نے اچھی طرح سننے اور دیکھنے والا بنا
دیا۔" (سورۂ انسان ۷۶۔ آیت ۲)

"سوموئل اسمائلز" یوں لکھتا ہے کہ:

"ضمیر کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر عظیم افکار اور عالی عقول بھی
ایسے اجالے کی مانند ہیں جو گمراہی و ضلالت کا موجب ہوتا ہے۔ ضمیر
ہی ہے جو انسان کے اندر ثابت قدمی پیدا کرتا ہے اور فطرت کی
سیدھی راہ پر چلتے رہنے کے لئے اس کی کمرہمت بندھاتا ہے۔ ضمیر
قلب کا معلّم اخلاق ہے۔ انسان کو عقلِ سلیم' ایمانِ محکم اور پاکیزہ
زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ ضمیر کی غیر معمولی تاثیر کے بغیر پسندیدہ اور
پاکیزہ اخلاق نشوونما نہیں پا سکتے اور نہ ہی کمال کی سرحدوں تک پہنچ
سکتے ہیں۔" (اخلاق' سوموئل اسمائلز۔ص ۷)

"لا اقسم بیوم القیامة ولا اقسم بالنفس اللوامة"

"میں روزِ قیامت کی قسم کھاتا ہوں۔ اور برائیوں پر ملامت کرنے
والے نفس کی قسم کھاتا ہوں۔" (سورۂ قیامت ۷۵۔ آیت ۱-۲)

اس آیت میں انسان کے ضمیر کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ملامت و سرزنش

کی صدا کو نفسِ لوّامہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور نفسیات دان سرزنش کرنے والی اس باطنی صدا کو ضمیر کہتے ہیں۔

پروفیسر "آٹو فریڈمین" کہتا ہے کہ :

"ایک شخص ممکن ہے گھنٹوں میخانے میں بیٹھا رہے، جوئے خانہ میں مشغول رہے، ٹینس کورٹ میں مصروف رہے لیکن پھر بھی اس کی بے کلی کو قرار نہ آئے اور دل لگی کے یہ سارے ذریعہ اس کے لئے بے کار رہیں۔ کیوں کہ ایک باطنی صدا مسلسل اسے کچوکے لگا رہی ہوتی ہے کہ تم اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو برباد کر رہے ہو۔ اور یہ آواز ہمیشہ ضمیر کو خبردار کرتی رہتی ہے۔

ممکن ہے کبھی کھیل کود اور تفریح کے دوران اسے یہ خیال آتا ہو کہ کتنا اچھا ہو کہ یہ وقت میں اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت میں گزاروں۔ کیا خوب ہو کہ میں اس وقت کو باغبانی میں صرف کروں۔

ضمیر کی آواز اسے اچھے اور نیک اعمال کی انجام دہی پر راغب کرتی ہے اور ایسے کاموں پر اکساتی ہے جو خود اس کے اور دوسروں کے لئے مفید ہوں اور یہی وہ وقت ہے جب انسان دوسروں سے اپنا موازنہ کرتا ہے، اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔

جوں جوں ضمیر کی اطاعت کا جذبہ تقویت پائے گا اسی قدر اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور روحانی قوتیں زیادہ اور بہتر ہوتی چلی جائیں گی۔

اور جتنا انسان ضمیر کی صدا کو مسترد کرے گا اتنا ہی بد اخلاق اور بے لگام ہوتا چلا جائے گا۔" (روان شناسی در خدمت سیاست۔ ص ۳۱)

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں :

"من استولی علیه الضجر رحلت عنه الراحة"

"جس شخص پر نفس کی ملامت غلبہ کرلے اس کا سُکھ چین چھن جاتا ہے" (نہج الفصاحہ۔ ص۔۶۲۱)

ممکن ہے ایک لمحہ کی غفلت سے اس کے قدم لڑکھڑا جائیں اور اس کے اختیار و ارادے کی لگام چھوٹ کر ہوا و ہوس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ جس کے نتیجے میں وہ بدبختی، ہلاکت و فلاکت میں مبتلا ہو جائے اور حسرت و یاس اس کا مقدر بن جائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"کم من شهوة ساعة اورثت حزناً طویلا"

"بسا اوقات ایک لمحہ کی شہوت رانی اپنے پیچھے طویل غم واندوہ چھوڑ جاتی ہے۔" (اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۴۵۱)

ہر دور میں تمام انسانی معاشروں نے بوقتِ ضرورت انسان کے اندرونی عامل ضمیر سے استفادہ کیا ہے۔ ایسے لوگ کسی معاشرہ میں قابلِ بھروسہ و اطمینان نہیں ہوتے جن میں حسِ ضمیر نہ پائی جاتی ہو، جو نیک و بد کو ملحوظ نہ رکھتے ہوں۔ مختصر یہ کہ جنھوں نے زندگی کو محض خورد و خواب اور شہوانی لذّات سے لطف اندوز ہونے کا ذریعہ سمجھا ہوا ہو۔ اور خواہشات نفسانی کے طوفان کے سامنے جن کی حیثیت خس و خاشاک کی سی ہوتی ہو۔

جب کسی کے سپرد کوئی ایسا کام کرنا مقصود ہو جس کے لئے بیداریِ ضمیر

ضروری ہو تو پھر کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے لئے ایسے فرد کا انتخاب کیا جائے جو قابلِ اعتماد اور اپنی ذمّہ داری کو بطریقِ احسن پورا کرنے والا ہو۔ کسی ایسے فرد پر یہ کام چھوڑنا جس کا بیدار ضمیر ہونا مشکوک ہو یا جو ضمیر کے خلاف مصروفِ عمل رہتا ہو عقل و خرد کی رو سے درست نہیں۔

سلام نے ضمیر پر خاص توجہ دی ہے' اسی کو روح کی ترقی اور روحانی کمالات کے حصول کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اسلام کی کوشش ہے کہ لوگ اپنے باطن میں ایک ایسا محتسب اور نگراں مقرر کریں جو انہیں حتیٰ طیش کے عالم میں بھی دوسروں کے حقوق پر تصرّف اور انہیں آزار پہنچانے سے باز رکھے۔

قرآنِ کریم لوگوں کو اس طرح خبردار کرتا ہے کہ۔

"ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلواھواقرب للتقویٰ"

"اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ بیٹھو' انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔" (سورۂ مائدہ۵- آیت۸)

لٰہذا قرآنِ کریم کی اس تاکید کی رو سے کسی بھی شخص کو کسی بھی حالت میں دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور ان پر ظلم و ستم ڈھانے کا حق نہیں۔

قانون اگرچہ باہر سے انسان پر کچھ تسلط رکھتا ہے اور اپنے محدود ذرائع سے اسے ناپسندیدہ و قبیح اعمال کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ لیکن اسلام لوگوں میں ضمیر کو پروان چڑھا کر چاہتا ہے کہ وہ خود اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بعض اعمال کے ارتکاب سے چشم پوشی برتیں۔ تاکہ ان کے لئے

کامیابی اور معراجِ معنوی کا حصول ممکن ہو سکے۔ بے شک یہ خود احتسابی ہدف تک رسائی کا نزدیک تر اور قابلِ اطمینان راستہ ہے نیز عقیدہ اور اخلاق بھی اس سلسلہ میں محرّک کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اسلام کی رو سے ترقی و کمال کے لئے انسانوں کے مابین مہر و محبت اور باہمی تعاون کے جذبات کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس فضیلت کی جانب پکار پکار کر لوگوں کو متوجہ کرتا ہے اور باہمی تعاون و محبت کی بنیاد پر اپنے روابط استوار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

چنانچہ ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ انسانیت کے افق پر اس کے وجود کی شمع اسی وقت روشن ہوتی ہے جب وہ خلوصِ دل اور جذبۂ صادق کے ساتھ لوگوں سے حسنِ سلوک اور محبت و الفت کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ رسولِ مقبولؐ نے فرمایا۔

"للمؤمن علی المؤمن سبعة حقوق واجبة من الله عزوجل علیه الا جلال له فی عینه والود له فی صدره والمواساة له فی ماله وان یحرم غیبته وان یعوده فی مرضه وان یشیع جنازته وان لا یقول بعد موته الا خیراً"

ایک مومن کو سات مواقع پر اپنے دینی بھائی کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

١ -- اس کے سامنے اس کے عزّت و احترام میں دریغ نہ

کرے۔

۲ -- دل کی گہرائیوں سے اسے سچّا دوست رکھے۔

۳ -- اپنے مال سے اس کی مدد کرے۔

۴ -- اس کے پیٹھ پیچھے بُرائی اور غیبت سے پرہیز کرے۔

۵ -- بیماری میں اس کی عیادت کو جائے۔

۶ -- اس کے جنازے میں شرکت کرے۔

۷ -- مرجانے کے بعد اسے صرف اچھائی سے یاد کرے۔(بحار الانوار-ج ۱۵-ص ۶۱)

جب انسان ندائے فطرت سنتا ہے' خوبی وبدی کو درک کرنے لگتا ہے تو اس کی فطرت پر کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔

ایسا ضمیر جو اسارت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو' جس کے ہاتھ پاؤں پر ہوا و ہوس اور جاہ ومقام کی بھاری زنجیریں پڑی ہوئی ہوں اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی حقیقت کا اظہار کرسکے اور درست فیصلے کرسکے۔ اسی طرح اگر شدید بحرانات اور غیر معمولی حالات کی بناء پر ضمیر کو سخت ضربات کا سامنا کرنا پڑے اور اس کی سرگرمیاں تعطل کا شکار ہو جائیں اور اس کے نزدیک بے مفہوم اور لغو اصول اہمیت اختیار کرجائیں تو ضمیر کی یہ حالت انسانیت کے لئے ناقابلِ تلافی نقصانات کا باعث بن جاتی ہے۔

باضمیر اور بے ضمیر انسان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان کے درمیان اختلاف و تضاد کا فاصلہ انسان اور کسی دوسری مخلوق میں پائے جانے والے تفاوت سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ آگ اگر کسی انسانی جسم کے قریب ہو تو

اپنی تاثیر کی وجہ سے اسے جلا ڈالتی ہے اور اسے اپنی بے شعوری کی بناء پر اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے ایک انسان کو تکلیف سے دوچار کردیا ہے۔ اس کے برعکس ایک بے ضمیر انسان' انسان ہونے کے ناطے جانتا بھی ہے کہ وہ کیا کررہا ہے' اس کا عمل کسی کو آزار پہنچانے کا باعث بن سکتا ہے' پھر بھی وہ عمل انجام دیتا ہے اور لوگوں پر ظلم وستم روا رکھتا ہے۔

ایک اور بات جو انسان کی پاک فطرت کو داغدار بنانے کا موجب ہے وہ کسی کا مسلسل ارتکابِ گناہ ہے۔ ایک گناہ گار مجرم بے انتہا دلخراش گناہوں میں مبتلا رہتا ہے پھر بھی اسے کوئی روحانی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ایک طرح کے جنون (Sadism) کا شکار ہو جاتا ہے جو ایک بالکل استثنائی کیفیت ہے۔

جب معاشرہ میں عدالتِ اجتماعی رواج پا جاتی ہے تو انسان اپنے وجود میں ایک اندرونی عامل کو بحیثیت قاضی و ناظر کے قبول کرلیتا ہے اور اس کے فرمان پر سرِتسلیم خم کردیتا ہے۔ اگر سب ہی لوگ انسانیت کی قدرِ مشترک کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متحد اور ایک دوسرے کے ہم خیال ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ باہمی زندگی آسان ہوجائے بلکہ تمام اہلِ معاشرہ جسدِ واحد کی صورت اختیار کرجائیں۔

عقل وضمیر کا سہارا

جب سرکش خواہشاتِ نفس عقل اور ضمیر کے خلاف برسرِپیکار ہوتی ہیں اور انسان کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو اس موقع پر ایمان ہی وہ بہترین سہارا ہے جس کی آغوش میں پناہ لی جاسکتی ہے۔ ایمان

عقل و ضمیر کا سب سے بڑا حامی و پشت پناہ ہے۔ ایمان کی حمایت کے نتیجے میں عقل و ضمیر بد ترین حالات میں بھی خواہشاتِ نفس کے سرکش طوفان کی روک تھام پر قادر ہوتے ہیں اور نہایت شدّت سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے فتح و کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں...... ایسا انسان جو ایمان کے اسلحہ سے لیس ہو اس نے قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق "ایک ایسی مضبوط رسی کو تھام لیا ہے جو کبھی کمزور پڑ کر ٹوٹنے والی نہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

عقلِ نظری یا حکمتِ نظری جو فلسفۂ الٰہی، علومِ طبیعی و ریاضی کی بنیاد ہے، اس کا کام حقائق کے بارے میں فیصلہ دینا ہے۔ جب کہ عقلِ عملی یا حکمتِ عملی کا کام انسان کے وظائف اور اس کی ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے۔ انسان زندگی میں کس راہ و روش کا انتخاب کرتا ہے اس کا انحصار اس کی حکمتِ عملی کے فیصلے پر ہے۔

بصیرت و دانائی کے سلسلے میں ایک موثر عامل تقویٰ ہے۔ تقویٰ عقل کو روشن کرتا ہے اور انسان کے سامنے حکمت کے دریچے کھول دیتا ہے۔ اس حکمت کا تعلق حکمتِ نظری سے نہیں بلکہ حکمتِ عملی سے ہے۔

تقویٰ ہی کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے لئے صحیح راہ کا تعیّن کرتا ہے اور اپنی بیماری کی تشخیص اور اس کا علاج دریافت کرتا ہے۔ ہمیشہ انسان کی عقلِ عملی (حکمتِ عملی) کا واسطہ نفسانی خواہشات، شہوات اور جذبات و احساسات سے پڑتا ہے۔ اسی لئے ہوس کی طغیانیاں عقل اور انسان کے طرزِ تفکر پر (جو اس کے لئے اچھے برُے مفاہیم اور اس کی ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے) لازماً اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ سرکش خواہشات انسان کی عقل کے سامنے دھُندسی پیدا

کردیتی ہیں جو اس کی روشنی پھیلنے میں مانع کا کام کرتی ہے۔ بقول حافظ شیرازی:

جمال یار ندارد نقاب و پردہ ولی
غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

(جمالِ یار پر نقاب نہیں پڑی ہوئی۔ بلکہ راستے کی گرد و غبار پردے کا کام کررہی ہے۔ پہلے یہ غبار بٹھادو تاکہ تم اس کا نظارہ کرسکو)

اسلامی روایات میں ہوا و ہوس کو اسی بناء پر عقل کا دشمن کہا گیا ہے کہ نفسانی خواہشات کی طاقت عقل کی صلاحیتوں اور تاثیر کو کمزور کردیتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم فرماتے ہیں کہ:

"اعدی عدوک نفسک التی بین جنبیک"

"تمہارے خطرناک ترین دشمن نفسِ امارہ اور سرکش احساسات ہیں جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان موجود ہیں۔"

(نہج الفصاحہ۔ ص ۶۶)

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الھوی عدو العقل"

"ہوا و ہوس عقل کے دشمن ہیں۔"

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع"

"اکثر ان ہی مواقع پر عقل شکست کھاتی ہے جب نفسانی خواہشات کی بجلی کوندتی ہے۔" (غرر الحکم۔ ص ۱۹۵)

تقویٰ ہوا و ہوس کو زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور انہیں رام کرلیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں عقل آزادی کے ساتھ اپنے افعال انجام دینے کے قابل ہوجاتی ہے اور یہیں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روشن خیالی اور عقل و بصیرت کی افزائش کے سلسلے میں تقویٰ کیونکر اپنا اثر دکھاتا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باایمان افراد کی صفات کی وضاحت کے ضمن میں ان کی مندرجہ ذیل خصوصیات کو ان کا امتیاز قرار دیتے ہیں:

"لا یحیف علی من یبغض ولا یأثم فی من یحب، لا یجور ولا یتعدیٰ لا یقبل الباطل من صدیقه ولا یرد الحق علی عدوه"

"کسی سے بغض و عداوت کی بناء پر عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، ظلم و ستم کی راہ اختیار نہیں کرتا۔ دوستانہ تعلق کی بناء پر خود کو گناہ آلود نہیں کرتا، سرکش اور ستمگر نہیں ہوتا، اپنے دوست کی غلط باتوں کی تائید نہیں کرتا اور دشمن کو محض بغض کی وجہ سے اس کے جائز حق سے محروم نہیں کرتا۔"

(بحار الانوار - ج ۱۵ - ص ۸۲)

انسان کے اختیار میں عقل و ضمیر کی صورت میں دو گراں بہا سرمائے دیئے گئے ہیں اور وہ ان کے استعمال کے سلسلے میں مکمل طور پر آزاد بھی ہے۔ اس آزادی کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان اپنے بعض فطری تمایلات کو دبائے اور اپنے وجود کے ایک حصّے یعنی اپنی طبیعت کو وجود کے ایک اور جزُ یعنی عقل و ضمیر کے ماتحت کرے۔

جہاں عقل و ضمیر اور سرکش نفسانی خواہشات کے مابین تصادم پیش نہیں آتا وہاں عقل و ضمیر کی مکمل حکمرانی قائم ہوتی ہے اور ان کی صدا پر باآسانی لبیک کہنا ممکن ہے۔ نیز ان دونوں کی قوّت حتیٰ خارجی طاقتوں سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ عقل و ضمیر کے احکامات کے بارے میں انسان یہ تصور کرتا ہے کہ یہ وہی احکامات ہیں جو خود اس کی ذات صادر کرتی ہے۔ لہٰذا وہ خود اپنے خلاف بغاوت نہیں کرسکتا اور ان احکامات کے سامنے سرِاطاعت خم کردیتا ہے۔

لیکن مسئلہ اس وقت جنم لیتا ہے جب عقل و ضمیر کی پیروی کی بناء پر کسی خواہشِ نفس کی سرکوبی یا اس سے بے اعتنائی ضروری ہوجائے۔ ایسے مواقع پر اکثر عقل و ضمیر غرائز و خواہشات کی سرکش قوتوں کے سامنے شکست کھاجاتے ہیں اور ناچار انہیں پسپا ہونا پڑتا ہے۔ اور یوں میدان شہوانی قوتوں کے ہاتھ رہتا ہے۔

انسان ہمیشہ ہوائے نفس کے خطرہ سے دوچار رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقی خدا پرست لوگ جن کے قلوب ایمانِ راسخ سے معمور ہوں اور جو مذہبی پہلو پر خاص توجہ مرکوز رکھتے ہوں، وہ ایمان کے بل بوتے پر تخریبی قوتوں کو زیر کرلیتے ہیں اور زندگی کی راہ میں ہمیشہ ناجائز تمایلات کی دعوت اور اپنی ناروا خواہشات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

بے بنیاد دلیلیں

عقل و ضمیر کے فرمان کو قبول کرنا اور عدل و انصاف کے تقاضوں کی اتباع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ان اخلاقی، مذہبی اور

عملی ذمہ داریوں کے مقابل کہ جن کی حقیقت بھی ان پر مکمل طور سے عیاں ہو چکی ہوتی ہے سرِ تسلیم خم کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ اور جہاں انہیں اپنے بعض مفادات سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور کچھ ناگوار باتوں کو قبول کرتے ہوئے ضمیر کی صدا اور عقل کے فیصلے پر لبیک کہنا چاہئے وہاں اس کے برخلاف عمل کرتے ہیں اور یوں وہ حقیقی ایمان اور اخلاقی جرات کے فقدان کے نتیجے میں زندگی میں ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں جو انہیں ضمیر کی صدا کو دبانے پر اکساتی ہے۔ اس طرح وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے نجات کے لئے بے معنی تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص اس نامناسب طریقے کو بار بار اختیار کرتا ہے اور اس کی عقل کی فعالیت کم اور سست ہونے لگتی ہے تو وہ صحیح منطق کے مقابل بے دلیل تاویلات کا عادی بن جاتا ہے اور پھر اس کی یہ منفی عادت ایک مزید پختہ صفت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایک اور گروہ اپنی ذمہ داریوں سے فرار اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے کے بجائے دوسروں کو ان کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور گوناگوں مسائل اور زندگی کے نازک و حساس مراحل میں بہانہ تراشیوں کے ذریعہ خود کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس گروہ کے اس طرزِ عمل کا سبب سہل انگاری یا مسئلہ کے باریک نکات سے بے توجہی نہیں ہوتی۔

عملاً وہ تمام گمراہ اور منحرف افراد جن کے اعمال کی قباحت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی اپنے افعال کی توجیہ اور اپنے انسانیت سوز اعمال کو جائز قرار دینے کے لئے لغو استدلال اور منفی عوامل کا سہارا لیتے ہیں۔

ڈیل کارنیگی لکھتا ہے :

"میرے پاس سینگ سینگ نامی جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا ایک بہت دلچسپ خط موجود ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے کہ جیل میں قید مجرموں میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جو خود کو خطاکار اور مجرم سمجھتے ہوں۔ یہ لوگ خود کو عام افراد ہی کی مانند بے گناہ خیال کرتے ہیں۔ اپنے اعمال کے جواز کے بارے میں استدلال پیش کرتے ہیں' ان کے اسباب و محرّکات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ بتاتے ہیں کہ کس وجہ سے انہوں نے فلاں شخص کو قتل کیا اور کس مجبوری کی بناء پر چوری کی۔

اکثر مجرم کوشش کرتے ہیں کہ معاشرہ کے خلاف جن جرائم کے وہ مرتکب ہوئے ہیں انہیں جائز ثابت کریں۔ حتیٰ اپنے جرائم انہیں نیک کام نظر آتے ہیں اور وہ برملا کہتے ہیں کہ ان کو دی جانے والی سزا عدل و انصاف کے برخلاف ہے۔

یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے یا کال کوٹھریوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں سے ہم روز ملتے جلتے ہیں' ذرا ان سے پوچھئے کہ اپنے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟" (آئینِ دوست یابی۔ ص ۱۷)

ابتداء میں ہر اس شخص کو جو ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرتا ہے اور اخلاقی انحرافات کا شکار اور گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اپنا یہ رویہ تکلیف پہنچاتا ہے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ ان اعمال کے مسلسل اور مستقل ارتکاب کی بناء پر اس کا یہ احساس مردہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ضمیر کی سرزنش بھی بے اثر ہو جاتی

ہے۔

قرآنِ کریم ایسے سیہ بختوں کو حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ اور پست متعارف کراتا ہے جو مسلسل گناہوں اور اپنے ذاتی فوائد کے حصول کی فکر کے نتیجے میں بیدار عقل اور حساس ضمیر کو کھو بیٹھے ہیں اور ایسے خوابِ گراں میں پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں حق و باطل میں تمیز کے لئے صحیح تفکر و تعقل پر ابھارنے والا ہر عامل بے اثر ہو چکا ہے۔

"لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا اولیک کالانعام بل ھم اضل اولیک ھم الغافلون"

"ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ اصل میں غافل ہیں۔"

(سورۂ اعراف ۷ - آیت ۱۷۹)

تیسرا باب

شخصیت کا ارتقاء و نشوونما

انسان کی قدر و قیمت کا پیمانہ

وہ چیز جو انسانوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور جس کے ذریعہ ہر فرد کی ذاتی قدر و قیمت اور اس کے حقیقی مقام سے واقف ہوا جاسکتا ہے وہ "شخصیت" ہے۔

اس کے باوجود کہ لوگ ردِّعمل کے اظہار اور بعض صفات میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہر فرد فطری اور تربیتی خصوصیات کے لحاظ سے ایک خاص حالت اور بعض مخصوص صفات کا حامل ہے۔ اور وہ ان صفات کی بناء پر دوسروں سے ممتاز قرار پاتا ہے اور یہ اس کی پہچان بن جاتی ہیں۔

شخصیت پر بحث، کسی خاص فرد کی خصوصیات پر بحث کا نام نہیں۔ بلکہ جو چیز شخصیت کے مفہوم سے مربوط ہے وہ مکمل فرد ہے اور اس مفہوم میں ایک فرد سے دوسرے فرد کا تمایز پوشیدہ ہے۔

مختلف صفات اور پوشیدہ محرّکات کے یکجا ہونے کا نتیجہ ایک شخصیت ہے۔ ضمناً وہ صفات شخصیت کا جزء شمار کی جاتی ہیں جو پائیدار ہوں۔

اگرچہ وہ اصول و کلیّات جو شخصیت کے رشد و تکامل پر اثر انداز ہوتے

ہیں کم و بیش سب ہی میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کلیّات کو دو مختلف افراد پر استعمال کیا جاتا ہے تو یکساں نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ اور جب ان شخصیات کا باہم موازنہ کیا جاتا ہے تو دونوں کے درمیان واضح فرق نظر آتا ہے۔

البتہ مختلف ٹیسٹوں اور دوسرے وسائل سے شخصیت کے محسوس پہلوؤں کے بارے میں اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے اور انہیں ماپا جاسکتا ہے۔ لیکن گہرے اندرونی محرّکات کو آسانی کے ساتھ ماپنا ممکن نہیں اور نہ ہی ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شخصیت کی عمارت میں بعض صفات بعض دوسری صفات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ صفات جو اخلاقی اعتبار سے خوبی یا بدی سے متصف کی جاتی ہیں شخصیت کے موضوع میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ درحقیقت انسان کی طینت و سرشت اس کی وہی شخصیت ہے جس پر اخلاقی نکتہ نظر سے توجہ دی جاتی ہے۔

شخصیت کے اثرات، اس کا معیار اور وہ اوصاف و امتیازات جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں اور جو اس کی سرشت کا حصّہ بن چکے ہوتے ہیں دوسرے امور سے کہیں زیادہ اس کی سعادت یا بدبختی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسان کی خوش بختی یا شقاوت کا دار و مدار خارجی اسباب پر نہیں بلکہ اس کے تفکّر و تعقّل کے پیمانے، نفسیاتی خصوصیات اور اندرونی محرّکات پر ہے۔ عہدہ و مقام کسی کی سعادت مندی پر لازماً اثر انداز نہیں ہوتے۔

ہر فرد کی روحانی خصوصیات کی بنیاد اور شخصیت کا اُٹھان مختلف اشیاء سے اس کے لگاؤ و رغبت سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ انسان قدرتی طور پر ان

ہی چیزوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے جن سے اُسے علاقہ ہو۔ اور اپنے اعمال و رفتار کو ان ہی اقدار کے مطابق مرتب کرتا ہے جو اس کی نظر میں بلند ہوں۔

مختلف لوگوں کی اقدار میں پایا جانے والا فرق ان کے طرزِ تفکّر اور ان کی نفسیات کی شناخت کا ذریعہ ہے۔ اور اسی ذریعہ سے ہم ہر شخص کی واقعی قدر وقیمت جان سکتے ہیں اور اسی معیار پر اس کی شخصیت کا پیمانہ مقرر کرسکتے ہیں۔

جو لوگ اپنی خوش قسمتی کو مادّی اقدار اور ان کی کمیت وکیفیت پر منحصر سمجھتے ہیں اور مادّی ہدف تک رسائی کے لئے پیہم مصروفِ عمل رہتے ہیں وہ زندگی کی حقیقی اقدار کو جو ان کی واقعی سعادت کی بنیادوں میں شمار ہوتی ہیں قدموں تلے روند ڈالتے ہیں، اپنی انسانی شخصیت کو کچل ڈالتے ہیں۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو مادّی اقدار کے حصول کے لئے اپنی تمام زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنا تھوڑا سا وقت اس خزانہ سے استفادے پر صرف کریں جو ایک صحت مند روح کی صورت میں ان کے وجود کا حصّہ ہے۔

انسانی شخصیت کس حد تک معاشرتی نفسیات سے متاثر ہوتی ہے، دانشور اس بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔

بعض دانشور شخصیت کی تشکیل میں موروثی اور جسمانی عوامل کے اثرات کے قائل ہیں۔ اور بعض شخصیت کو کُلّی طور پر معاشرہ کی عکاس قرار دیتے ہیں جبکہ حقیقت ان دونوں احتمالات کے درمیان واقع ہے۔

خاندان، مدرسہ اور معاشرتی ماحول یہ تینوں طاقتور عوامل شخصیت کی تعمیر اور اس کی عادات وصفات بنانے میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح قدیم

ماہرینِ نفسیات کے برخلاف آج کل کی جدید نفسیات میں شخصیت کے مجہول عامل کو بھی بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ مجہول عوامل جو فردیت کے بنیادی عنصر ہیں اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ دوسرے عوامل کے کردار کو یکسر تبدیل کرکے رکھ دیتے ہیں اور انسان توقع کے بالکل برخلاف بن جاتا ہے۔

بے شک شخصیت کی تشکیل میں اجتماعی عوامل براہِ راست اور نمایاں اہمیت کے حامل ہیں اور انسان میں پائی جانے والی اکثر چیزیں وہ ہوتی ہیں جو وہ اپنے معاشرہ سے حاصل کرتا ہے۔ ایسے لوگ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے جو بہاؤ کے مخالف تیریں اور معاشرہ وماحول کی قوت اور نفوذ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

"مان" اپنی کتاب اصولِ نفسیات میں لکھتا ہے کہ:

"انسانی شخصیت پر ماحول کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی اسکیمو (ESKIMO) قبائل میں جنم لیتا تو بالکل مختلف شخصیت کا مالک ہوتا۔ اور یہ فرق نہ صرف لباس کی تراش خراش، طرزِ رہائش، گفتگو اور غذا وغیرہ میں نمایاں ہوتا بلکہ کائنات اور اس میں اپنے مقام وکردار کے بارے میں بھی ہمارے تمام تصوّرات یکسر مختلف ہوتے۔

انسان شناسی (ANTHROPOLOGY) کے ماہرین شخصیت کی تعمیر میں ثقافتی وسماجی عوامل کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ثقافت و معاشرت کی تبدیلی شخصیت کو یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔

انسان اپنے ملک کے کس حصّہ کا رہنے والا ہے، کس گھرانے میں پلا بڑھا ہے، اس کے ماں، باپ یا اجداد کا اس سے کیا سلوک تھا۔ اس نے

کونسے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ کس طبقہ کے بچّوں کی صحبت میں رہا ہے۔ اس نے کیا دیکھا ہے' کیا سنا ہے۔ یہ تمام چیزیں شخصیت پر لازماً اثر ڈالتی ہیں۔

بچّے پر اجتماعی عوامل کے اثرات پیدا ہوتے ہی پڑنا شروع ہو جاتے ہیں اور جب تک وہ حیات ہے جاری و ساری رہتے ہیں۔"

(اصولِ نفسیات - ص ۱۵۶،۱۵۷)

بہت سی ایسی فطری سرگرمیاں ہیں جو بطورِ کُلّی مقتضیات اور ماحول کی شرائط کی بنیاد پر پرورش پاسکتی ہیں۔ ان سرگرمیوں کے تخلیقی پہلو کو پروان چڑھانے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ان شرائط و حالات کی اصلاح کی جائے جو ان سرگرمیوں کی تحریک یا تضعیف پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ نیز عادات کی پرورش یا ان میں نفوذ کے اعتبار سے انسان کے ہر عمل کا اچھی طرح تجزیہ و تحلیل کیا جانا چاہئے اور جاننا چاہئے کہ کس طرح بعض تمایلات کی تشویق کی جاسکتی ہے اور کس طرح بعض دوسری تمایلات کے پھیلاؤ اور تقویت پانے کی روک تھام کرسکتے ہیں۔

کمال کی بنیاد قائم کرنے اور ایک مطلوب معاشرہ کی داغ بیل ڈالنے کے لئے کسی انسان کے بچپن کا زمانہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ان ابتدائی برسوں میں ہر طرح کے اثرات قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اسی دور میں والدین اور سرپرستوں کے ذریعہ تربیت بچّے کی صحیح خطوط پر نشوونما کے سلسلے میں لازمی و حتمی اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور اس کی اندرونی صلاحیتوں کے پھلنے پھُولنے اور شخصیت کے تکامل کا موجب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس غلط

اور بے بنیاد روش بچّے کی شخصیت کو مسخ کرنے اور اس کی اندرونی صلاحیتوں کی سرکوبی کا باعث بن جاتی ہے۔

نوخیز پودے کو جس طرف چاہیں آسانی سے موڑ سکتے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ عمل اس کے ابتدائی ایام ہی میں انجام پائے۔ اس طرح بچپن ہی میں ہر کسی کی شخصیت کا تعیّن کیا جاسکتا ہے اور مثبت حالات و شرائط فراہم کر کے اس کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔

لہٰذا مستقبل میں انسان ناسازگار حالات اور پیش آنے والے حادثات پر کس ردِعمل کا اظہار کرے گا اس کی قبل از وقت تصویر کشی اس کی پرورش کا ماحول دیکھ کر کی جاسکتی ہے۔

زندگی کے میدان میں کسی فرد یا معاشرہ کی عدم پیشرفت یا رکود کے اسباب خود اس کی شخصیت میں تلاش کرنے چاہئیں۔ عصرِ حاضر میں ماہرین شخصیت کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے نہایت گہرائی میں جاکر جائزہ لیتے ہیں۔ کسی انسان کا تدبّر و زیرکی بحرانوں اور مشکل حالات سے نمٹنے کے اس کے انداز و اطوار سے ظاہر ہوجاتی ہے۔

جو لوگ اقدامات اور سرگرمیوں کے دوران اپنے اندرونی جذبات کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں ان کے اعتماد و بھروسے میں اضافہ ہوتا ہے اور اپنی شخصیت پر اعتماد قائم ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں جن کی نظریں زیادہ تر خارج پر رہتی ہیں۔ اور صرف خارج ہی پر نظر رکھنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان خود اپنا جائزہ نہیں لے پاتا۔

غور و تامل عقل و بصیرت میں اضافے کا بہترین محرّک اور شخصیت کی قدر

وقیمت بلند کرنے کا موثر عامل ہے۔ غور و فکر انسان کو کمال و فضیلت سے آراستہ کرتا ہے۔

جس وقت سطحی افراد اپنی بے ہودہ نفسانی خواہشات کے حصول کے درپے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مختلف ذرائع سے اپنی خواہشات کی تسکین کریں۔ اس وقت بلند ہمت افراد اپنی عقل پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے معنوی لذّتوں سے استفادے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔

بنابراین جو لوگ قوتِ تفکّر اور عقلِ فعال کے مالک ہیں اور ہر موقع پر اپنے اعلیٰ وارجمند افکار کو کام میں لاتے ہیں وہ اس کائنات میں حقیقی خوش بختی سے نزدیک تر ہیں۔

"شاپنھاور" لکھتا ہے کہ :

"ٹھنڈی طبیعت، خوش بینی اور قدرت وتوانائی انسان کی خوش بختی و سعادت مندی میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک عاقل شخص گوشہ نشینی اور تنہائی میں بھی اپنے افکار و خیالات کی مدد سے خوش گوار و شیریں لمحات فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک جاہل نت نئی تفریحی سرگرمیوں کے باوجود اور کثیر سرمایہ صرف کرنے کے بعد بھی جسم و روح کو آزار پہنچانے والے رنج سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔

خوش بین اور بردبار شخص تنگدستی میں بھی زندگی کو صبر و قناعت سے بسر کرسکتا ہے جبکہ حریص و بد فطرت فرد کے ہاتھوں میں خواہ دونوں جہان کی دولت آجائے تب بھی وہ ملول و رنجور رہے گا۔

توانا فکر اور عقلِ سلیم کا مالک شخص ان ظاہری اور ناپائیدار لذّتوں سے جن کے حصول کے لئے لوگ جان دینے پر آمادہ رہتے ہیں احتراز کرتا ہے۔

ایسے ہی ایک روشن فکر (سقراط) نے نمائش کے لئے رکھی گئی آرائشی اشیاء کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ :

"اس دنیا میں کتنی ہی ایسی اشیاء ہیں جن کی آدمی کو ضرورت نہیں۔"

لہٰذا انسانی سعادت میں موثر ترین عامل "شخصیت" ہے۔"

(افکارِ شوپنھاور – ص۵۶)

یہ خیال درست نہیں کہ شخصیت کا ایک ہی پہلو ہوتا ہے اور اسی کو معیار و امتیاز قرار دینا چاہئے۔ یہ غلط تصوّر ناکامیوں کا سبب بنتا ہے اور انسان کو حقائق سے دور کردیتا ہے۔

بہت سے لوگ جو کسی نقص کا شکار ہوتے ہیں اپنی شخصیت کے ان دوسرے پہلوؤں سے غافل ہوتے ہیں جو ان کے ان نقائص کا ازالہ کررہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ایک خامی کو اپنی پوری شخصیت کے نقص کے مساوی سمجھنے لگتے ہیں اور یہی بے بنیاد احساس انہیں جانکاہ غم و اندوہ سے دوچار رکھتا ہے اور اسی حال میں وہ کوئی ایسی حرکت کربیٹھتے ہیں جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

بکثرت تاریخی انقلابات اور بزدلانہ خوں ریزیاں اسی ضرر رساں تعصب کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ لوگ اپنی شخصیت کے محض ایک پہلو کو معیار قرار دیتے ہیں

اور یہی بے جا تفاخر طولِ تاریخ میں رونما ہونے والے بکثرت افسوسناک حوادث کا سبب بنا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ملتے ہیں کہ بعض معاملات میں تو قابلِ رشک استعداد کے مالک ہوتے ہیں لیکن کچھ کام ان کے بس میں نہیں ہوتے اور وہ ان کی انجام دہی پر قادر نہیں ہوتے۔

بعض لوگ ان نفسیاتی نقائص کو بدقسمتی پر محول کر کے چاہتے ہیں کہ اس طرح اپنی ناتوانی کو دوسرے عوامل کا نتیجہ قرار دیں۔ اور ضعف و ناتوانی کے بارِگراں کو ہمیشہ اپنے کاندھے پر لئے پھرتے ہیں۔ جبکہ وہ قوتِ ارادی اور معمولی سی محنت کے ذریعہ اپنے اس نقص میں کمی کر کے اپنی استعداد و صلاحیت میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

اپنی ناکامی کو حق بجانب سمجھنا اور اس زیاں بخش فکر کو اپنے ذہن پر مسلط کرلینا، دراصل اپنی ناکامی کی راہ خود ہموار کرنے کے مترادف ہے۔ کامیابی میں عزمِ صمیم براہِ راست اثر رکھتا ہے کیونکہ انسانی ذات کی پرورش کے امکانات لامحدود اور اس کے نتائج غیر معمولی ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ انسان خود کیا بننا چاہتا ہے۔

یہ حقیقت اس وقت کاملاً آشکارا ہو جاتی ہے جب انسان اپنے ذہن میں آنے والی زندگی کی مختلف راہوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا ارادہ کرلیتا ہے۔

غرائز کے درمیان ٹکراؤ اور کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ایک خواہش ایک طرف جانے پر ابھارتی ہے تو دوسری اس کی مخالف سمت ہنکاتی ہے۔ غور

و فکر ان میں سے مناسب راہ اختیار کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان کامیابیوں کی کیفیت کو واضح کریں جو ان غرائز سے حاصل ہوتی ہیں۔

توجہ رہے کہ انسانی کردار و رفتار اور اس کی سرگرمیوں کے پیچھے ایک بنی سنوری شخصیت موجود نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اعمال و رفتار تدریجاً ایک دوسرے سے مفاہمت کرنے والی ناپائیدار عادات و اطوار سے مل کر وجود میں آتے ہیں۔

ہر بار جب ہم کسی ذہنی کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں تو انسانی ذہن ان مختلف و متنوع عوامل کے مابین توازن و اعتدال قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خود کو اس کشمکش کے نقصانات سے نجات دلاتا ہے تاکہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ اور ایک وقت وہ آتا ہے جب اس ہدف تک رسائی کے لئے گوناگوں تمایلات کے درمیان سمجھوتا وجود میں آجاتا ہے اور وقتی طور پر انسان کو سکون و راحت ملتا ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے بدن میں معمولی خلل واقع ہونے کی صورت میں جسم اپنے مختلف اندرونی ردِّعملوں کے ذریعہ اس کا علاج کرلیتا ہے۔ ذہن بھی پیچیدہ مسائل اور واضح خطرات کی روک تھام کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

ایک منتشر اور پریشان ذہن کو سکون بخشنے کے لئے بعض راہیں تو قابلِ اطمینان اور معقول ہیں اور بعض زیاں بار اور نامعقول۔

نفسیات داں اس بارے میں کچھ یوں تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔

"خطرات کی روک تھام کا ایک موثر ذریعہ یہ ہے کہ نہایت صراحت

اور بے باکی کے ساتھ ذہنی کشمکش اور اس کے نتائج و آثار کا سامنا کیا جائے اور شدید مقابلہ کے ذریعہ ان میں سے بعض پیچیدگیوں کو کم کیا جائے اور ان کے درمیان ایسی سازگاری قائم کی جائے کہ بغیر کوئی مشکل پیدا کئے یہ ضمیر کا حصّہ بن جائیں۔

لیکن شاید ہم اس ذہنی کشمکش سے نجات کی کوئی آئیڈیل راہ تلاش کرنے سے عاجز ہیں۔ اور باز گشت' دروں گرائی' بروں گرائی اور خود فریبی جیسے وسائل سے استفادہ پر مجبور ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے ذہن میں ہونے والی کشمکش کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یا وہ اس جانب متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اس کے اخلاق و رفتار ایک خاص روپ دھار لیتے ہیں جو اس کی حقیقی شخصیت سے کسی طور سازگار نہیں ہوتے۔ یہ انسان خود بھی اس ناسازگاری سے آگاہ نہیں ہوپاتا اور جب اسے ہوش آتا ہے تو خود کو ایک دوراہے پر پاتا ہے اور یہ چیز انسان کو دوسروں کی نظر میں دورخہ اور عجیب وغریب بنادیتی ہے۔

انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے افکار' منصوبے اور خواہشات ہمیشہ متضاد وناپائیدار ہوتے ہیں۔

بعض لوگ دومتضاد شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور پوشیدہ طور پر ایسے کام کرتے ہیں جو ناقابلِ یقین نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں وہ سیاستدان بھی شامل ہیں جو مزدوروں کے حقوق کی دُہائی دیتے ہیں لیکن محض اس بناء پر کہ اب ان کی مراد پوری ہو چکی ہے ایسے ایسے

کام کر گزرتے ہیں کہ جن کے نتیجہ میں مزدوروں کی زندگی پہلے سے ہزار درجے مشکل ہو جاتی ہے۔

یہی لوگ ان میں سے ہیں جو دوطرح سے سوچتے ہیں اور دو متضاد شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔" (روانشناسی برای ہمہ۔ ص ۲۰۹)

انسان کی تربیت میں روحانی عامل کی اہمیت

دنیا کے تمام فلسفی وفکری مکاتبِ فکر کے نزدیک معاشرہ کے قیام اور اس کی استواری کے سلسلہ میں "تربیت" ایک اہم ترین عامل ہے۔

انسانیت کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں تربیت کے بنیادی کردار کا کوئی منکر نہیں۔ لیکن جو چیز لائقِ اہمیت ہے وہ تربیت کا حقیقی مفہوم اور اس کے وہ اصول وضوابط ہیں جو کسی فرد کی معنوی شخصیت جانچنے کے پیمانے کے بطور پہچانے جاتے ہیں اور جن کے اجراء کے ذریعہ آزادی و سعادت کی جانب انسانیت کی رہنمائی کی جاسکتی ہے۔

انسان دو عناصر "روح" اور "جسم" کا مرکب ہے۔ تربیت کے عنوان سے ہمیں ایسے عامل کی ضرورت ہے جو جسمانی اور روحانی تمایلات کو ہم آہنگ کر سکے۔

تربیت کے دو عامل یعنی دینی عامل اور انسانی ذہن کے ساختہ عامل کے موازنہ کے بعد ہم بخوبی مذہبی عامل کی اوّلیت اور اصالت کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ مذہبی عامل کا فطری ہونا مسلّمہ ہے۔ اگر فطری تمایلات کی راہ میں خارجی عوامل مانع و رکاوٹ نہ ہوں تو دینی عامل اوّلین بار ہی قلب و ضمیر کو روشن کردیتا ہے

اور شخصیت کی خود اس کی فطری تمایلات کے مطابق تعمیر کرتا ہے۔ اس پوشیدہ قوت (ضمیر) کے بارے میں انسان کا ادراک جس قدر قوی ہوگا وہ اتنا ہی اسے اپنے اوامر کی اطاعت پر زیادہ سے زیادہ آمادہ کرے گا۔

انسانی نفوس کی تربیت کے بارے میں فلسفیوں کی مختلف آراء و نظریات ہیں۔ ان افکار و نظریات کو یکجا کر کے کوئی ایک اصول بنانا ممکن نہیں اور اگر بالفرض کوئی اصول بنا بھی لیا جائے تب بھی وہ عام لوگوں کے لئے کار آمد نہ ہو گا کیونکہ عامتہ الناس فلسفیانہ مسائل کے ادراک سے عاجز ہیں۔

اخلاق خود انسان کے اندر سے پھوٹنا چاہئے تاکہ انسان کی فطری تمایلات کا جواب دے سکے۔ وگرنہ فلسفیوں کے بنائے ہوئے اخلاقی دستور انسان کے ساختہ ہونے کی بناء پر انسان کی پوشیدہ حقیقت تک پہنچنے پر قادر نہیں اور انسانی سعادت کے لئے ناکافی ہیں۔ بنا بریں لوگ فلسفیوں کے مسلط کردہ سطحی وظاہری اخلاق کو ایک بوجھ کی صورت اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں گے، لہٰذا اپنی جستجو کے ذریعہ منزلِ مطلوب تک رسائی کے لئے انسان کے اندر سے پھوٹنے والے دینی عامل کو برتری حاصل ہونی چاہئے۔ یہی عامل وہ جاویداں حقیقت ہے جس کا مرکز انسانی فطرت ہے اور انسانی تربیت کے سلسلہ میں پیش کئے جانے والے تمام افکار و آراء میں سے اسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی برتری کا انسان مادّہ پرستی میں گرفتار ہونے سے قبل معترف تھا اور شدّت سے اس کا پابند تھا۔ پاکیزہ روح کی حامل ہستیاں اس کے اوامر و فرامین کی اطاعت و پیروی سے لذّت حاصل کرتی ہیں اور ان کی شیفتہ و فریفتہ ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ وہی رسالت و وحی کی راہ ہے جو انسانی فطرت کو اس کے اصل راستے پر گامزن کرتی ہے اور انسانی ذات کے تمام پہلوؤں کی تسکین کرتی ہے۔ اور اس کا مقصد جز اس کے کچھ نہیں کہ فطرت کو نظم و ضبط عطا کیا جائے۔ اور اس کی سعادت سوا اس کے کوئی نہیں کہ سعادتِ جاویدانی حاصل کی جائے۔ اگر تربیت کے لئے ابتداء ہی سے اس عامل کو اپنایا جائے تو کوئی انحراف رونما نہ ہو اور لوگ اس کے زیرِ سایہ رشد و تکامل کی راہ پر بڑھتے نظر آئیں۔

آج کی مشینی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ باوجود یہ کہ انسان نے علم کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے، فطرت سے آشنائی کے ذریعہ اور مادّی دشواریوں کو حل کر کے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن صد افسوس کہ اپنی شناخت کے بارے میں وہ انحطاط کا شکار ہوا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کی پرورش کا گہوارہ یہ کائنات، ویرانی و بدبختی سے نجات حاصل نہ کر سکی بلکہ علم و دانش نے بھی انسانی زندگی پر کاری ضربات لگائیں اور تخریب کا کام کیا اور روحِ بشر کو جاہلیت کے قعرِ ذلت کا اسیر کر دیا۔

مغربی تمدّن نے صنعتی ہونے کے لئے انسان کو وسیلہ قرار دیا اور وسیلہ کو ہدف بنا ڈالا۔ اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں لائی جو فردی یا طبقاتی آویزش کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور بلا تردید معاشرہ کی یہ دونوں انواع انسانیت کے لئے مناسب و شائستہ نہیں اور انسان اس وقت تک انسان نہیں ہو سکتا جب تک اپنے اور اپنے تمدّن کے درمیان موجود تناقض کو حل نہ کرے۔

"آرِش فرام" لکھتا ہے کہ :

"روابط کی موجودہ نوعیت انسان اور انسان کے مابین روابط نہیں یہ اشیاء سے اشیاء کا رابطہ ہے۔ اس صورتحال کی مخرّب ترین صورت یہ ظاہر ہو رہی ہے کہ انسان نے دوسروں کو آلات و وسائل سمجھنا شروع کر دیا ہے اور انسان کا خود اپنے آپ سے بیگانہ ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔

انسان فقط مالِ تجارت نہیں فروخت کرتا' بلکہ خود کو بھی فروخت کر رہا ہے اور خود کو مالِ تجارت سمجھ رہا ہے۔ جو اپنے زورِ بازو سے روزی کماتا ہے وہ اپنی جسمانی قوت اور جو تجارت' طب اور دفتری کارکن کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہے وہ اپنی خدمات یا تیار کی ہوئی اشیاء کی فروخت کے لئے اپنی "شخصیت" کو بیچتا ہے۔ آخر الذکر افراد کے لئے ناگزیر ہے کہ اپنی شخصیت میں اضافہ کریں اور انرجی' تخلیق یا اسی طرح کی دوسری صفات کو اپنے اندر پیدا کریں جو ان کے پیشے سے مناسب ہوں۔

جو چیز ان صفات کی قدروقیمت اور حتیٰ ضرورت تک کا تعیّن کرتی ہے وہ مارکیٹ ہے۔ اگر انسان میں ایسی صفات پائی جائیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تو کہیں گے کہ اس شخص کی کوئی مارکیٹ ویلیو ہی نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ناقابلِ فروخت مال کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ بے قیمت ہے ہرچند کہ اس کا کام میں لایا جانا ممکن ہو۔ شخصیت کی قیمت بھی بازار میں اس کی مقبولیت' پسندیدگی اور کامیابی کے تناسب سے معین کی جاتی ہے۔" (گریز از آزادی۔ ص۱۶۹)

اسلامی نظام میں شخصیت کی نشوونما

ہر موجود اپنی ایک مخصوص شخصیت رکھتا ہے۔ کسی بھی چیز کا تصوّر اس کی شخصیت مجسم کئے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا کسی موجود سے احکام و شرائط کا تعلق اسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ تشخص کا مالک ہو۔ علاوہ ازیں ہر چیز کا ظاہری یا معنوی کمال اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ حسی یا معنوی شخصیت کی مالک ہو۔

انسانوں کی حسی شخصیت واضح و آشکارا ہوتی ہے لیکن ان کی معنوی شخصیت ان انسانی آثار و روحانی کمالات کی تابع ہوتی ہے جو ان کی محسوس شخصیت کے احاطے میں محصور نہیں ہوتے۔ جس طرح یہ حقیقت انفرادی طور پر انسانوں پر منطبق ہوتی ہے اسی طرح ان مختلف اقوام و ملل پر بھی صادق آتی ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ زمین کے مختلف خطوں میں بستی ہیں۔ مختلف معاشروں کی معنوی شخصیت کا تعلق ان کی معرفت کے پیمانے' ان کے طرزِ زندگی اور اس طرزِ فکر سے ہے جو انہوں نے زندگی بسر کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔

شخصیت کی نشوونما کے لئے انسان کے تمام پہلوؤں اور اس کی تمام خصوصیات پر نظر رکھنی ضروری ہے اور ان تمام پہلوؤں پر ایک ساتھ توجہ مرکوز رکھنا چاہئے تاکہ ان میں باہمی توازن وجود میں آئے جو رشد و تعادل کا لازمہ ہے اور اس طرح ایک متوازن شخصیت ابھر کر سامنے آئے۔

اسلام ان تمام خصوصیات کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہیں۔ اور اس کے تمام اندرونی محرکات کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اور

خداوندِ عالم کی جانب سے انسان کو عطا شدہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے مکمل آشنا ہونے کی بناء پر ان کی رہنمائی کا بہترین حق ادا کرتا ہے۔ نہ ہی کسی صلاحیت کا سر کچلتا ہے کہ اس کی حقیقی قدر و قیمت گھٹ کر رہ جائے اور نہ بے وجہ ان میں سے کسی کے اضافے کا قائل ہوتا ہے۔ بلکہ ہر صلاحیت کو اس حد تک پروان چڑھاتا ہے جس حد تک یہ انسانی کامیابی کے لئے ضروری ہو۔ تاکہ انسانی شخصیت بہترین طریقے سے نشوونما پاسکے۔

کائنات میں پائی جانے والی دوسری چیزوں کی مانند انسانی روح و نفس بھی خود اپنے مدار میں، اپنے وجود میں اور اپنی فطرت کے فرمان کے مطابق ہمیشہ راہِ کمال کی جانب محوِ سفر ہیں اور اس لحاظ سے ان کا ہر قدم ان کے رشد و تکامل میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

بچپنے میں انسان کا میدانِ تخیل وسیع، تدبیر ناتواں اور وہ عالمِ معنی کی بہ نسبت عالمِ جس سے نزدیک تر ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے سادگی سے پیچیدگی و پرکاری کی جانب بڑھتا ہے۔ آسان کاموں کو چھوڑ کر مشکل اور بڑے کاموں کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہے۔ خیالات و تصورات کا حقائق سے موازنہ کرتا ہے۔ تفکّر و تعقّل میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دم بدم اس کی پختگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ پرورش اگر دائمی طور پر ہدایتِ ملکوت کے مدار میں نہ ہو اور اچھی طرح اسے غذا فراہم نہ ہو تو ناتوانی و بیماری کا شکار ہو جائے گی۔ جس کے بعد اس کا علاج کرنا ہوگا۔ کیونکہ جس طرح انسان کی فطرت میں اس کی استعداد و صلاحیتوں کی افزونی شامل ہے اسی طرح ان کا سقوط و تنزل بھی فطرت کا حصّہ

ہے۔ (فزونی و تنزلی) دونوں فطری و اصیل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی باہر سے مسلط نہیں کی گئی ہے۔

اسلام کمال کی جانب انسان کی بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ یہ رہنمائی انسانی وجود کے عناصر کو ان کی فطرت اور طرزِ خلقت کے مطابق حصولِ کمال کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

اسلام کی نظر میں حقیقی کمال حق و حقیقت کی راہ پالینا اور حقِ تعالیٰ کے جمال و جلال سے پیوستہ ہو جانا ہے۔ وہ شخص جو اسلامی تعلیمات سے خوب سیراب ہوتا ہے، گمراہ کُن تعریف و ستائش اسے غرور و خودپسندی میں مبتلا نہیں کرتی۔ وہ انسان پر انسان کی حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ خود کو پست اور گھٹیا نفسانی خواہشات کے حوالے نہیں کرتا اور خدا کے سوا کسی کی قوّت و قدرت کے آگے خم نہیں ہوتا۔

بشریّت کو اپنے تکامل کے لئے اسی راہ کو اختیار کرنا چاہئے، اپنے شعور و ادراک کو بلند کرنا چاہئے۔ کیونکہ جس ہستی نے ترقی و پیشرفت کی اس راہ کی نشاندہی کی ہے وہی ہے جس نے انسان کو خلق کیا ہے، وہی خالق ہے جو اس کی سرشت اور اس کی زندگی کی ضروریات سے آگاہ ہے۔

ہر فرد کو چاہئے کہ کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی ہستی کے مقصد کو پہچانے تاکہ اس معرفت کے ذریعہ کائنات میں انسان کے کردار، اس کی ذمہ داریوں، اس کی حدود اور کائنات میں اس کے روابط کا پتہ لگا سکے۔

البتہ محض یہ معرفت ہی کافی نہیں بلکہ اس کے پیچھے حرکت و عمل بھی درکار ہے۔ ایسی معرفت مفید ہے جو قوتِ محرکہ اور عمل کا پیش خیمہ ثابت ہو

تاکہ انسان کو اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی خلقت کے ہدف کو جامہء عمل پہنانے پر آمادہ کرسکے۔

اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ ایک ایسی قوم تیار کرے جو خداوندِ عالم کے آئین وطرز کو زمین پر رائج و نافذ کرے، پیشوائے بشریّت ہو اور انسانوں کو ان مختلف مکاتب ونظاموں سے نجات دلانے والی ہو جو اس کی گمراہی اور رنج والم کا باعث ہیں۔

اسلام کائنات کے بارے میں ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جو انسانی ترقی وتکامل کا عظیم ترین وسیلہ ہے۔ ایک ایسا نظریہ، کائنات متعارف کراتا ہے جو انسانی شخصیت کے تمام ارکان یعنی علم ودانش، تفکّر و تعقّل، احساس اور دیگر عناصرِ ادراک سے پوری طرح سازگار وہم آہنگ ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ انسانی حیات میں فکری و روحانی لحاظ سے بھی اور جنبش و عمل کے اعتبار سے بھی بے مثل وانمول نمونے وجود میں آئیں۔ اور انسان کے ذہن میں رہے کہ ہوا وہوس کی راہوں پر چلنا دراصل روح کو گھپ اندھیرے میں ڈال دینے اور اس کی نورانیت کو یعنی اس کے اس پہلو کو جو اسے فطرتاً کمال کی جانب لے جانے کا موجب ہے تیرگی میں گم کردینے کے مترادف ہے۔

لہٰذا اگر انسان حقیقی شخصیت کی تعمیر چاہتا ہے تو اس تیرگی سے نجات حاصل کرے تاکہ واقعی اور ثمر رساں اقدار کو صحیح طرح پہچان سکے اور زندگی کو مثبت انداز سے دیکھ سکے اور تربیت کی صحیح راہ اختیار کرکے اپنے وجود میں پوشیدہ تکامل کے محرّکات کو جامہء عمل پہنا سکے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام ایک انسان کی تعمیر کرتا ہے جو دو بُعدی ہے ایک طبعی

بُعد ہے جو فطرت اور کائنات میں موجود اشیاء سے استفادہ کرتا ہے اور دوسرا معنوی وابدی بُعد ہے جو انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اس خاکی ومادّی پیکر کے اندر ایک نور، آتشِ مقدس اور نفخۂ الٰہی سراٹھارہا ہے جو اسے خداوندِ عالم کی جانشینی وخلافت کے بلند وبالا مقام پر پہنچانے کا موجب ہے۔

انسان کی تعمیر میں عقل وایمان کے اثرات

اسلام انسان کی تعمیر میں عقل کے بنیادی کردار کا قائل ہے۔ اور زندگی کی پیچیدہ راہوں کو طے کرنے کے لئے عقل کی پیروی کی تاکید کرتا ہے۔ تاکہ انسان اپنی قوتِ ادراک سے روشنی حاصل کرے اور خود اپنے وجود اور اپنے معاشرہ میں "انسانیت" کو رواج دے۔

اس کے باوجود اسلام اس بنیادی عنصر "عقل" پر مبالغہ کی حد تک اعتماد نہیں رکھتا اور غرائز کی آگ کو سرد کرنے کے لئے اس کی کارکردگی کو کافی نہیں سمجھتا۔ زندگی میں ہونے والے تغیّرات میں عقل کا کردار راکد و جامد نہیں ہونا چاہئے۔ عقل انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند اور غرائز وخواہشات کے تسلط و حکمرانی سے باہر رکھتی ہے۔

اسلام کے نکتہء نظر سے انسان اور کائنات کی دوسری موجودات کے مابین تفاوت محض حسی اور عقلی ادراک تک منحصر نہیں۔ بلکہ انسان قلبی ایمان اور خاص ادراک کی بناء پر تمام حیوانات سے برتر ہے۔

چنانچہ انسان کائنات میں ایک ذمہ دار وجود کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز اور اجتماعی و انفرادی کردار میں

اوراک و ایمان کو اپنے دیگر انسانی پہلوؤں کے شانہ بشانہ کام میں لائے۔

انسان کامیابی اور خوش بختی کے لئے ایک ایسے معنوی وسیلے کا محتاج ہے جو اسے روشن بینی عطا کرے۔ یہ روشن بینی عطا کرنے والا عامل معرفتِ الٰہی ہے۔ یہی وہ وسیلہ ہے جو روح کی چشمِ بینا کے سامنے سے غفلت اور ہر نوع کے انحراف کے پردوں کو ہٹا دیتا ہے۔

خدا پر ایمان انسانی زندگی میں بے شمار مثبت اثرات کا باعث ہے۔ انسان اس ایمان کی بدولت خود کو اپنے جیسے دیگر انسانوں کی غلامی سے آزاد محسوس کرتا ہے۔ یہ ایمان ایسے تغیّرات کا سرچشمہ ہے جو انسانی شخصیت کے ارتقاء میں حساس کردار کے حامل ہیں۔

ب زندگی کے تمام شعبوں میں خدا پر ایمان کے اثرات ظاہر ہوں گے تو حیوانی غرائز کا دباؤ کم ہونا شروع ہو جائے گا اور انسان نفسِ امارہ کے مہیب چنگل سے نجات حاصل کر لے گا۔

خدا پر ایمان کا نتیجہ جلد گزر جانے والی مادّی لذّتوں کے مقابل ڈٹ جانے اور وسعتِ نفس پر منتج ہوتا ہے۔ جبکہ خدا اور معنویات سے روگردانی اور مادّی لذّات کی جانب رجحان عاطفہ میں جمود اور انسان کی معنوی شخصیت کے زوال پر منتج ہوتا ہے اور انسان کو آدمیت کی ارفع و اعلیٰ منزل سے حیوانیت و غفلت کے پست درجہ پر لے آتا ہے۔

انسان کا بنایا ہوا کوئی تربیتی نظام اس قدر قوت نہیں رکھتا کہ انسانی نفس کی سرکشی اور اس کی بڑھتی ہوئی حرص و ہوس کو لگام دے کیونکہ جدید تعلیمی نظام کا سرچشمہ محض دو قوتیں عقل اور علم ہیں۔

مشہور جرمن ماہرِ طبیعیات "میکس پلانک" کہتا ہے کہ:

"بنی نوع انسان زندگی بسر کرنے کے لئے کسی اصول کی محتاج ہے۔ علوم کی تشنگی اس قدر اہم نہیں جتنا اہم اس اصول کا حصول ہے کہ انسان کے پاس عقلِ محض کے علاوہ بھی ہدایت کا کوئی منبع ہونا ضروری ہے۔

قانونِ علیّت علم کا رہنما ہے۔ یہاں عقل کو اپنی جگہ اخلاق کے سپرد کر دینی چاہئے اور علم کو چاہئے کہ دینی اعتقادات کے لئے جگہ خالی کر دے۔" (علم بہ کجامی رود۔ ص ۲۳۴)

بنا بر ایں جب تک افقِ ہستی پر نورِ ہدایت اپنی روشنی نہ بکھیرے اور دلوں میں مذہب کو پروان چڑھانے والا محرّک بیدار نہ ہو اس وقت تک انسانیت کے لئے بنائے جانے والے اصول و مبادی معاشرہ میں ایک طاقتور عامل اور اعلیٰ ترین خصلت کے بطور وجود میں نہیں آسکتے اور تمدّن اور معاشرہ کی ذمہ داریوں کا سنگین بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

توجہ رہے کہ اسلام خداوندِ عالم کی عطا کی ہوئی جائز لذّات سے کنارہ کشی کا کوئی حکم نہیں دیتا۔

ایک طرف قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ہوا و ہوس کی سرکش موجوں میں غرق ہونا، زندگی کی حقیقتوں سے بے پروا ہو کر غفلت و بے خبری کی نیند سوئے رہنا اور کوتاہ فکری مقامِ انسانیت کے شایان شان نہیں۔

ارشادِ رب العزت ہے:

"زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین

والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذالک متاع الحیاۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب"

"لوگوں کے لئے خواہشاتِ دنیا عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، تندرست گھوڑے یا چوپائے، کھیتیاں سب بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔"

(سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۴)

اور دوسری جانب انسانی زندگی میں مادّہ کے کردار کو ناقابلِ قبول اور بے تاثیر نہیں سمجھتا بلکہ منفی معنویات اور خداوندِ عالم کی طرف سے جائز کی گئی لذّات سے محرومی کو ناپسند کرتا ہے۔

ارشاد ہے :

"قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هى للذين امنوا فى الحياة الدنيا خالصة يوم القيامة كذٰلك نفصل الايات لقوم يعلمون"

"پیغمبرؐ آپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کر دیا ہے۔ اور بتائیے کہ یہ چیزیں روزِ قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دُنیا میں ایمان لائے ہیں۔ ہم اسی طرح صاحبانِ علم کے لئے

مفصل آیات بیان کرتے ہیں۔" (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۳۲)

ناپائیدار مادّی لذتوں کے سامنے سرِتسلیم خم کردینے کے نتیجے میں قوّتِ تفکّر و تعقّل اور اس کی اصالت پر انسان کا ایمان کمزور پڑ جاتا ہے۔ بے ارادہ اور کھوکھلے انسانوں کے دلوں پر متاعِ دنیا کے زرق و برق پردے پڑکر نورِ الٰہی کی ضیاء پاشیوں کا راستہ روک دیتے ہیں۔ اور وہ لاعلمی میں تعمیری افکار اور تفکّر و تعقّل سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اسلام انسان کو صحیح و سالم شخصیت، تفکّر و تعقّل کی قوّت اور بیش قیمت ثباتِ قدم عطا کرتا ہے۔ تاکہ انسان اپنی اور اپنے معاشرہ کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کر سکے اور اپنی مادّی ضروریات سے محروم ہوئے بغیر ہوا و ہوس کی قید سے چھٹکارا حاصل کر لے۔

اسلام جس انسان کو پرورش کے کامل نمونہ کے بطور پیش کرتا ہے وہ متفکّر، مثبت، فعال اور مہذب شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ایسا انسان ہے جس کے شعور وادراک، رفتار و کردار خلاصہ یہ کہ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک خاص اعتدال وہم آہنگی دیکھی جاسکتی ہے۔ آزاد اور پرورش یافتہ روح اس کے اندر ایسا توازن ایجاد کر دیتی ہے کہ وہ اپنے مقدس اہداف کی راہ میں ناصرف اس بات پر قادر ہوتا ہے کہ خود کو عالمِ مادّہ میں غرق ہونے سے محفوظ رکھے بلکہ اس میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ خود کو اوپر اٹھا کر، ارتقاء کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دے۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے انسانی کمالات وفضائل کے ارتقاء کا پہلا زینہ تزکیۂ نفس ہے۔ قرآنِ کریم تزکیۂ نفس کو معرفتِ علمی اور تعلیم و تربیت کا

مقدمہ قرار دیتا ہے :

"ھوالذی بعث فی الامیّن رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین"

"اس خدا نے امیّوں میں ایک رسول بھیجا ہے جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا ہے، ان کو پاک کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔" (سورۂ جمعہ ۶۲- آیت ۲)

یہ بنیادی اصول ایک ایسی کسوٹی ہے جس سے انسان کی حقیقت کو جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی حقیقت کا معیار علم یا مادّی قدرت کو بنایا جائے تو انسان بے قیمت ہو جائے گا کیونکہ اس طرح انسان کی حقیقت کے محض ایک پہلو کو پرکھا جا سکتا ہے جو جامعیت کا حامل نہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر موازنے میں خطا کی گنجائش ہے اسی تناسب سے اس سے حاصل ہونے والے نتائج میں بھی غلطیاں پائی جائیں گی۔

البتہ علم انسانی امتیازات میں سے اور اس کا اصل نتیجہ و محصول ہے۔ اور اس کی زندگی کی بنیادیں، علم ہی پر استوار ہیں۔ لیکن تب ہی جب انسان اپنی اصلی و حقیقی انسانیت سے جو اِسے جہانِ مادّہ سے اعلیٰ و برتر جہان کی جانب پرواز پر آمادہ کرتی ہے، بہرہ ور ہو۔

اگر علم و دانش کے لحاظ سے انسان میں نقص و کمی پائی جاتی ہو تو تزکیہ نفس کے ذریعہ باآسانی اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ محض علم اس نقص کے ازالہ پر

قادر نہیں۔

انسان تہذیبِ نفس و معیارِ انسانیت کی راہ پر چلتے ہوئے بلندی کی جانب قدم بڑھائے اور علم و دانش کے ثمرات سے بھی بہرہ مند ہو تو اس کے لئے یقیناً ایک وسیع، ہمہ جانبہ اور مکمل تکامل کا حصول ممکن ہے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ تہذیبِ نفس اور اخلاقی فضائل کے حصول کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

"لو کنا لا نرجو جنۃ ولا نخشی نارا ولا ثوابا ولا عقابا لکان ینبغی لنا ان نطالب بمکارم الاخلاق فانھا مما تدل علی سبیل النجاح"

"اگر ہمیں نہ جنت کی امید ہو، نہ دوزخ کا اندیشہ، نہ ثواب کی طرف رغبت نہ کسی عذاب کا دھڑکا۔ تب بھی ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اچھے اخلاق اپنائیں! اچھے اخلاق اپنانا اور ان کے مطابق عمل کرنا دنیا میں سعادت و خوش بختی کا سبب اور کامیابی کے اہم ترین عوامل میں سے ہے۔" (آداب النفس- ج۱- ص۲۶)

نیز آپؑ ہی کے ارشادات ہیں :

"غالب الشھوۃ قبل قوۃ ضراوتھا فانھا ان قویت ملکتک واستفادتک ولم تقدر علی مقاومتھا"

"اپنی نفسانی خواہشات پر ان کے زور پکڑنے سے پہلے مسلط ہو جاؤ۔ کیونکہ اگر نفسانی خواہشات زور پکڑ لیں تو وہ تم پر حکومت کریں گی اور تمہیں اپنی رو میں بہا لے جائیں گی۔ پھر تم ان کا مقابلہ نہ

کر سکو گے۔"

(غرر الحکم۔ص ۴۹۸ اور ۵۱۰)

"عبد الشهوة اذل من عبد الرق"

"شہوانی خواہشات کا غلام انسان کے غلام سے زیادہ ذلیل و پست ہوتا ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۴۹۸ اور ۵۱۰)

"من غلب شهوته صان قدرة"

"جو شخص اپنی نفسانی خواہشات پر غالب آگیا اس نے اپنی انسانی قدر و منزلت محفوظ کرلی" (مستدرک۔ج ۲۔ص ۲۸۷)

"ویل ڈورینٹ" کہتا ہے کہ۔

"ہمارے تمایلات و محرّکات اس ہوا کی مانند ہیں جو بادبانی کشتی چلانے کے کام آتی ہے۔ لیکن بادبان کو یوں ہی چھوڑ دینا درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ ہمیں اپنے غلاموں کی طرح جہاں چاہے کھینچ کر لے جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کا مشاہدہ کیا ہوگا جو نفس کے غلام ہوں۔

نفس کی کسی بھی خواہش کو پوری طرح بے لگام چھوڑ دینے سے عادت بگڑ جاتی ہے۔ آپ نے کوروش کے بیٹوں کا قصہ سنا ہوگا۔ ان کی آیاؤں نے انہیں بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا تاکہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس کے نتیجے میں وہ سب کے سب نالائق اور ست ہو گئے۔

پس خواہشات پر علم و معرفت کا تسلط عقل کا حقیقی جوہر اور ضبطِ نفس کی بنیاد ہے اور شخصیت کی تعمیر کے لئے ضبطِ نفس اہم ترین ضرورت

ہے۔" (لذّات فلسفہ۔ص ۲۲۸)

اسلامی نظام میں کاموں کا محور اور ذمہ داریوں کی بنیاد ارادہ ہے۔ انسان کو غور و فکر کرنے اور اپنی فکر کے نتیجے پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے اور اس خصوصیت سے سرفراز کیا گیا ہے کہ اپنی کارکردگی و فعالیت کو جو ترقی و پیشرفت کی اصل بنیاد ہے حقیقی انسانیت کے حصول کے لئے کام میں لائے۔

ہر چند کوئی انسان غرائز و خواہشات کی یورش سے محفوظ نہیں، لیکن ان سے مقابلہ کرنے میں وہ آزاد و خود مختار ہے۔ وہ اپنے افعال و شعور پر حاکم ارادے کے ذریعے اس بات پر قادر ہے کہ اپنی نفسانی و فکری فعالیت کو بلندی پر پہنچائے اور ایک ممتاز و ارجمند شخصیت کا مالک بن جائے۔ اور اس شخصیت کو مزید پروان چڑھانے کے لئے اپنی عمر کے ہر ہر لحظہ میں سرگرمِ عمل رہے۔ یا پھر اپنے خصائص کی بنیاد کو مخرّب خواہشات پر استوار کرے جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت فاسد و تباہ و برباد ہو جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من استوى يوماه فهو مغبون"

"جس شخص کے مسلسل دو دن ایک جیسے ہوں وہ نقصان میں ہے"

"ومن كان آخر يوميه خيرهما فهو مغبوط"

"جس شخص کے مسلسل دو دنوں میں دوسرا دن پہلے دن سے بہتر ہو، وہ قابلِ رشک ہے۔"

"ومن كان آخر يوميه شرهما فهو ملعون"

"جس شخص کے مسلسل دو دنوں میں دوسرا دن پہلے سے بدتر ہو، وہ

ملعون ہے۔"

"ومن لم یر الزیادۃ فی نفسه فھو الی النقصان فالموت خیر له من الحیاۃ"

"اور جس شخص کو سمجھ ہی میں نہ آئے کہ اگلا دن پچھلے دن کی نسبت بہتر گزرا ہے یا نہیں تو وہ نقصان میں ہے اور اس کی موت زندگی سے بہتر ہے۔"

(معانی الاخبار۔ ص ۳۴۲)

جیگو کہتا ہے:

"اپنے پروگرام کو پہلے سے ترتیب دے کر ہم خواہشات کے تسلط سے نجات حاصل کرسکتے ہیں اور ضمیر کو سنجیدگی سے غور و فکر پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ کافی ہے کہ آپ آئندہ روز کرنے والے کاموں کا ایک جائزہ لیں۔ اس کام کے لئے روزانہ سونے سے قبل کے چند لمحات یا کسی اور مناسب وقت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ یہ عمل آپ میں ایک نہایت عمدہ عادت یعنی نظم و ضبط پیدا کردے گا۔

جن لوگوں میں یہ عادت نہیں پائی جاتی وہ اسے اختیار کرنے کے بعد یہ نہ سوچیں کہ پہلے ہی روز اس کے معجزانہ اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے بلکہ ابتداء میں ایسا ہوگا کہ ان کے متعیّن کئے ہوئے کاموں میں سے چند انجام پائیں گے اور پھر رفتہ رفتہ بدنظمی کی بُری عادت ختم ہوجائے گی۔ جس کے نتیجہ میں انسان ترقی و تکامل کی پرپیچ

وخم راہوں کو عبور کرتا چلا جائے گا۔"

(تلقین بنفس۔ ص ۹۶)

بے شک مخرّب نفسانی خواہشات اور نفسِ امارہ سے مقابلہ ایک دشوار کام ہے اور اسلام کی نظر میں ایسا انسان کامیاب وخوش بخت ہے جو ان خواہشاتِ نفسانی پر برتری حاصل کرلے۔ انسان کا سب سے بڑا افتخار ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خودسازی کے پروگرام کا آغاز اپنی نفسانی خواہشات پر غلبے کے حصول سے کرے تاکہ ایک اعلیٰ ترین شخصیت کا مالک بن جائے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"اقصر نفسک عما یضرھا من قبل ان تفارقک، واسع فی فکاکھا کما تسعی فی طلب معیشتک فان نفسک رھین بعملک"

"اس سے قبل کہ تم موت کے منہ میں چلے جاؤ اور تمہارے جسم وروح کے درمیان جدائی پڑجائے۔ اپنے نفس کو اس کے لئے مضرخواہشات سے باز رکھو اور جس طرح اپنی روزی کمانے کے لئے کوشش کرتے ہو اسی مانند اپنے نفس کی آزادی کے لئے جدوجہد کرو۔ بے شک تمہارا نفس تمہارے کردار و عمل سے وابستہ ہے۔"

(مستدرک۔ ج۲۔ ص ۳۱۰)

مشہور فرانسیسی دانشور "ڈاکٹر کارل" کہتا ہے:

"نفس کا خود بخود رشد و تکامل کی جانب بڑھنا ہمیشہ ناقص رہتا ہے اور انسان کمال کی جانب بڑھنے کا ارادہ کئے بغیر رشد نہیں پاسکتا۔ سب ہی

جانتے ہیں کہ تن سازی کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے اور بغیر مسلسل مشق وریاضت کے کوئی مانا ہوا تن ساز نہیں بن سکتا۔

اسی طرح شعوری قوتوں میں اضافے کے واسطے مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اگر طالب علم پڑھنا ہی نہ چاہتا ہو تو قابل ترین اساتذہ بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ اخلاقی کتب کا محض مطالعہ کرلینا کسی کو متقی نہیں بنا سکتا اور روح پر کوئی بات ٹھونسنا ناممکن ہے۔"

"برکس" کے بقول شخصیت کی تعمیر اپنے اخلاق کی تعمیر کی مانند خود ہی کی جاتی ہے۔ اخلاق کی تعمیر کرتے ہوئے انسان اپنی روح سے حتیٰ الامکان چیزوں کو نکالتا ہے اور اپنی باطنی زندگی کو آئیڈیل کے مطابق منظم کرتا ہے اور اپنے اندر ایک قوی روح پروان چڑھاتا ہے۔

تاریخِ انسانی میں یہ حیرت انگیز امر ہر روز واقع ہوتا ہے۔ اکثر غریب گھرانوں ہی میں عظیم انسان پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ہر جاہل یا عالم، پیر یا جواں اگر چاہے تو اپنے اندر موجود معنوی قوتوں سے استفادہ کرسکتا ہے۔"

(راہ ورسمِ زندگی-ص ۶۱)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

"شر الفقر فقر النفس"

"بدترین محتاجی، نفس کی محتاجی ہے" (غرر الحکم-ص ۴۴۶)

کیونکہ انسان نفس کی محتاجی کی بناء پر اس سے کہیں زیادہ تیرہ روزی اور بدبختی کا شکار ہوتا ہے جتنا مادّی محتاجی کی بناء پر ہوتا ہے۔ جب روح بیمار ہوجاتی

ہے اور تاریکی کی جانب بڑھنے لگتی ہے تو انسان غلط طرزِ تفکّر، نادرست احساسات اور اپنے رفتار وگفتار میں لغزشوں وخطاؤں سے دوچار ہوجاتا ہے۔

ایسی صورت میں انسان حقیقت بینی اور قلب وروح کی بصیرت سے محروم ہوجاتا ہے اور اپنی باطنی قوتوں اور مادّی عناصر سے سوء استفادہ کرنے لگتا ہے۔

شخصیت زندگی کی اقدار کے معیار پر پروان چڑھتی ہے اور اسی بنیاد پر صفات وخصائل پھلتے پھولتے ہیں۔ اگر انسان قاطعیت وثابت قدمی کے ساتھ پاکی وفضیلت کی جانب گامزن ہو تو اس کا ذہن ان خصوصیات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ اور اگر وہ آلودگیوں اور پلیدگیوں کی راہ پر چل نکلے تو زوال وتباہی اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ تصور بھی محال ہے کہ کوئی آلودگیوں کی جستجو کرے اور پاکی وپاکیزگی پالے۔

اگر انسان معقول حد تک آزادی پر اکتفانہ کرے گا تو اس کا میدانِ عمل اور سرکش خواہشات کی جولا نگاہ لامحدود ہوجائے گی جس کے نتیجے میں وہ خواہشات کے پیچھے ہر سو سر جھکائے ہوئے کھنچا چلا جائے گا۔

اور ظاہر ہے کہ اس کا مطلب خود کو ذلّت وخواری سے دوچار کرنا اور اپنی انسانی شرافت وکرامت کو پست کرنا ہے۔ یہ ایسی ذلت وحقارت ہے جو اس کے مناسب کمال تک پہنچنے میں مانع ثابت ہوگی اور اس کی فکر وسیع وعریض افق پر ہرگز بلندی حاصل نہ کرسکے گی۔

حتیٰ پھر ایسے شخص کو جسمانی سطح سے ارتقاء کی خواہش بھی نہیں رہتی ہر چند اس مقصد کے لئے اس کے پاس کافی قوّت بھی موجود ہو۔

بلندیوں کی جانب روح کی پرواز اور اسے زوال اور انحطاط کی جانب

دھکیلنے والے دباؤ کے مابین اعتدال وتوازن قائم کرنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ ہے خدا اور انسان کے درمیان مضبوط اور کبھی نہ ٹوٹنے والے بندھن کا قیام۔ اس لئے انسان جس قدر خدا سے دور ہو گا اسی تناسب سے اس کے انحراف میں اضافہ ہو گا۔

اسلام ہر دل میں تقویٰ وپرہیزگاری کا بیج بوتا ہے اور کسی صورت عقیدہ وعمل کے درمیان خلیج کا قائل نہیں اور چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ تفکر وادراک اور اعمال و رفتار میں خدا کو پیشِ نظر رکھے۔ اس خدا کو مدِ نظر رکھے جو اس کے دل کے رازوں اور اس کے باطن کے تمام اسرار سے آگاہ ہے اور وہی جو انسان کے وجود میں حق کی محبت اور اپنی رضا کے حصول کی خواہش ابھارتا ہے۔

جب تک انسانی فضائل کسی محکم وپائیدار بنیاد کے بغیر ہوں گے، ہرگز ثبات ودوام نہیں پاسکتے۔ فضائل کا فطری پشت پناہ عقیدہ ہے کہ جو ان کے قالب میں روح پھونکتا ہے اور انہیں راستی واخلاص بخشتا ہے۔

بنابرایں ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ طہارت وپاکیزگی ایسی چیزیں ہیں جن کی جڑیں انسان کے باطن میں محکم ہونی چاہئیں۔ فضیلت وپاکیزگی محض خواب وخیال میں آئیڈیل مجسم کرنے اور عمل میں اس کے برخلاف اقدام کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

ایک فرد جو دل کی گہرائیوں سے خداپرست ہے، اس کا قلب اس قدر پاک ومُصَفّا ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کی پلیدگی ونجاست اسے آلودہ نہیں کرسکتی اور ہرگز اس کے عقیدہ وعمل اور ادراک و رفتار میں جدائی وفاصلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسلام ہوا وہوس کی موجوں کو حد میں رکھنے کے لئے ہمیشہ انہیں قابو میں رکھنے والی قوت کو کام میں لاتا ہے۔ یہ منظم، آگاہانہ اور بامقصد روک تھام روح کا ایسے معروف اصول وقواعد کے ذریعہ محاسبہ کرتی ہے جو حکمت وتدبیر پر استوار ہیں۔ اسی وسیلے سے انسان ایک فرد یا معاشرہ کے ایک عضو کے بطور اپنی گوناگوں خواہشات کے مابین اعتدال وہم آہنگی برقرار کرتا ہے اور ان کی حد بندی کرتا ہے۔ تاکہ معاشرہ کے مقابل فرد کی حیثیت اور فرد کے مقابل معاشرہ کی حیثیت کا تعین کیا جاسکے۔

اس صورت میں کہ جب انسان ہمیشہ از خود ان دو راہوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتا ہے اور یا تو فرد کو معاشرہ کی خواہشات پر قربان کرتا ہے یا پھر معاشرہ کو انفرادی فوائد کے سامنے معمولی شمار کرتا ہے۔ جب انسان کی سرشت میں ایسی ہم آہنگی وجود میں آجائے تو فرد اور معاشرہ دونوں منظم ہو جاتے ہیں اور سب ہی اپنے اپنے اعمال وخیالات میں متعادل ہو جاتے ہیں اور ہر ایک اپنی فطری ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

لیکن جب عقل پر تالے پڑجائیں اور افکار وخیالات منجمد ہو جائیں تو انسان حقیقت کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنی شخصیت کے نقائص اور ناکامیوں کی وجوہ دریافت کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ جب اسے اپنے نقائص کا علم ہوتا ہے تو بڑا متعجب ہوتا ہے اور حتیٰ خود سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"لوعرف المنقوص نقصه لساء مايرى من

عیبہ"

"اگر انسان کو اپنی شخصیت کے نقائص و معائب کا علم ہو جائے تو وہ ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔" (غرر الحکم۔ص ۲۰۴)

"شوپنهاور" کہتا ہے :

"جس طرح آدمی کو اپنے جسم کے وزن کا احساس نہیں ہوتا اسی طرح اسے اپنی بُری عادتیں' ناپسندیدہ حرکات اور ناپسندیدہ چال چلن بھی محسوس نہیں ہوتے۔ اس کے بر عکس وہ ہمیشہ دوسروں کے عیوب ونقائص پر نظر رکھتا ہے۔

دوسرے لوگ آئینے کی مانند ہمارے عیبوں کو منعکس کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنے یہ عیب نظر نہیں آتے بلکہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ ہم میں نظر آنے والی چیز دوسروں کا عکس ہے۔" (افکارِ شوپنهاور۔ص ۹۳)

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اپنے نفس کو خواب سے بیدار کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر حقائق کو درک کرسکے۔ یہ بیداری انسانی ذات میں حیرت انگیز اثرات کا موجب ہوتی ہے اور انسان یوں محسوس کرتا ہے جیسے اسے ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔

جوں جوں چشم بصیرت کُھلتی ہے زندگی پر اس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور انحطاط پذیر شخصیت راہِ تکامل پر گامزن ہوجاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام مختلف مقامات پر بصیرت یعنی غور و فکر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"علیک بالفکر فانه رشد من الضلال ومصلح

الاعمال"

"غور و فکر کی عادت اختیار کرو کیونکہ اسی طرح تم گمراہی سے نجات پا سکتے ہو اور اسی طریقے سے تمہارے کردار کی اصلاح ہوسکتی ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۴۸۱)

"الفکر فی الخیر یدعو الی العمل به"

"نیک کاموں کے بارے میں فکر کرنا انسان کو ان کی انجام دہی پر آمادہ کرتا ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۵۱ اور ص ۳۹۶)

"خوض الناس فی شئی مقدمة الکائن"

"کسی چیز کے بارے میں لوگوں کا غور و فکر کرنا اس کے وجود میں آنے کا مقدمہ ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۳۹۶ اور ص ۵۱)

ڈاکٹر ماڑدن غور و فکر اور اس کے مثبت نتائج کے بارے میں یوں لکھتا ہے :

"غور و فکر کرنا کشتی کے چپوار کا سا کام کرتا ہے۔ یہ حقیقت طویل عرصے تک پنہاں اور نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ اس وقت بھی (ایسا ہی تھا) جبکہ لوگ غور و فکر تفکّر و تعقّل کو احترام و ستائش کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اب وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک لامتغیّر و معیّن قوت ہے جو استثنائی و نادر اذہان سے مخصوص ہے۔ فقط گزشتہ چند برسوں میں فکر کی تنظیم کے ہنر پر مطالعہ و تحقیق کا آغاز ہوا ہے۔

اس مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فکر سے استفادہ کرتے

ہوئے ہم اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو آپس میں ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کے خارجی عوامل یا کم از کم اپنے نفس پر ان عوامل کے اثرات میں ردوبدل کر سکتے ہیں اور اس طرح سعادت وکامیابی کے حصول کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ فکر کی تربیت کے امکانات لامحدود اور اس کے نتائج لامتناہی ہیں۔

ہر فکر اس قلم کی مانند ہے جو زندگی کے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں کو تراشتی ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ عزمِ صمیم کے ساتھ فکر کو بہترین راہ پر لگائیں اور اس عزم کو جامہ عمل پہنانے کے واسطے اپنے ارادے کی تمام تر قوت کو کام میں لائیں۔

آپ کو اپنے تمام وجود کے ساتھ اقرار کر لینا چاہئے کہ فکر بطورِ مطلق آپ کے تمام مقدّرات پر حاکم ہے اور معمولی سا غور و فکر بھی آپ کی قسمت بنانے میں کوئی نہ کوئی حصّہ ضرور رکھتا ہے۔

یہ یقین رکھئے کہ اگر آپ اپنے افکار کی مناسب راہ پر رہنمائی کریں گے تو قدرتی طور پر اور نہایت آسانی کے ساتھ ایک اچھا مستقبل آپ کا مقدّر بن سکتا ہے۔ فکر، مادّی اور معنوی مسائل کے بارے میں جو کردار ادا کرتی ہے وہ رفتہ رفتہ مزید واضح ہو رہا ہے۔ اور وہ لوگ بھی جو مختلف مسائل میں باہم اختلاف رکھتے ہیں اس بارے میں متفق الرائے ہیں۔

وہ نتائج جو عملی تجربات سے حاصل ہوئے ہیں انہوں نے اس نظریئے کے بدترین مخالفوں کو بھی اس کا قائل کر دیا ہے اور فنی تجربات نے

متفکّرین کے نظریات کو اس مسئلے پر قوی تر کیا ہے۔"

(پیروزی فکر۔ ص ۷-۸-۱۰)

بُرے افکار کے نقصانات

جس طرح مثبت اور عالی افکار انسان کو سود مند اعمال کی جانب ابھارتے ہیں، اسی طرح پلید و ناپاک افکار اسے آلودگی و ناپاکی کی جانب کھینچتے ہیں۔ کیونکہ انسان سوچ بچار کرنے والا موجود ہے۔ وہ پہلے کسی چیز کے بارے میں سوچتا ہے اور پھر عمل کرتا ہے۔

جب ناروا افکار، بے مصرف گھاس پھوس کی طرح انسان کے اندر پروان چڑھتے ہیں تو پھولوں کی مانند خوبصورت مثبت افکار رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں اور بے کار گھاس پھوس ان کی جگہ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور اسی شیطانی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے مکروہ اعمال کی انجام دہی پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اس کے دل کو سیاہ اور زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

ہر چیز بتدریج پروان چڑھنے کے بعد تلخ یا شیریں پھل دیتی ہے۔ بُرے افکار بھی ایسے بیج کی مانند ہیں جس کا پھل تلخ ہوتا ہے اور انسان غیر ارادی طور پر ان افکار کی پیروی شروع کر دیتا ہے جو رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

سعادت کے حصول کے لئے ایک مطمئن روح اور پاک دل ضروری ہے۔ اگر روح کے دریچے بُرے افکار کے لئے بند کر دیئے جائیں تو یہ نیک افکار کی جولانگاہ بن جاتی ہے۔

ایک بزرگ سے دریافت کیا گیا۔
سعادت کس ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہے؟
کہنے لگے :
"انسانی فکر کے حسن و جمال سے۔"

لہٰذا پانی کو اس کے منبع ہی سے قابو میں کرنا چاہئے۔ بُرے افکار کو دل میں راہ ہی نہیں دینی چاہئے اور اپنے اندر صرف سود مند اور باقدر و قیمت باتوں کے بارے میں غور و فکر کی عادت ڈالنی چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"عود نفسک الاستهتار بالفکر والاستغفار' فانه یمحو عنک الحوبة و یعظم المثوبة"

"خود کو غور و فکر سے عشق اور اسی طرح استغفار کا عادی بناؤ کیونکہ یہ روش تمہاری خامیوں اور خرابیوں کو نہ صرف دور کردے گی بلکہ تمہارے ثواب میں اضافہ کا بھی باعث ہوگی۔" (غرر الحکم۔ص ۴۹۲)

"عود نفسک حسن النیة وجمیل القصد تدرک فی مساعیک النجاح"

"اپنے اندر پاک و منزّہ نیت اور نیکی کی جانب توجہ کی عادت ڈالو تاکہ اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرسکو۔"

(غرر الحکم۔ص ۴۹۲)

اگرچہ پہلے سے دل میں بیٹھے ہوئے بُرے خیالات آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر انسان شخصیت کو تباہی و بربادی کی

جانب لے جانے والی ناپسندیدہ باتوں سے نجات کی مسلسل کوشش جاری رکھے اور اچھی عادات اپنانے پر بھی توجہ مرکوز رکھے تو قدرتی طور پر رفتہ رفتہ انسانی فضائل اس میں جاگزیں ہوجائیں گے۔

خود کو پاک و پاکیزہ صفات سے مُزیّن کرنے کے لئے اچھی اور پسندیدہ صفات کی جانب متوجہ رہنا چاہئے کیونکہ خود کو اچھے اور نیک فضائل کی تاکید کرتے رہنے سے بہترین نتائج ہاتھ آتے ہیں۔

جیگو لکھتا ہے :

"نفس کو تلقین کرنا دراصل عادات کے خلاف ایک اور فوج کی صف بندی کرنا ہے۔ بجائے یہ کہ خود اس پر حملہ کریں' ایسے افکار ضمیر میں داخل کریں جو ان افکار کی ضد ہوں جن کی وجہ سے یہ عادات وجود میں آتی ہیں اور اس طرح ذہن میں نئے افکار و خیالات کو جگہ ملتی ہے۔

اس مقصد تک رسائی کے لئے سب سے پہلے جس مسئلہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے وہ اس حقیقت پر گہری نظر ڈالنا ہے کہ عادات کو ترک کیا جاسکتا ہے۔ ہم خود کو اس شر سے مکمل طور سے نجات دے سکتے ہیں اور اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس بات کو بار بار دہرانا چاہئے۔ یہ یقین قانونِ تلقین پذیری کے مطابق بار بار دُہرانے سے ہمارے دل میں بیٹھ جائے گا اور ضمیر پر خود بخود یہ تلقین ثبت ہوجائے گی اور اس احساس کا لغو ہونا ثابت ہوجائے گا کہ جبر نا قابلِ احتراز ہے۔

اگر کسی میں یہ خوش فہمی کہ (ناپسندیدہ) عادات کو جب چاہیں گے

بدل ڈالیں گے یقین کی حد تک پیدا ہو جائے تو یہ کیفیت نہایت قبیح ہے، بہتر ہے کہ اس کی بجائے ایسے معائب سے پرہیز کی راہ اپنائی جائے جو ان خطاکاریوں کا سبب ہیں۔" (تلقین بہ نفس۔ ص ۱۰۲)

شخصیت کی نشوونما سے مقصد کا تعلق

جو چیز انسان کو انسانیت کے بلند مقام و مرتبے کی جانب لے جاتی ہے اور جس کے نتیجے میں اس کی شخصیت کو رشد و کمال حاصل ہوتا ہے وہ اس کا زندگی میں ایک ارفع و اعلیٰ ہدف کا مالک ہونا ہے۔ جتنا ہدف عالی ہو گا انسانی شخصیت اسی قدر پروان چڑھے گی۔

بے شک اسلام ایک وسیع ہدف کا حامل ہے اور اس کی نگاہ ایک نہایت وسیع اور جامع افق پر ہے۔ وہ مسلمان جن کی تربیت پیغمبرِ گرامیٔ اسلام کے ارشادات و تعلیمات کے سائے میں ہوئی وہ مبداء ہستی سے ارتباط رکھ کر اور اپنے نفوس کا تزکیہ کر کے ایک ممتاز اور عالی ترین شخصیت کے مالک ہو گئے۔ یہی وہ گراں بہا اور بیش قیمت مقاصد ہیں جن کے حصول کے لئے ان کے قدم آگے ہی آگے کی جانب بڑھتے رہے۔

مشہور امریکی ماہرِ نفسیات "البرٹ" کہتا ہے کہ:

"مقاصد کا شمار شخصیت کی خاص اور اہم صفات میں ہوتا ہے۔ مقصد اور نیت ہی سے اس روش کا پتہ چلتا ہے جس پر انسان چلنا چاہتا ہے۔ انسان کی نیت اور مقاصد ہی ایسے محرکات کا انتخاب کرتے ہیں جو اس کے لئے سودمند ہوں۔

اس انتخاب کے ذریعے وہ ایسے عناصر سے شناسائی حاصل کرتا ہے جو مضر و ضرر رساں ہیں اور یوں وہ آگے بڑھنے کے لئے بہت سی چیزیں حاصل کر لیتا ہے۔

"اسپرنگر" یہ دیکھنے کے لئے کہ آدمی کوئی قابلِ قدر اور باقاعدہ روش اختیار کئے ہوئے ہے یا نہیں۔ مقصد کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔

ایک بنی بنائی عمارت ساکت و راکد ہے لیکن ایک ایسی عمارت جو ابھی زیرِ تعمیر ہے اور ایک معیّن راستے پر اپنی تکمیل کی جانب گامزن ہے اس میں بنانے والے کے مطمحِ نظر کے مطابق تبدیلی کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

بہر حال جہاں رشد و تکامل پوری زندگی میں جاری و ساری ہوتا ہے وہاں شخصیت میں مذہبی حس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک بالغ انسان کی عقل بشرطیکہ وہ ابھی رشد و تکامل کی حالت میں ہو حتی المقدور اپنی منطقی صلاحیت کو برہانِ قیاسی و استقرائی اور احتمالات کے پیمانے پر وسعت دے سکتی ہے۔

جب انسان اپنی یہ جدوجہد جاری رکھتا ہے اور اپنی قوتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک طرح کے ایمان کی ضرورت ہے تاکہ اسے عقل کے مکمل طور پر شکست کھا جانے کے بعد ایک دفاعی ہتھیار کے بطور استعمال کر سکے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اس دنیا کی بے رحم مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے عشق و ایمان کی

ضرورت ہے۔ اکثر مذہبی افراد کا دعویٰ ہے کہ ان کی دیانت مافوقِ فطرت قوتوں پر توجہ رکھنے کا نتیجہ ہے کیونکہ ظواہرِ طبیعی اور اسرار آمیز حوادث نے ماوراء طبیعت پر ان کے ایمان میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح انسان ایک ایسے جامع اعتقادی نظام کی تلاش کے نتیجے میں جو اسے پوری کائنات سے مربوط کردے، اپنے لئے ہدف وجہت کا تعین کرلیتا ہے۔

ایک خاص تصورِ کائنات انسان کی پوری زندگی کو اپنے اعتقادات، اصولوں اور تصورات کے تحت لے آتا ہے۔

یقیناً مذہب انسان کو اضطراب، شک وتردید اور ناامیدی کی یلغار کے مقابلہ اور اس سے دفاع کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان میں آئندہ کے لئے عزم وارادہ بھی پیدا کرتا ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو ایک پُر معنی انداز میں "تمامیتِ وجود" سے پیوستہ ومربوط کرتا ہے۔"

(رشدِ شخصیت۔ص ۹۳، ۹۴، ۹۸)

روح اور جسم کی کارکردگی کا باہمی ارتباط

سائنسی تحقیقات اور تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ روحانی اور نفسیاتی بیماریوں کا اثر جسم پر بھی پڑتا ہے اور اسی طرح روح پر بدن کے کیمیائی انفعالات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہیں سے ہمیں روح اور جسم کے باہمی ارتباط کا علم ہوتا ہے۔

اگرچہ اس سائنسی نظریے کو گزشتہ چند دہائیوں کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے لیکن اسلامی روایات میں چودہ سو سال قبل ہی سے ان باتوں کا ذکر ملتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام روحانی بیماریوں کے جسم پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"العجب لغفلة الحساد عن سلامة الاجساد"

"تعجب ہے کہ حاسد اپنے بدن کی سلامتی سے کیوں غافل ہوتے ہیں۔" (نہج البلاغہ ڈاکٹر صالحی۔ص ۵۰۸)

"الهم يذيب الجسد"

"غم واندوہ انسان کے بدن کو گھلا کر رکھ دیتا ہے۔"

(غرر الحکم۔ص ۶۵۴۔۳۵)

"من اطاع غضبه تعجل تلفه"

"جو شخص غیظ وغضب کی رو میں بہہ جاتا ہو اور خود پر قابو نہ رکھتا ہو اس کی موت جلد واقع ہو جاتی ہے۔"

(غرر الحکم۔ص ۶۵۴ اور ص ۳۵)

رسولِ مقبولؐ بدن کے کیمیائی افعال کے انسان کی نفسیات اور خلق وخُو پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔

"لا تميتوا القلوب بكثرة الطعام والشراب فان القلب يموت كالزرع اذا كثر عليه الماء"

"زیادہ کھا پی کر اپنے قلب کو مردہ مت کرو کیونکہ قلب کھیت کی مانند ہے جب اسے ضرورت سے زیادہ پانی دے دیا جاتا ہے تو وہ تباہ ہو جاتا

ہے۔" (نہج الفصاحہ - ص ۵۲۱)

"من تعود کثرة الطعام والشراب قسا قلبه"

"زیادہ کھانے پینے کا عادی شخص بے رحم و سنگ دل ہو جاتا ہے۔" (نہج الفصاحہ - ص ۵۷۳)

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں :

"التخمة تفسد الحكمة"

"معدے کی گرانی انسانی عقل پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔"

مشہور دانشور پروفیسر کارل کہتا ہے۔

"تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ نفسیاتی سرگرمیوں کا جسمانی نظام سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلاتِ بدن میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں نفسیاتی حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اسی طرح بعض خاص نفسیاتی کیفیات اعضاء کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ مجموعہ جو انسانی بدن اور روح پر مشتمل ہے' عضویاتی اور نفسیاتی عوامل کے اثرات قبول کرتا ہے اور خود میں تبدیلیاں لاتا ہے۔ روح اور جسم سنگِ مرمر کے مجسمہ کی مانند باہم مخلوط ہیں اور مجسمے کو توڑے یا تراشے بغیر اس کی شکل تبدیل نہیں کی جاسکتی۔

ہم جانتے ہیں کہ معدے' آنتوں اور جگر کی بیماریاں انسانی شخصیت کو کس قدر بدل ڈالتی ہیں۔ اعضاء بدن کے خلیات (CELL) ایسا رقیق مادہ ٹپکاتے ہیں جو خون میں شامل ہو کر نفسیاتی اور معنوی

سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شعوری اور فزیولوجیکل فعالیتوں کی ہم بستگی قدیم عقیدہ کے مطابق نہیں جو روح کے دماغ میں ہونے کے قائل تھے۔ درحقیقت بدن انرجی اور معنوی و نفسیاتی جوہروں سے مرکب ہے۔ جہاں تک فکروشعور کا تعلق ہے یہ بدن کے ایک حصّے یعنی دماغ کے غدودوں کی کارکردگی کا نام ہے۔ نفسیاتی مظاہر کے لئے بدن کی مدد ضروری ہے۔

ایک جملہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے ذہن اور پورے جسم کے ساتھ سوچ بچار کرتا ہے' محبت کرتا ہے' رنج والم میں مبتلا ہوتا ہے' ستائش و نیایش کرتا ہے۔" (انسان موجودِ ناشناختہ - ص ۱۵۲)

"گارڈنر مارفی" نامی ہم عصر ماہرِ نفسیات کچھ یوں اظہارِ رائے کرتا ہے۔

"ابھی گزشتہ چند دہائیوں میں یہ بات کھُل کر سامنے آئی ہے کہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ جذبات و خیالات' مثلاً محبت یا نفرت کے جذبات بدن میں ہونے والے کیمیائی ردِّعمل کی ترجمانی کرتے ہوں۔

سائیکیٹرک (Psychiatric) علمِ طب یعنی جسم و نفسیات دونوں سے مربوط علمِ طب واضح طور پر بتاتا ہے کہ بدن میں ہونے والے کیمیائی عمل یا ردعمل کا آدمی کی نفسیات پر بھی اثر پڑتا ہے اور نفسیاتی عمل یا ردِّعمل سے بدن بھی متاثر ہوتا ہے۔ آج ہم یکطرفہ طور پر صرف نامیاتی کیمیا (ORGANIC CHEMISTRY) ہی کو نفسیات پر اثر انداز قرار نہیں دے سکتے بلکہ ہمیں یہ بھی کہنا چاہئے کہ نفسیات کو بھی بدن کی کیمیکل فیکٹری کا نظام چلانے میں

دخل حاصل ہے۔ بلکہ شاید یہی ایک بات کہنی زیادہ بہتر ہو کہ نفسیات ہی بدن کا کیمیائی نظام سنبھالے ہوئے ہے۔

اس موضوع پر گہری تحقیق کرنے والے ماہرین کہتے ہیں کہ ہمارا ہمیشہ روح اور جسم کے ایک مجموعہ سے سروکار رہتا ہے۔ کبھی ہماری توجہ روحانی یا نفسیاتی پہلو کی طرف رہتی ہے اور کبھی توجہ جسمانی پہلو کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔

یہ حکم کہ "خود کو پہچانئے" قدیم ایام کی مانند آج کل غیر مادّی چیز کے بے شعور و بے جان مادّہ پر تسلط کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا اور انیسویں صدی کے مادّہ پرستوں کے اس اعتقاد کی مانند نہیں جو کہتے تھے کہ جگر کی طرح دماغ بھی ایک مادّہ چھوڑتا ہے جو فکر کہلاتا ہے۔

آج ہم انسان کے دو مادّی پہلوؤں یعنی نفسیاتی اور کیمیاوی پہلوؤں کی ہم آہنگی پر مزید تحقیقی باتیں سننے کے منتظر ہیں۔"

(راز کرشمہ ھا۔ ص ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸)

چوتھا باب

فرائض کے محور پر زندگی کی گردش

انسان اور فرائض

انسان کا خود اپنے ہم نوعوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کی ایک فطری ضرورت ہے۔ ایک اجتماعی و سماجی زندگی کی جانب میلان وہ مستقل عامل ہے جو انسان کو ایک معاشرہ کی تشکیل کی جانب راغب کرتا ہے۔

انسانی سماج گوناگوں افراد اور مختلف طبقات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اجتماعی میدان میں ہر فرد بعض فرائض وذمہ داریوں کی ادائیگی پر مامور ہے اور ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ انہیں خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرے۔

معاشرے کا نظام اسی وقت صحیح طور پر چل سکتا ہے جب ہر فرد اپنی معیّن اور قبول کی ہوئی ذمہ داریوں کو تندہی سے انجام دے اور اپنے دائرۂ وظائف سے تجاوز نہ کرے۔

حیوانی زندگی کسی قاعدے قانون کی پابند نہیں ہوتی جبکہ اس کے برخلاف انسانی زندگی مختلف مقرّرات وقیود کے اندر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی زندگی کے ہر ہر شعبے میں معیّن حدود وقیود پائی جاتی ہیں اور یہی قیود ومقرّرات انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے ممیّز ومتمایز کرتی ہیں۔

انسان کی تمام حرکات وسکنات کے لئے خاص وظائف معیّن ہیں اور یہی وہ

نظام ہے جس کے تحت انسانی زندگی چلتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ زندگی کے ابتدائی ترین مراحل سے لے کر اس کی انتہا تک وظائف وذمہ داریوں کا تسلسل پایا جاتا ہے اور کسی صورت میں انسان اور اس کی ذمہ داریوں کو جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ انسان میں جب تک ذمہ داریوں کی ادائیگی کی قوّت وسکت موجود ہو، ذمہ داریاں اس کے سنگ سنگ ہیں صرف موت ہی اس کی ذمہ داریوں سے گلوخلاصی کا ذریعہ ہے۔

مذاہب کے معیّن کردہ دستورواحکام سے قطع نظر انسان فطرتاً بھی مقرّرات کا پابند ہے۔ انسان کے اوصاف وخواص، جذبات واحساسات اور اس کی نفسانی خواہشات کے مطابق اس کے فرائض وجود میں آتے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان فرائض کو انجام دینے کا باعث بننے والے محرّکات مختلف ہوں۔

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وظائف کا محور و مرکز عقلی قوانین ہیں اور مذہبی احکام کی پیروی بھی عقلی قوانین کی متابعت ہی پر منتج ہوتی ہے۔ کیونکہ اجتماعی وسماجی مسائل کے بارے میں دینی احکام و فرامین بھی عقلی ادراکات ہی کی تشریح ہوتے ہیں۔

وظائف و فرائض سے شناسائی کوئی مشکل کام نہیں۔ فرائض پر عمل کرنا سخت مشکل اور تصوّر سے کہیں زیادہ دشوار کام ہے۔ پس بھرپور توجہ، محکم واستوار ایمان اور سخت جانفشانی کے ذریعہ اس راہ کو طے کیا جاسکتا ہے۔

معاشرہ جہاں انسانی فضائل وکمالات کی پرورش گاہ ہے وہیں ماحول بکثرت رذائل کی پیدائش کا سبب بھی ثابت ہوتا ہے۔ معاشرہ کا تکامل وہاں جاکے رکود

وجمود کا شکار ہو جاتا ہے، جہاں اس کا ہر فرد اپنے فرائض وذمہ داریوں سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور اپنی عظیم ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

ہر پودا اپنی نشوونما کے لئے خاص توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ جو چیز معاشرہ کی ترقی وتکامل کا سبب ہوتی ہے وہ اس کا جغرافیائی محلِ وقوع اور مادّی عوامل نہیں بلکہ یہ چیز خاص معنوی وتربیتی عوامل ہیں جو ایک شائستہ اور روبہ ارتقاء معاشرہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔

جس معاشرہ میں احساسِ ذمہ داری کی روح حاکم ہو وہاں پاک وپاکیزہ قلوب، نیک نیتی اور خوش رفتاری کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں نہ خیانت اور حق کشی پروان چڑھتے ہیں اور نہ ہی ان کی نشوونما کا میدان ہموار ہوتا ہے۔ بلکہ اس معاشرہ کا ہر فرد جرائم و جنایات کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

ہمیں محض اسی بناء پر تباہی وبربادی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا کہ ہم نے اپنے فرائض وذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا۔ بلکہ بہت سے لوگ جو بے شمار وسائل وامکانات کے مالک ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ انہیں صرف اپنی ذات کے لئے استعمال کریں اسی بناء پر بعض ایسی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے چشم پوشی برتتے ہیں جن کی بناء پر انہیں اپنی بعض خوشیوں اور آسائشوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنا وقت کچھ ایسے امور کی انجام دہی میں صرف کریں جن کا پھل دوسرے کھائیں۔

اس گروہ کے افراد جن کی فکر ونظر اور سرگرمیاں محدود اور فقط اپنے شخصی امور کے محور پر گھومتی ہیں اور محض یہی ان کی عادت بن جاتی ہے، وہ

کبھی بڑی اور عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر قادر نہیں ہوتے اور کسی میدان میں ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہیں آتیں اور کسی شعبہ کی نمایاں شخصیت نہیں بن پاتے۔

ایسے لوگوں کے مقابل ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنے فرائض وذمہ داریوں سے کسی صورت غافل نہیں ہوتا، زندگی کے تغیّرات و دگرگونیوں اور نشیب و فراز میں اضمحلال و اضطراب سے دوچار نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے اور اپنی تمام مساعیٔ جمیلہ کو انسانیت کے لئے سودمند کاموں میں صرف کرتا ہے، خواہ اس سلسلہ میں اسے کیسی ہی مشکلات کیوں نہ جھیلنی پڑیں۔ لہٰذا جوں جوں اس کے علم ودانش، فکر وبصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اسی تناسب سے اس کے اندر اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جانب رغبت بڑھتی جاتی ہے۔

اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے کوشش

جو چیز زندگی کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے وہ ارفع واعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے جدو کاوش ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ایک شائستہ اور انسانیت کے شایانِ شان مقام کے حصول کا عزم وارادہ رکھے اور نفس کی پرورش، وظائف وذمہ داریوں کی ادائیگی اور معاشرہ کی بے دریغ خدمت کے لئے حتیٰ الامکان تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ شیریں سخن شاعر حافظ کے بقول :-

چو غنچہ گرچہ فروبستگی است کار جہان
تو ہمچو باد بہاری گرہ گشای باش!

(اگرچہ دنیا کا کام غنچے کی طرح بند ہو مگر تو بادِ بہاری کی مانند ایسے غنچوں کی گرہ کھول کھول کر انہیں پھول بناتا رہ)

"ڈاکٹر شوائٹزر" کہتا ہے۔

"ہم اکثر لوگوں کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہیں کہ "میں اس دنیا میں عظیم کام کرنا چاہتا ہوں لیکن گوناگوں ذمہ داریوں اور پیشہ ورانہ مصروفیات نے مجھے اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ مجھے یہ توفیق حاصل نہیں ہو پا رہی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں اتنا غرق رہتا ہوں کہ زندگی کو بامقصد وبامعنی بنانے کی فرصت نہیں ملتی۔""

یہ ایک بہت عام اور خطرناک غلط فہمی ہے کیونکہ ہر انسان کے لئے گھر بیٹھے بھی لوگوں کی مدد کرنا ممکن ہے۔ اس طرح اسے روحانی سکون اور خوشی حاصل ہو گی۔ اس طرح کا اطمینانِ خاطر اور روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ انسان اپنی روز مرّہ ذمہ داریوں سے چشم پوشی کر کے کوئی بڑا کام اپنے ذمہ لے۔

ایسے کاموں کو میں "آپ کی ثانوی ذمہ داری" سمجھتا ہوں۔ جو کام آپ کو کرنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اپنی فرصت کے بے شمار لمحات کو کام میں لائیے اور اس ذمہ داری کو ادا کیجئے۔ اس طرح آپ کو بہت قیمتی لمحات میسّر ہوں گے اور آپ ایک مکمل طاقت کے مالک ہو جائیں گے۔

آج جو چیز کمیاب ہے اور دنیا جس کی محتاج ہے وہ ایسے افراد ہیں جو دوسروں کے کام آسکیں۔ ایسا کام جو دوسروں کے لئے انجام دیا جائے

اس میں خدا کی رحمت دونوں فریقوں (محتاجوں اور مددگاروں) پر نازل ہو گی۔

دورِ حاضر میں سماجی دباؤ میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ لوگوں کی شخصیت معدوم ہو چکی ہے۔ کچھ کر دکھانے اور اپنے وجود کو منوانے کی آرزو دم توڑ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی حقیقی تمدّن سے بہت دور ہیں۔ ہمارے زمانے کے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ پوری زندگی کو آنکھ بند کر کے گزارنا چاہتے ہیں اور نیکی کے جو مواقع انہیں میسّر ہیں ان کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر ہم آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئیں گے جنہیں ہماری مدد کی ضرورت ہے اور وہ کسی بڑی چیز کے محتاج نہیں بلکہ انہیں بہت چھوٹی اور معمولی چیزیں درکار ہیں۔

ہمیں دوسروں کی مدد کرتے ہوئے اپنی زندگی اور انتہائی قیمتی پونجی کو بے قیمت سمجھنا چاہئے۔ وہ معمولی رقم جو ایک بیوہ کی کل متاعِ حیات ہے اور وہ اسے انفاق کرتی ہے' ثروت مندوں کی بے شمار دولت اور تمام بخششوں پر حاوی ہے۔ بہت سے لوگ کہتے نظر آتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس روپیہ پیسہ ہوتا تو غریب غربا کی مدد کرتے' انسانیت کے لئے کام کرتے۔ ہم سب اگر چاہیں تو محبت اور ہمدردی کی دولت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے خلوصِ دل سے کسی کی مشکل دریافت کرلی اور اس کے ازالے کے لئے سرگرمِ عمل ہو گئے تو گویا ہم اپنی گرانمایا چیز یعنی محبت وہمدردی کو کام میں لائے اور دنیا کی تمام

دولت وثروت اس کے مقابل ہیچ ہے۔

ممکن ہے آپ یہ سوچتے ہوں کہ مطمئن اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے مجھے افریقہ کے جنگلوں میں سکونت اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن شاید آپ کے علم میں نہیں کہ جہاں آپ رہ رہے ہیں یہیں رہتے ہوئے بھی آپ آسودہ اور سرور آمیز زندگی بسر کرسکتے ہیں اور وہ اس طرح کہ خود کو جستجو اور کوشش پر اکسایئے اور ہزارہا محبت آمیز کارِ خیر انجام دیجئے۔ یہ روحانی عمل حوصلہ' فداکاری اور جرات کا متقاضی ہے۔ محبت جو انسان کی آزمائش کی ایک کسوٹی ہے قوی اور مصمّم ارادے کی محتاج ہے۔

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس مشکل فریضے اور "ثانوی ذمہ داری" کے ذریعہ حقیقی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔"

(کلیدھائی خوش بختی۔ص۲۶۹ اور ۲۷۷ سے بعض اقتباسات)

قوّتِ ارادی سے صحیح استفادہ

انسان آزاد ہے' خواہ اپنے ضمیر کے فرمان کو قبول کرے یا رد کردے۔ ہر شخص اپنی ذات کا آپ مالک اور صاحبِ ارادہ ہے۔ وہ چاہے تو سچائی وپاکیزگی کا انتخاب کرے' نفس پرستی اور خواہشات ومیلانات کی قید سے آزاد رہے' جوانمردی کو اپنا شعار بنائے اور ظلم وستم کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ ان صفات کا اپنانا اس کے اپنے ہاتھ میں ہے وہ چاہے تو تلاش وکوشش کے ذریعہ خود کو ان صفات سے آراستہ کرے یا اس کے برعکس انحطاط و رذالت کی راہ اختیار

کرے اور گوناگوں خواہشات کے سمندر میں غرق ہوجائے۔

قوتِ ارادی ایک آسمانی نعمت ہے۔ کبھی اسے بے مصرف نہیں چھوڑنا چاہئے یا اس سے وظائف وذمہ داریوں کی ادائیگی میں مدد لینے کی بجائے پلید اور غیرانسانی افعال کی انجام دہی میں استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ قوتِ ارادی کا فقدان اور عزمِ صمیم کی کمی وظائف وذمہ داریوں کی ادائیگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ضمیر کی رہنمائی میں شہوات وخواہشاتِ نفس کا مقابلہ کرنے کے لئے قوتِ ارادی کو کام میں لانا اور خودپرستی واخلاقی خرابیوں پر فتح یاب ہونا ابتداً ایک دشوار اور سخت محنت طلب کام ہے لیکن ارادے کی پختگی' ضمیر کی پشت پناہی اور مسلسل کوشش کے نتیجے میں انسان کی روح بتدریج طاقتور ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کے اخلاق سنورتے جاتے ہیں اور پھر فرائض پر عمل ایک معمولی اور قابلِ برداشت کام بن جاتا ہے۔

اگر احساسِ فرض قوی ہو تو انسان مشکلات اور رکاوٹوں سے نہیں گھبراتا۔ ایسی صورت میں اگر اس کی مساعی وکوشش بے نتیجہ بھی ہوجائیں تب بھی کم ازکم اس کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور وہ خود کو اپنے نفس کے مقابل سُرخرو سمجھتا ہے۔ کیونکہ بہرحال اس نے اپنے فرض کی ادائیگی میں حتیٰ المقدور جانفشانی سے کام لیا ہوتا ہے۔

ایک باپ اپنے بیٹے کو یوں نصیحت کرتا ہے۔

"بیٹا! اس بات سے فکرمند نہ ہونا کہ تو تو تنگ دست وغریب رہے اور دوسرے تیرے سامنے خیانت وفریب کے بل بوتے پر دولت مند

بن بیٹھیں۔ تو جاہ و مقام کے بغیر زندگی گزار دے' دوسروں کی پروانہ کر کہ وہ بے شرمی و بے حیائی کے ذریعہ جاہ و حشم کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ تو رنج والم اور ناکامی و نامرادی میں زندگی گزار دے' دوسروں سے صرفِ نظر کر کہ جنہوں نے خوش آمد اور چاپلوسی کے ذریعہ اپنا مقصد پالیا ہے۔

تو بزرگوں کی صحبت اختیار کر اور یہ نہ دیکھ کہ دوسرے ان کی صحبت اختیار نہیں کرتے۔ تجھے تو فضیلت و تقویٰ کا لباس ہی بھاتا ہے۔ اس وقت خدا کا شکر ادا کر اور قلبِ مطمئن کے ساتھ موت کو گلے لگالے' جب تیرے سر کے بال سفید ہو جائیں اور تیری شرافت و نیک نامی کے دامن پر ایک داغ بھی نہ ہو۔" (اخلاق، ساموئیل-۸)

جس طرح بُرائیوں کی روک تھام کے لئے سرزنش اور زجر و توبیخ سود مند ہے' اسی طرح وظائف کی ادائیگی اور کام پر آمادہ کرنے کے لئے تشویق و ترغیب کے اثر کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہو اس قوم و ملّت پر جس میں جنایتکاروں کو تشویق دی جاتی ہو اور خدمت گزاروں اور وظیفہ شناسوں کو اہانت و سرزنش کا نشانہ بنایا جاتا ہو۔ انہیں حساس اجتماعی و سماجی مقامات سے راندۂ درگاہ کر دیا جاتا ہو اور فریب کاری و دھوکا دہی میں طاق افراد اپنی مُراد پالیتے ہوں۔ اور ایسے لوگ منزلِ مقصود حاصل کر لیتے ہوں جو انسانی اقدار سے سراسر بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور بالآخر جو لوگ اپنی انسانی ذمہ داریوں کی ادائیگی چاہتے ہیں وہ اس وقت تک تمام چیزوں سے محروم رہتے ہیں جب تک اپنی پاک وپاکیزہ زندگی میں رہیں۔ لٰہذا ایسے معاشرہ میں کبھی اخلاق و فضیلت پروان نہیں

چڑھ سکتے۔

ظاہر ہے ایسے معاشرہ میں بُرائیوں اور ریاکاریوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور بڑے اخلاق و تباہکاریاں تیزی کے ساتھ پاکیزگی و شائستہ اخلاق کی جگہ لے لیں گی۔ کیا عجب کہ ایسے پاکیزہ لوگ جو اس جانکاہ ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہوں پاکیزگی و تقویٰ کی راہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں کیونکہ ان حالات میں اپنے ایمان کی حفاظت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایک عام آدمی پرورش کے لئے معاشرہ کا محتاج ہے اور معاشرہ میں ایسے مثالی نمونوں کا محتاج ہے جن کی زندگی نمونہ عمل ہو۔

فرض شناسی کے سلسلے میں ایمان کا کردار

احساس ذمہ داری اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط وظائف و فرائض کی بجا آوری' فرد و اجتماع کی سعادت کی اہم ترین بنیاد ہے۔ اسلامی تربیت کی بنیاد بھی احساسِ ذمہ داری اور اس کی انجام دہی پر استوار ہے۔

ہر مردِ مسلمان کو اپنی زندگی میں سعادت و خوش بختی کے حصول کے لئے صرف اور صرف ایمان و عمل پر تکیہ کرنا چاہئے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنے گرانقدر کلمات میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں وظائف و ذمہ داری کی وسعت کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"اعلم رحمک اللہ' ان للہ علیک حقوقاً محیطة بک فی کل حرکة تحرکتھا اوسکنة سکنتھا او

منزلة نزلتها او جارحة قلبتها او آلة تصرفت بها بعضها اکبر من بعض"

"خدا تمہیں اپنی بے پایاں رحمت میں شامل کرے! جان لو کہ خداوندِعالم کی جانب سے تم پر بعض حقوق و فرائض عائد کئے گئے ہیں یہ حقوق اس قدر کثرت سے ہیں کہ تمہارے تمام کردار و عمل کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ تم سے سرزد ہونے والی ہر حرکت و جنبش اور تم پر عارض ہونے والی ہر حالت اور ہر اس مقام پر جہاں تم جاتے ہو اور بالآخر تمام اعضاء و جوارح پر جو تمہارے ارادے و اختیار کے پابند ہیں یہ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ہر چند ان فرائض میں سے بعض' بعض کے مقابلہ میں فضیلت رکھتے ہیں۔"

(تحف العقول طبع جدید - ص ۲۵۵)

اسلام میں ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے اور کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا قرآنِ مجید اعلان کرتا ہے کہ۔

"من اهتدٰی فانما یهتدی لنفسه ومن ضل فانما یضل علیها ولا تزر وازرة وزر اخرٰی"

"جو شخص بھی ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۱۵)

ہر انسان کے وجود کی گہرائیوں میں ایک ایسی قوّت موجود ہے جو اسے اپنے فرائض انجام دینے اور اپنی ذمہ داریاں نبھانے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ جب

انسان اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے قدم بڑھاتا ہے تو یہ اندرونی قوت اس کی تائید کے لئے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور فریضہ کی بجا آوری کے بعد اسے مسرّت و انبساط سے سرشار کر دیتی ہے۔

یہ غیر مرئی قوت ضمیر ہے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں سے اٹھ کر اسے نیکیوں کی انجام دہی اور بُرائیوں کو ترک کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ تصور کر کے کہ محض ضمیر ہی وظائف و فرائض کی انجام دہی کا ضامن ہے خود کو مذہبی تعلیمات کی پیروی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔ درحقیقت یہ تصوّر غلط ہے کیونکہ اس کے باوجود کہ ضمیر انسانی سعادت کے حصول میں ایک موثر کردار ادا کرتا ہے لیکن پھر بھی فقط وہ انسان کو انحراف و سقوط سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ اس سلسلہ میں اگر ہم سب سے پہلے ضمیر کے میدانِ عمل اور اس کی فعالیت کے دائرے پر توجہ دیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ کسی ایک ہی موضوع میں ضمیر کے احکام مختلف اقوام و ملّل کی عادات و رسوم اور زمان و مکان کے تفاوت کی نسبت سے مختلف ہوتے ہیں۔

ضمیر اپنی فعالیت کے دوران ان امور کی دعوت دیتا ہے اور ان ہی کو پسندیدہ قرار دیتا ہے جن کے صحیح ہونے کی پہلے ہی کسی قوم کے عرف و عادات اور سنّتِ اجتماعی تصدیق کر چکے ہوں۔ ہر چند کہ یہ عمل ناپسندیدہ ہو اور کوئی دوسری قوم اسے مذموم سمجھتی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخِ بشریت کے بعض ادوار میں انسانوں نے اپنے مذموم اور شرم آور ترین اعمال کو پسندیدہ اور صحیح اعمال کا نقاب پہنانے کی کوشش کی ہے اور انہیں نیک اعمال کے بطور پیش کیا

قرآنِ مجید اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے۔

"قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا' الذين ضل سعيهم فى الحياة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا"

"اے نبی ان سے کہئے کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون لوگ ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کررہے ہیں۔"

(سورۂ کہف ۱۸ آیت ۱۰۳' ۱۰۴)

"ولكن قست قلوبهم وزين لهم الشيطان ما كانوا يعملون"

"ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کردیا ہے۔" (سورۂ انعام ۶۔ آیت ۴۳)

علاوہ ازایں ضمیر ایک موثر پشت پناہ اور تکیہ گاہ کے بغیر نفسانی خواہشات کی تند موجوں کے مقابلہ کی صلاحیت سے عاری ہے اور غرائز و میلانات سے لڑتے ہوئے ہربار اس کی قوّتِ مدافعت میں کچھ نہ کچھ کمی واقع ہوجاتی ہے' اور ممکن ہے کبھی بے مہار خواہشات کا پہلا ہی حملہ اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے' نفس کی فریب کاری جو حقائق کو دبا دینے پر قادر ہے' ضمیر کو بھی فریب دے دے اور انسانی باطن میں جلنے والا یہ چراغ خاموش ہو جائے۔

ضمیر کی مذکورہ تکیہ گاہ ایمان ہے۔ جو قوموں کی عادات و رسوم پر حاکم ہے

اور ہرگز ملتوں کے عُرف و سنن کے اجراء پر مامور نہیں۔ جس کسی کے باطن میں فطرتِ توحید بیدار ہو جائے اور خداوندِ عالم پر ایمان کی شمع روشن ہو جائے وہ مکمل توجہ کے ساتھ ضمیر کی آواز پر کان دھرے گا اور اس کے احکامات کی پیروی کو خداوندِ عالم کی ہدایتِ تکوینی کی اطاعت سمجھے گا۔ ایسے لوگوں کو فرائض و ذمہ داریاں نہ صرف سنگین بوجھ محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ادائیگی سے انہیں مسرّت و نشاط حاصل ہوتی ہے اور وہ نہایت عشق و علاقہ کے ساتھ اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے لپکتے ہیں۔

جہاں ضمیر اور نفسانی خواہشات کے درمیان جنگ اور مقابلہ کی کیفیت نہ ہو' وہاں ضمیر کے فرمان کی پیروی آسان ہو جاتی ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ضمیر کے فرمان کی اطاعت کسی نفسانی خواہش کو دبانے سے مشروط ہو۔ جب ضمیر کو ایمان اور دینی عقیدے کی پشت پناہی وسہارا نہ ہو تو اکثر اس پر خواہشات کی قوّت جو تباہی و بربادی کی وسیع صلاحیت کی حامل ہے مُسلّط ہو جاتی ہے اور عملاً انسان غرائز و خواہشاتِ نفس کے قابو میں آجاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو دی جانے والی ہر وہ دعوت جس کا سرچشمہ خدا پر ایمان نہ ہو خارجی دنیا میں بے مفہوم ہے۔ اسلام کی دعوت جو خارج میں عمل میں آئی' روئے زمین پر جس کے جلوے ہویدا ہوئے اور جس نے تاریخِ انسانیت میں درخشاں باب رقم کئے مبداء تشریع کی جانب روح کی رہنمائی' سعادتِ انسانی کے اعلیٰ افق اور لامتناہی ذاتِ باری تعالیٰ سے دلوں کے ارتباط کے ذریعہ وجود میں آئی' وگرنہ آدمی خشک انسانی دعوت کو کسی حال میں قبول نہ کرتا اور ہر قسم کی شرائط و حالات میں اس منطق کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں

کرتا اور جب یہ تعلیمات اس کی خواہشات و تمایلات سے ٹکرانے لگتیں تو وہ ان تعلیمات کو پیروں تلے روند کر اپنی خواہشات کی اتباع شروع کر دیتا۔

"لی کینٹ ڈونائی" کہتا ہے کہ۔

"بعض بے دین افراد جو فطرتاً بااخلاق ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ کیونکہ بنیادی مشکل اخلاقی قوانین کی پیروی ہے اس لئے اگر ہم ان قواعد کے پابند ہو جائیں تو مذہب کے محتاج نہیں رہیں گے۔ ان کا یہ کہنا ان کے انسانی نفسیات سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ انسان ان قواعد و اصولوں کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہوتا ہے جن کے سرچشمہ کا اُسے علم نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرزِ تفکر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مسئلہ کی گہرائی تک نہیں پہنچے ہیں۔ کیونکہ مقصود یہ ہے کہ انسان باطنی طور پر مکمل ہو جائے تاکہ اس کا طرزِ فکر اخلاقی بن جائے، مقصد یہ نہیں کہ انسان کو اخلاقی حرکات و عمل پر اکسایا جائے۔ جب تک انسان کی رفتار و عمل اس کے باطنی تکامل کی آئینہ دار نہ ہو اس کے اعمال مصنوعی پابندیوں کا ایک سلسلہ قرار پائیں گے اور وقتی و عارضی ہوں گے اور اس طرح کے مُسلّط شدہ اخلاقی قوانین کے اثرات ہر چند کہ قابلِ قدر ہوں گے لیکن وہ کسی وقت بھی حیوانی محرکات کے زیرِ اثر آکر ختم ہو جائیں گے۔"

(سرنوشتِ بشر۔ص ۲۱۶)

جی ہاں یہ ایمان ہے جو زندگی کے حسّاس ترین لمحات میں ناجائز خواہشات کی طاقت سے ٹکر لیتا ہے اور ضمیر کی حمایت و پشت پناہی کرتا ہے۔ اور وہ

باایمان حضرات جن کے دل عشقِ خدا سے لبریز ہوتے ہیں اس معنوی قوّت کی پشت پناہی کے ہوتے ہوئے حسّاس مواقع پر اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنی انتھک محنت و کوشش کے ذریعہ اپنے مقدّس فرائض کو ایمان اور حکمِ الٰہی کے بطور انجام دیں۔

مشہور مغربی ماہرِ نفسیات "ولیم جیمز" (William James) کہتا ہے کہ:

"ایک شخص ہے جو محض اخلاق کا قائل ہے ان کُلّی قوانین کی جنہیں وہ کائنات پر حاکم سمجھتا ہے علم و آگاہی کی رو سے اطاعت کرتا ہے۔ لیکن اس اطاعت کے دوران وہ ایک قسم کا بوجھل پن اور ملال محسوس کرتا ہے، اس کے قلب میں کسی قسم کی حرارت اور عشق و شوق موجیں نہیں مارتا اور کسی وقت یہ احساس اس سے جدا نہیں ہوتا کہ یہ قوانین ایک ایسے طوق کی مانند ہیں جو ہمیشہ اس کی گردن میں پڑا رہے گا۔

اس کے برعکس اگر اس اطاعت کا سرچشمہ ایمان و مذہب ہو تو اس سرد اور غم انگیز اطاعت کی جگہ پُرجوش، پُرلطف، پُراخلاص اور نشاط آور اطاعت لے لیتی ہے۔

مذہب اور ایمان سے عاری تمام اخلاقی اصول و قواعد عین زخم پر رکھے ہوئے اس پھائے کی مانند ہیں جس پر مرہم نہ لگا ہو۔"

(دین و روان از ولیم جیمز۔ص ۱۹)

لقمان حکیم کا ایک درس

آئیے آیاتِ قرآنی کے ذریعہ لقمان حکیم کے حکمت و نصیحت سے پُر ان کلمات کا مطالعہ کریں جو انہوں نے بطورِ نصیحت اپنے فرزند سے ارشاد فرمائے۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا اور اپنے کلمات کے ذریعہ تمام انسانوں کے وظائف و ذمہ داریوں کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ ذیل میں ہم ان چار حصّوں کو نکتہ وار بیان کرتے ہیں۔

(۱) انسان کے ذمّہ خدا کا حق

"واذ قال لقمان لابنہ وھو یعظہ یا بنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم"

"اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خبردار کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔" (سورۂ لقمان ۳۱- آیت ۱۳)

(۲) انسان کے ذمّہ والدین کا حق

"ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ وھنا علیٰ وھن وفصالہ فی عامین ان اشکر لی ولوالدیک الی المصیر"

"اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے بارے میں نصیحت کی ہے کہ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ سہ کر اسے پیٹ میں رکھا ہے اور اس کی دودھ بڑھائی بھی دو سال میں ہوئی ہے۔ کہ میرا اور اپنے والدین کا شکریہ ادا

کرو کہ تم سب کی بازگشت میری ہی طرف ہے۔"

(سورۂ لقمان ۳۱- آیت ۱۴)

یہ آیت حضرت لقمان کا قول نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں لقمان کی طرف سے اپنے بیٹے کو والدین کے حقوق بیان نہ کرنے کی مصلحت یہ رہی ہو کہ لقمان خود مقامِ پدری پر فائز تھے لہٰذا والدین کے عزّت واحترام اور ان سے شکرگزاری کے برتاؤ کی تاکید خود اپنی جانب سے کرنا انہیں پسند نہ آیا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں بالکل یوں محسوس ہوتا جیسے لقمان اپنے فرزند کو خود اپنے ادب و احترام اور سپاس گزاری کی تاکید کر رہے ہوں اور یہ بات لقمان کی بزرگی، اعلیٰ منزلت و مقام اور عقل و بصیرت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس فریضہ کی یاددہانی اپنے فرزند پر ایک طرح کا احسان سا جتانا محسوس ہوتی لہٰذا حضرت لقمان نے والدین کے حقوق کی بابت اپنی جانب سے کچھ نہ کہا بلکہ خداوندِ عالم نے والدین کے جن حقوق کی تاکید کی ہے وہ اپنے فرزند کے گوش گزار کر دیئے۔ کیونکہ خداوندِ عالم کے یہ فرامین تمام فرزندوں کے لئے ہیں اور حضرت لقمان کا بیٹا بھی کیونکہ ان میں سے ایک ہے بنابرایں ان فرامین کی بجا آوری اس پر بھی فرض ہے۔

(۳) انسان کے ذمّہ افرادِ معاشرہ کے حقوق

"یا بنی اقم الصلاۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابک ان ذالک من عزم الامور"

"بیٹا نماز قائم کرو، نیکیوں کا حکم دو، برائیوں سے منع کرو اور اس راہ

میں جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو کہ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔" (سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۷)

"ولا تصعر خدک للناس ولا تمش فی الارض مرحاً ان اللہ لا یحب کل مختال فخور"

"اور خبردار منہ نہ پھلا لینا اور زمین پر غرور کے ساتھ نہ چلنا کہ خدا اکڑنے والے اور مغرور کو پسند نہیں کرتا۔"

(سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۸)

(۴) انسان کے ذمّہ خود اپنا حق

"واقصد فی مشیک واغضض من صوتک ان انکر الاصوات لصوت الحمیر"

"اور اپنی رفتار میں میانہ روی سے کام لینا اور اپنی آواز کو دھیما رکھنا کہ سب سے بدتر آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔"

(سورۂ لقمان ۳۱ ۔ آیت ۱۹)

عبادت اور فرض شناسی کے مراتب

مختلف افراد کی ذہنی استعداد مختلف ہونے اور ان کے مابین فہم اور ادراک کے مراتب میں فرق کی بناء پر پیشوایانِ اسلام نے لوگوں کو مختلف عبارات و کلمات کے ذریعہ اپنے فرائض کی بجاآوری کی تاکید کی ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کا خاصہ ہے کہ ہر فرد خواہ وہ بے سواد ہو، کم سواد ہو یا عالم وفاضل، وہ اسلام کے پیغام سے مستفید ہو سکتا ہے اور ان ہدایات سے بہرہ مند

ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایسے لوگ جو ہر معاملہ کو فائدہ اور تجارت کی نظر سے دیکھتے ہیں انہیں بہترین تجارت کی نوید دیتا ہے۔

دوسرے لوگ جو کامیابی اور لذّات کو ترجیح دیتے ہیں انہیں بہشت کی کامیابیوں اور بے پایاں لذات کے ذریعہ ترغیب دی گئی ہے۔ ایک اور گروہ کو عذابِ جہنم سے ڈرایا گیا ہے۔

بدیہی بات ہے کہ اکثر افراد گہرے معنی ومفاہیم کے ادراک کی صلاحیت سے عاری ہیں، ان کی نظر میں کوئی اعلیٰ وارفع ہدف بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو وظائف وفرائض کی ادائیگی اور پسندیدہ اخلاق اپنانے پر آمادہ کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ انسانی طبیعت طاقت و توانائی کے برخلاف ضعف وکمزوری سے بھرپور ہے اور بہت کم افراد اپنی زندگی میں عمل کی خوبی اور اعلیٰ اہداف کی جانب توجہ دیتے ہیں اور اکثر لوگوں کے اچھے اخلاق اور اعلیٰ انسانی فضائل سے آراستہ ہونے کا محرّک وسبب ان کے نتیجے میں ملنے والا اجر وثواب ہوتا ہے۔

بطورِ کُلّی ادیانِ آسمانی کی سریع پیش رفت اور لوگوں کے دلوں میں ان کے نفوذ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مذاہب انسانوں کے بنائے ہوئے ضوابط وقوانین کے برخلاف گناہ ومعصیت سے پرہیز کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیمات میں گناہوں سے پرہیز کا نتیجہ نہ صرف عذاب سے نجات قرار دیا گیا ہے بلکہ ثواب کا حصول اور پاداشِ نیک کی نوید بھی دی گئی ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر اپنے کاموں کے نتائج وعواقب کے بارے میں بہت حسّاس ہوتا ہے اور ثمر رساں نتائج اسے وظائف وفرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتے ہیں۔

خداوندِ عالم کی اطاعتِ مطلق اور جزا و سزا کو ملحوظ رکھے بغیر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے بارے میں وارد ہونے والی بعض روایات ان افراد سے مخصوص ہیں جو باری تعالیٰ کی لامتناہی معرفت کے حامل ہیں۔ ایسے مردانِ راستین جو اخلاص کے بلند ترین مراتب پر فائز ہوں' اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران صرف اطاعتِ پروردگار اور اس کی رضا و خوشنودی کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ ایسے مخلص بندگانِ خدا کو روایات میں "مردانِ آزاد" کہا گیا ہے۔ جبکہ وہ لوگ جو اجر کے لالچ میں فرائض انجام دیتے ہیں انہیں "تاجر" اور جو عذاب کے خوف سے عبادت کرتے ہیں انہیں "غلام" کا نام دیا گیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان قوما عبدوا اللّٰہ رغبۃ فتلک عبادۃ التجار' وان قوما عبدوا اللّٰہ رھبۃ فتلک عبادۃ العبید' وان قوما عبدوا اللّٰہ شکرا فتلک عبادۃ الاحرار"

"بے شک ایک گروہ خدا کی پرستش کرتا ہے حصولِ اجر کے لئے' یہ تاجروں والی عبادت ہے۔ ایک دوسرا گروہ خوف کی وجہ سے اس کی عبادت کرتا ہے' یہ غلاموں کی عبادت ہے نیز ایک گروہ ایسا ہے جو اس کی عبادت اداء شکر کی نیت سے بجالاتا ہے تو یہ آزاد منشوں کی عبادت ہے۔" (نہج البلاغہ' کلمات قصار نمبر ۲۳۷)

معروف برطانوی مفکر "آوی بری" نے اس بارے میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ مذکورہ بالا روایت کے مفہوم سے مماثلت رکھتا ہے۔ کہتا ہے۔

"جس شخص کی روح خدا کی دوستی سے لبریز ہو وہ بے اختیار اس کی

ستائش و پرستش کرتا ہے۔ وہ خدا کی عبادت محض خدا کے لئے کرتا ہے نہ ثواب کی امید میں اور نہ عذاب کے خوف سے۔ جو شخص ثواب کی امید میں یا عذاب کے خوف سے نیک کام انجام دیتا ہے اور گناہوں سے پرہیز کرتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ فخر کرے اور دوسروں پر اپنا زہد جتائے۔ اس قسم کے لوگوں کو مردانِ خدا کی صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ تاجر ہیں جو سود و زیاں کو مدِ نظر رکھ کر کام کرتے ہیں اور وہ مزدور ہیں جو اپنے معاوضہ کی امید میں محنت کرتے ہیں۔

اگرچہ اس طرح کی عبادت بھی قابلِ تعریف ہے اور ان لوگوں کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے جو نادانی میں خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے کے مرتکب ہو رہے ہیں' مسلسل اپنی روح کو گناہوں سے سیاہ کر رہے ہیں اور کسی صورت خداوندِ عالم کی عبادت و پرستش پر آمادہ نہیں' ان عبادت گزاروں کو اچھے اور نیکوکار لوگوں کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے جو محض اجر و ثواب کی امید میں نیک اعمال انجام دیتے ہیں اور گویا مزدوروں کی سی عبادت بجالاتے ہیں۔

لیکن بلا تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس سبب سے یہ لوگ نیکوکاروں کی صف میں شامل ہونے کے حقدار ہوئے ہیں وہ نہایت معمولی اور چھوٹی وجہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ اس مرحلہ پر اپنی نظر بلند کریں اور خدا کی صرف اس لئے عبادت کریں کہ وہ لائقِ عبادت ہے۔

کتنا اچھا ہو کہ ہم بھی دین کی راہ میں ان ہی اربابِ ہنر کی مانند ہو جائیں، اپنی روح کو مادّی خواہشات کی آلائشوں سے پاک وصاف کریں اور خدا کی پرستش سے ہمارا مقصد سوائے جمالِ ابدی کی تقدیس و تمجید کے اور کچھ نہ ہو۔ یہی وہ دینِ حقیقی ہے جس کے ذریعہ ہماری روح کمال کی بلندیوں کو چھو سکتی ہے۔"

(در جستجوی خوش بختی۔ ص۲۲۸)

جس قدر کسی شخص کا خدا پر ایمان مضبوط ہو گا، اسی نسبت سے اس کے اعمال میں اخلاص کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تمام خواہشات پر خوشنودیٔ خدا کا حصول حاوی ہو جاتا ہے اور دوسری تمام وابستگیاں پسِ پشت چلی جاتی ہیں اور وہ ہر نیک عمل ہر قسم کے خوف و ہراس اور اجر و پاداش سے بے نیاز ہو کر بجالاتا ہے۔

ایسے افراد اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں، ان کی روح بلند اور عالی مرتبہ ہوتی ہے اور اس قدر عظیم قدر و منزلت کے مالک ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔

حضرت علی علیہ السلام فرضِ بندگی کے موضوع پر اپنے معبود کے حضور کچھ یوں عرض کرتے ہیں کہ۔

"ماعبدتک خوفاً من نارک ولا طمعاً فی جنتک، لکن وجدتک اهلا للعبادة فعبدتک"

"پروردگارا! میں نے تیری عبادت جہنم کے خوف سے یا بہشت کی لالچ میں نہیں کی بلکہ میں نے تیری عبادت اس لئے کی ہے کہ تجھے

عبادت کے لائق پایا۔" (نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر۲۹۰)

قرآنِ کریم حضرت سلیمان کے کلمات یوں بیان کرتا ہے کہ۔

"رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحاً ترضیه"

"پروردگار مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہے اور ایسا نیک عمل انجام دوں کہ تو راضی ہو جائے۔" (سورۂ نمل ۲۷۔ آیت ۱۹)

توجہ رہے کہ اسلام میں عبادت محض ان دقائق تک محدود نہیں جن میں انسان کسی خاص رسم کی ادائیگی میں مشغول ہو۔ بلکہ اسلام کی نظر میں عبادت کا مفہوم نہایت جامع اور زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اور راہ و رسمِ زندگی کی صورت میں پوری حیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ پرستش سے لے کر اندیشہ و ادراک اور روزمرّہ کے امور تک، اگر ان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو تو وہ عبادت ہیں۔

دوسرے لفظوں میں عبادت ایک عظیم اور بنیادی قاعدہ ہے جس پر پوری زندگی کے طرز و آئین کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ وگرنہ مراسم و مظاہر چنداں حیثیت کے حامل نہیں۔ انہیں اہمیت و ارزش اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسانی زندگی سے مربوط تمام رفتار و کردار اس بنیاد پر استوار ہوں اور انسان نہ صرف زبان سے بلکہ اپنے عمل سے اس بات کی گواہی دے کہ خالقِ کائنات باری تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت و پرستش کے لائق نہیں۔

اسی طرح اسلام کی منطق میں عبادت کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ فرائض

کی ادائیگی کے وقت تو انسان کا قلب پاکی و تقویٰ سے لبریز ہو لیکن جوں ہی فریضہ ختم ہو اس کے نفس پر ناپاکیاں اور رذائل مسلط ہو جائیں، اس کی تمام خوبیاں سلب ہو جائیں اور وہ حق و عدالت کے اجراء سے سبکدوش ہو جائے۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو ایسے عبادت گزار کا قلب ہرگز خدا سے متصل نہ تھا اور وہ ایسے سرگرداں مسافر کی مانند ہے جو مقصد و ہدف کی جانب راستہ طے کرنے سے عاجز ہے۔

قرآنِ مجید اعلان کرتا ہے کہ۔

"لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملائکة والکتاب والنّبیّن واتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسایلین وفی الرقاب واقام الصلاة واتی الزکوة والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساءِ والضّرّاءِ وحین الباس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون"

"نیکی یہ نہیں ہے کہ اپنا رخ مشرق و مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی اس شخص کا حصّہ ہے جو اللہ اور آخرت، فرشتوں اور کتاب پر ایمان لے آئے اور محبتِ خدا میں قرابتداروں، تیمیوں، مسکینوں، غربت زدہ مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کی آزادی کے لئے مال دے اور نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے اور جو بھی عہد کرے

اسے پورا کرے اور فقر و فاقہ میں اور پریشانیوں اور بیماریوں میں اور میدانِ جنگ کے حالات میں صبر کرنے والے ہوں تو یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان واحسان میں سچے ہیں اور یہی صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگار ہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۷۷)

اسلامی تربیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر وقت اور مسلسل انسان اور خدا کے درمیان اٹوٹ رابطہ برقرار رہے۔ انسان ہمیشہ اس یقین سے سرشار رہے کہ صرف خدا ہی وہ مرکز ہے کہ جس سے ہر امر کے بارے میں رجوع کیا جانا چاہئے اور زندگی کے تمام لحظات و اثنات میں اسی کے فرامین و دستورات اور قوانین پر عمل کرنا چاہئے۔

انسان اور خدا کے درمیان یہی وہ زندہ و رسا بندھن ہے جس کے ہوتے ہوئے ہر چیز کامل و تمام اور جس کے بغیر ہر چیز لغو و کھوکھلی ہے اور تمام اخلاق فضائل اور خوبیوں کا ماخذ یہی ربط ہے۔

بے شک جن فضائل کا سرچشمہ خداوندِ عالم کی ذات پر اعتقاد اور اس کے ابدی و اساسی قانون ہوں، حقیقتاً وہی واقعی انسانی فضائل ہیں لیکن اگر کسی کی تربیت کی اساس ذاتِ باری پر عقیدہ اور ربّ العالمین کے عطا کردہ قوانین پر استوار نہ ہو تو اس سے حقیقی انسانی فضائل کے ظہور کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

پانچواں باب

آرام و سکون کا سرچشمہ کہاں ہے؟

زندگی کا پُرشور سمندر

زندگی ایک موجیں مارتے متلاطم سمندر کی مانند ہے جس کے حوادث کی لہریں ہمیشہ زیر و بم کا شکار رہتی ہیں۔ کوئی شخص اس گہرے سمندر میں اٹھنے والے مصائب کے طوفانوں سے امان میں نہیں۔ اس دنیا میں لذّات والم منفی اور مثبت طاقتوں کی مانند ہمیشہ ساتھ ساتھ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ مسرّت وشادمانی کے سنگ غم واندوہ اور جوانی ونشاط کے ہمراہ پیری و ناتوانی ہے۔

جو شخص پانی میں جائے گا لازماً اس کا دامن تر ہو گا اُسی طرح جو زندہ ہے وہ مصائب و آلام سے بھی دوچار ہو گا۔ لہٰذا زندگی کی طویل راہوں میں انسان کو ناگوار حوادث، ناکامیوں، محرومیوں، اعزّاء کی جُدائی اور بہت سی دوسری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کون ہے، جسے زمانہ کے شیشے سے زخم نہ آئے ہوں؟ وہ کون ہے، حوادث کے لپکتے شعلوں نے جس کا دامن نہ چھوا ہو؟ یہ ضرور ہے کہ دشواریوں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے لیکن بنیادی طور پر مشکلات زندگی کے ہر دور میں انسان کے ہم قدم ہیں۔

مسلّمہ بات ہے کہ عصرِ حاضر کی مانند کسی دور میں رفاہ و آسائش کے اسقدر سامان انسانی دسترس میں نہ تھے۔ نیز انسان جس قدر آج فطرت کی پیچیدگیوں

سے آگاہ ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا اور زندگی کے نامساعد عوامل کبھی آج کی طرح اس کے قابو میں نہ تھے۔

آج کا متمدن انسان علم ودانش کی مدد سے اور ٹیکنالوجی کی قوت کے بل بُوتے پر فطرت کی مختلف قوتوں کو رام کر کے اپنی بہت سی مشکلات پر قابو پا چکا ہے۔ لیکن آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی علمی ترقی، اس قدر عظیم الشان کامیابیوں اور زندگی گزارنے کے بہترین وسائل فراہم کر لینے کے باوجود نہ صرف انسان سعادت و کامیابی کی بنیاد "آسودگیٔ خاطر" سے محروم ہے بلکہ ہر روز اپنے ہدفِ مطلوب یعنی ایک خوشگوار اور فطری زندگی سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے اور رنگارنگ مادّی زندگی بھی اس کے لئے اطمینان بخش و سعادت آفرین ثابت نہیں ہو سکی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر ترقی یافتہ اقوام نے جس قدر سائنسی، صنعتی اور اقتصادی ترقی کی ہے اور رفاہ و آسائش کی جتنی سہولتوں سے وہ بہرہ مند ہیں اسی تناسب سے ان میں نفسیاتی بیماریاں بھی روبہ افزائش ہیں۔ حد یہ ہے کہ یہ امراض وہاں اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ ماہرینِ نفسیات کی فوجِ ظفر موج بھی کم پڑ رہی ہے۔

ڈاکٹر "اے شنائیڈر" لکھتے ہیں۔

"انسان کی بدبختی میں سب سے بڑا ہاتھ کس چیز کا ہے؟ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا جواب یہ ہے کہ .....وہ چیز ایک بہت پُرانی بیماری ہے۔ اگر آپ اس کے بارے میں سوچیں گے تو شاید معمولی سے خوفزدہ ہوں، کیونکہ ہزاروں ایسی بیماریاں ہیں جن کے خطرے سے

انسان دوچار ہے اور پھر ان میں سے ہر بیماری کی اپنی نوسو ننانوے شاخیں ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ڈاکٹروں سے رجوع کرنے والے پچاس فیصد افراد اس بیماری کا شکار ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔

نیواورلئن کے "اوکسنر" کلینک میں مستقل آنے والے پانچ سو مریضوں کے متعلق ایک رپورٹ تیار کی گئی جس کے نتائج کے مطابق ان میں سے ستّر فیصد مریض اسی بیماری کا شکار ہیں اور ہر سِن وسال اور ہر دورِ حیات کے افراد اس مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازایں اس مرض کا علاج وحشت ناک حد تک گراں ہے۔

میں اس بیماری کا نام جلد بتانے سے جان بوجھ کر گریز کر رہا ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے اس طرح آپ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔ اس بیماری کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ معمولاً اسے اعصابی بیماری کے نام سے پکارتے تھے اب اسے نفسیاتی بیماری کہا جاتا ہے۔ ہم اس مفہوم میں اسے بیماری نہیں سمجھتے کہ انسان خود کو مریض سمجھنے لگے اور رنج وغم کا اظہار کرنے لگے۔

یہ بیماری بدن میں جراثیم داخل ہو جانے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ روز مرّہ زندگی میں پیش آنے والے حالات وحوادث کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کبھی انسان تہ بہ تہ وسوسوں' اندیشوں' دشواریوں اور پریشانیوں تلے دبا ہوتا ہے اور ان سے نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں

دیتی تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

(کلید ھائی خوش بختی - ص ۲۸۵)

فرائڈ کہتا ہے۔

"وحشی انسان' متمدن انسان سے بہتر انداز میں اپنی منزلِ مراد پالیتا تھا۔ تشویش و روحانی اضطراب سے بھی محفوظ رہتا تھا اور نفسیاتی امراض میں بھی مبتلا نہ ہوتا تھا۔ لیکن صنعت وتمدّن کے ظہور کے ساتھ ہی اور اس وقت سے جبکہ انسان نے شہروں میں سکونت اختیار کی ہے اس پر نفسیاتی بے چینی نے شدت کے ساتھ یلغار کی ہوئی ہے۔" (رواں شناسی در خدمتِ سیاست - ص ۱۳۱)

روحانی اضطراب کے اسباب

انسانوں میں نمودار ہونے والی پریشانی واضطراب کا ایک سبب ان میں پائی جانے والی زیادہ طلبی کی حس ہے۔ جن معاشروں میں لوگوں کی فکر کا محور مادّیات ہوں اور جہاں کامیابی وناکامی کا معیار مال ودولت اور ناپائیدار لذّتیں ہوں اور ہر شخص محض انہی کے حصول کے لئے مصروفِ عمل ہو تو وہاں زندگی لازماً کرب والم سے عبارت ہوگی۔ کیونکہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی محنت ومشقت کرلے' اپنی بے پایاں خواہشات کے حصول پر قادر نہیں اور اس کی تمام آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں۔

اس کے ساتھ ساتھ بعض مواقع پر انسانی خواہشات ومقاصد کے حصول کی راہ میں طاقتور رکاوٹیں بھی حائل ہو جاتی ہیں جن کو عبور کرنا انسان کی طاقت

سے باہر ہوتا ہے' جس کے نتیجے میں وہ وسواس واضطراب سے دوچار ہو جاتا ہے اور فکری انتشار اس کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اضطراب کا ایک اور سبب یہ ہے کہ انسان کی دل بستگی ایسی چیزوں کے بارے میں ہوتی ہے جو جلد زوال وفنا کا شکار ہو جانے والی ہوتی ہیں لہٰذا اپنی پیاری چیزوں کو فنا کے گھاٹ اترتے دیکھنا اس کی پُر تلاطم زندگی کو سکون نہیں لینے دیتا یوں انسان ہمیشہ خوش بختی وکامیابی کے احساس سے محروم رہتا ہے۔

روح کو رنج وجانکاہی سے دوچار کرنے والا ایک اور بڑا عامل نابودی اور فناء مطلق کا اندیشہ ہے۔ جب انسان یہ فرض کر لیتا ہے کہ موت اس کی انتہا و اختتام اور اس کی نابودی وفنا کا نکتہ آغاز ہے تو نیستی کا وحشت ناک ہیولہ اس کی روح کو پژمردگی اور تاریکی کا اسیر کر دیتا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی زندگی کی تمام رنگینیاں بھی تلخ وناگوار محسوس ہونے لگتی ہیں۔ خاص طور پر آخر عمر میں یہ نفسیاتی دباؤ اور یاس وناامیدی اسے رنج والم کے شکنجہ میں جکڑ لیتے ہیں۔

رنج وغم' کرب واذیت' ہر چیز کے فنا ہو جانے کا اندیشہ اور اپنی موت کا خوف آخر کار اتنا بڑھتا ہے کہ آدمی ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے اور اتنا زیادہ پریشان ہو جاتا ہے کہ اپنی پریشانی کی وجہ کے اظہار سے بھی قاصر رہتا ہے۔ ہر وقت اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دماغ اور اعصاب پر کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے۔

اس دنیا میں کوئی تو مالی طور پر مستحکم نہ ہونے' خاطر خواہ مال ودولت کی کمی یا آمدنی کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ومضطرب ہے۔ اور کوئی مال و دولت کی زیادتی کی بناء پر خوف وہراس کا شکار ہے ..... کوئی اس وجہ سے

پریشان ہے کہ دوسروں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کو کس طرح پورا کرے کیونکہ اس کے خیال میں نامساعد حالات اس امر کی اجازت نہیں دیتے اور کچھ لوگ تو معمولی معمولی باتوں پر اس طرح پریشان ہو جاتے ہیں کہ اپنے اعزاء واقربا کو بھی پریشان کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بنیادی طور پر وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنی ناراحتی وپریشانی کے اظہار کا بہانہ تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

عام طور پر شام ہوتے ہی یہ اندیشے ووسوسے انسان کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب دن بھر کی تھکن کے بعد انسان کی عقل خستگی کا شکار ہوتی ہے اور اس کی فیصلہ کرنے کی قوت بھی کمزور پڑ چکی ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں موہوم وبے ہودہ خیالات کو میدان خالی مل جاتا ہے اور وہ انسان پر نہایت شدّت کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں۔

جو شخص چھوٹی سی غلطی کی بنا پر بے جا بیم وہراس کا شکار ہو جاتا ہے اُسے سوچنا چاہئے کہ اگر اس کی تلافی ممکن نہیں تو پھر اسے سوہانِ روح بنانا لاحاصل ہے۔ اور ایسے مصائب پر ہائے واویلا مچانے کا کوئی فائدہ نہیں جو خود اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہوں۔

انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ اب اگر آپ نے بدی کا بیج بویا تھا تو اس کا قصور وار کون ہے؟ کیا اس گناہ کو زمانہ کی گردن پر ڈالا جاسکتا ہے؟ اگر انسان مصائب ومشکلات سے خوفزدہ ہو جائے اور ان کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات اسے وحشت زدہ کر دیں تو یہ رعب وہیبت اسے ان کی چارہ جوئی نہ کرنے دے گا۔ کیونکہ اس طرح اس کی فکر منتشر ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ

اگر فکر متعدد جگہ مشغول ہو جائے تو اس کی کارکردگی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔

مسلّمہ امر ہے کہ شور و ہیجان کے ذریعہ زندگی کے مسائل حل نہیں کئے جاسکتے۔ بے قراری اس شخص کی مہارت میں اضافہ نہیں کرتی جو غلط کام انجام دے چکا ہو۔ جو چیز ہو چکی ہو اس پر کفِ افسوس ملنے اور محض لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں اور اس طرزِ فکر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کی زندگی تاریک اور اس کی فعالیت مفلوج ہو جائے۔

پس ضروری ہے کہ آدمی سکونِ قلب کی نعمت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ تدبیر کے ناخن سے مسائل کی گتھی سلجھائے۔ کوشش کرے اور اتنے دھیان سے کام کرے کہ آئندہ ویسی ہی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہو۔ جی ہاں' عاقلانہ طرزِ فکر یہی ہے اور اسی طرح انسان اپنی اخلاقی صفات میں نظم و ضبط کے عنصر کا اضافہ کرسکتا ہے۔

نامعلوم مستقبل کی حد سے زیادہ فکر

انسان حال یا مستقبل کے بارے میں جتنا فکرمند ہوتا ہے اسی تناسب سے اس کے اطمینان و سکون پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے مستقبل کو غیر معمولی حد تک اہمیت دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ زمانہ حال سے بخوبی استفادہ نہیں کرپاتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا زمانہ حال اطمینان بخش ہو لیکن وہ مستقبل میں متوقع خطرات سے پریشان رہتے ہوں اور یہ پریشانی انہیں اس قدر خوفزدہ رکھتی ہو جیسے خطرہ ان کے سر پر آکھڑا ہو۔ ایسے لوگوں کو یہ بات

ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ماضی' حال پر مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہوتا اور مستقبل کے بارے میں بھی کوئی صحیح صحیح پیش بینی نہیں کی جاسکتی۔ وہ مستقبل کے حوادث سے خوفزدہ ہونے میں اس وقت حق بجانب ہوں گے جب متوقع حوادث کا وقوع پذیر ہونا یقینی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان حوادث کے ظہور کا امکان بہت معمولی ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ انسان کی کی ہوئی پیش گوئیاں صد در صد درست ثابت ہوئی ہوں۔

"ڈیل کارنیگی" لکھتا ہے کہ۔

"آپ کے دوست احباب میں جو لوگ مثبت فکر کے حامل ہیں ان کے بارے میں غور و فکر کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے لوگوں پر آپ خصوصی توجہ دیتے ہیں اور ان سے میل ملاپ پسند کرتے ہیں۔ البتہ آپ کے اعزّہ و اقربا میں ایسے منفی سوچ رکھنے والے لوگ بھی شامل ہوں گے جو آپ کے لئے دردِ سری کا باعث بن جاتے ہوں۔

مثبت فکر رکھنے والے لوگ خوشحال' زندہ دل' فعال اور عملی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ان سے بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہوں لیکن وہ اپنی فہم و فراست کی بناء پر ان غلطیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کی اصلاح کے بعد پھر سے تگ و دو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسی چیزوں سے خوف و ہراس اور تشویش میں مبتلا ہو کر اپنا وقت ضایع نہیں کرتے جن کا وقوع پذیر ہونا ہرگز ممکن نہیں۔

ہر چوبیس گھنٹے میں خلا سے بیس ملین سے زیادہ پتھر زمین پر برستے ہیں لیکن ہمیں ایک بھی ایسا ٹھوس ثبوت نہیں ملا کہ ان آسمانی پتھروں کی

زد میں آکر کوئی شخص ہلاک ہوا ہو۔"

"مارک ٹوائن" کہتا ہے کہ۔

"میں ایک بوڑھا اور سن رسیدہ آدمی ہوں اور زندگی میں پیش آنے والی بہت سی ممکنہ مشکلات سے واقف ہوں لیکن ان میں سے اکثر ایسی ہیں جن سے میرا سروکار نہیں پڑا۔

زندگی مشکلات کا ایک بہتا سمندر ہے۔ یہ تمام مشکلات اپنے حل کے لئے عزمِ صمیم کی محتاج ہیں۔ حتیٰ بہت سی مشکلات ہم پر پڑ کر ہمیں پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہیں، ہماری زندگی کے چند گھنٹوں یا پورے پورے دنوں کو بے مزہ کر دیتی ہیں۔ درحالانکہ وہ بہت معمولی اور غیر موثر مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسے مواقع پر اصل مسئلہ ہمارے اندر اس صلاحیت کا فقدان ہے جس کے ذریعہ ہم بروقت کسی مشکل کے اہم اور غیر اہم ہونے کو دریافت کر سکیں۔" (تفکرِ صحیح۔ ص ۱۰۸)

یہ احتمالی خطرات خواہ ظاہر ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی بناء پر لاحق ہونے والا ہراس و تشویش جسم وجاں کے ضعف پر منتج ہوتا ہے۔ ممکن ہے زندگی کے مختلف مراحل میں آدمی کا ایسے حوادث سے سابقہ پڑے جو اس کی کامیابی کی راہیں مسدود کر دیں۔ لیکن اس قسم کے حوادث کوئی نئی چیز نہیں۔ سب ہی ان سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہم قدرت کے ازلی قوانین میں اپنی مرضی سے ردوبدل نہیں کر سکتے۔

امکانی حوادث کا تعلق انسان پر وارد ہونے والے خارجی خطرات سے ہے۔ لیکن وہ چیز جو انسان کو اندر سے خوف و تشویش میں مبتلا کئے رکھتی ہے،

خارجی خطرات سے کم اہم نہیں۔ اور کبھی کبھی تو یہ خارجی خطرات سے بھی زیادہ شدید ہوتی ہے۔

ہر انسان کے اندر ایک مخرّب قوت پائی جاتی ہے جو اس کی زندگی کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔ یہ خطرناک چیز جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اضطراب و تشویش ہے۔ ممکن ہے کبھی اس داخلی خطر سے دوچار شخص اپنے اندر اس کے وجود سے آگاہ ہی نہ ہو۔

اگر وہ جسمانی، دماغی اور فکری قوت جسے خوف و ہراس اور اضطراب تباہ وبرباد کر دیتے ہیں، مثبت اور ثمر بخش کاموں میں صرف ہو تو کتنے گرانقدر اور پُربہا نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

ہر شخص کو سوچنا چاہئے کہ اس نے اپنا کس قدر وقت ممکنہ پیش آنے والے حوادث کی چارہ جوئی کے لئے صرف کیا ہے۔ اگر استثنائی صورتوں کو ایک طرف ہٹا دیا جائے تو با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشکلات اور دشواریاں جن کا انسان کو سامنا کرنا پڑا ہے ان ممکنہ خطرات کے مقابل بہت کم ہیں جن کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوتا رہتا ہے۔

"کرونین" لکھتا ہے۔

"ان چیزوں کی ایک فہرست تیار کیجئے جو آپ کی تشویش اور آشفتگی کا باعث ہیں۔ اس طرح جب آپ اپنے قلبی اضطراب کے علل واسباب صفحہ قرطاس پر لائیں گے تو دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر مبہم، غیر واضح اور بے اہمیت ہیں۔

چالیس فیصد مشکلات ایسی ہیں جو پیش ہی نہیں آتیں، تیس فیصد

آئندہ و گزشتہ اندیشوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کا مداوا اس جہاں میں کسی کے بس کی بات نہیں۔ بارہ فیصد اپنی سلامتی کی طرف سے بے بنیاد افکار ہوتے ہیں' دس فیصد بے وقعت اور جُزئی نوعیت کی ہیں' آٹھ فیصد ممکن ہے حقیقتاً تشویش ناک ہوں۔

مذکورہ تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم جن اندیشوں میں گھلتے رہتے ہیں ان میں سے شاذ ہی کوئی ہمیں پیش آنے والا ہو۔

خام خیالی کا جو غبار ہمارے دل میں بیٹھ گیا ہے' اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ اپنی زندگی میں ایک ایسا انقلاب لے کر آئیں جس کے بعد محض خود کو مرکز و محور قرار نہ دیں بلکہ دوسروں کو بھی اہمیت دیں اور اس حقیقت کو درک کریں کہ ہمارا وجود انسانی معاشرہ کا ایک جُزو ہے' ہماری زندگی خیروشر' خاندان' جماعت' ملّت اور ان گروہوں کی تابع اور ان سے وابستہ ہے جن سے ہم تعلق رکھتے ہیں۔

مشکلات کے تجزیہ و تحلیل اور ان کی کوئی راہِ حل نہ پانے کے بعد بھی خود کو غم واندوہ کے سپرد کردینا ایک طرح کا کفروالحاد ہے۔ کیونکہ یہ یاس و ناامیدی خداوندِ عالم کی مدد و نصرت کی ضرورت پر یقین نہ رکھنے کی علامت ہے۔ جس شخص نے خود کو غم واندوہ کا اسیر کرلیا ہو اس کے لئے کوئی اعلیٰ ترین حکمت و فلسفہ بھی سودمند ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم حکمت کو عقل کی متابعت میں کام میں لائیں تو اپنی زندگی کو انتہائی بلندی پر پہنچالیں گے اور ہمارا نمبر ایک باطنی دشمن

اس تک نہ پہنچ سکے گا۔ اور ہم حقیقی روحانی سکون پالیں گے۔" (دانستنیهائی جهانِ علم۔ص ۴۸-۵۱)

دل کی بے اطمینانی کے مضر اثرات انسان سے سرزد ہونے والے تمام کاموں میں نمایاں ہوتے ہیں اور کبھی کبھی انسان نادانستگی میں انحراف کی راہ اپنا لیتا ہے اور غیر عاقلانہ ردِّعمل ظاہر کرتا ہے۔ تشویشِ خاطر کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسان "خوداعتمادی" کھو بیٹھتا ہے۔

بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہمیشہ ساعتِ بد اور بُری قسمت کا رونا روتے رہتے ہیں اور کبھی اپنی زندگی سے مطمئن نظر نہیں آتے اور تصوّر کرتے ہیں کہ جب تک ان کے کام راہ پر نہ لگ جائیں' بے تحاشہ مال و دولت کے مالک نہ ہو جائیں اور رفاہ و آسائش کے وسائل ان کے اختیار میں نہ آجائیں' وہ زندگی سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔ ایسے لوگ اپنی سعادت کو مستقبلِ بعید میں تلاش کرتے ہیں اور اپنی عمر کے قیمتی سرمائے کو مستقبل کے سہانے سپنوں کی نظر کردیتے ہیں۔

حالانکہ اگر وہ واقعی حصولِ سعادت کے خواہشمند ہیں تو اسی معمولی اور پُرسکون زندگی سے خوش بختی کا راز حاصل کرسکتے ہیں۔ کیونکہ آئندہ زندگی کی بنیاد آج ہی کے دن پر استوار ہے اور کل جس کا انسان آج آرزومند ہے اور وہ اسے بہشتِ بریں نظر آرہی ہے جب وہ آپہنچے گی تو بالکل آج ہی کی مانند جہنم کی طرح ہولناک معلوم ہوگی۔

جو شخص موجودہ زندگی سے بیزار ہے اور ایک مبہم و تاریک افق سے بہتر وخوشتر وضع کے نمودار ہونے کی امید لگائے بیٹھا ہے' اسے چاہئے کہ خوابِ

غفلت سے بیدار ہو، اپنی گمشدہ آرزوؤں کو آج ہی کے رنج آمیز دنوں میں تلاش کرے نہ کہ خواب وخیال اور نامعلوم مستقبل میں۔ آرزوؤں کی تکمیل میں جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں وہ انسان کی اپنی فکر کی پیداوار ہیں۔ کامیابیاں آج ہی کے عمل میں پنہاں ہیں۔ اگر آج بیج نہ بویا تو کل کیسے پھل کھایا جا سکتا ہے۔ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے دوبارہ نہیں کہ اس کی خطاؤں کا ازالہ کیا جا سکے۔

ایک ذی فہم انسان اپنی زندگی کے خاموشی سے گزرتے لمحات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، اپنے وقت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ اس کدوکاوش کے نتیجے میں اس کے سامنے کامیابی کے نئے نئے دریچے کھلتے ہیں اور زندگی کا افق زیادہ سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

ایسا شخص زندگی میں پیش آنے والے حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اپنے مقام کی اس طرح حفاظت کرتا ہے کہ حوادث کی تندوتیز موجیں اگر اس کے سر سے بھی گزر جائیں تب بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ اچھے حالات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور برے حوادث سے عبرت پکڑتا ہے۔ اس بات کا منتظر نہیں رہتا کہ دنیا میں انقلاب نمودار ہو اور جیسا وہ چاہتا ہے خود بخود ویسا ہو جائے۔ المختصر زندگی کے لمحات کو اس طرح گزارتا ہے کہ جب جان، جان آفرین کے سپرد کرتا ہے تو کسی حسرت وندامت کا شکار نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں حال اور مستقبل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ نہ آج کوئی کام کرتے ہیں نہ کل کے منتظر ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمیشہ ماضی کے ضایع شدہ مواقع پر ملال کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ بجائے یہ کہ وقار وسکون کے ساتھ آگے کی جانب قدم بڑھائیں، قدم قدم پر پیچھے پلٹ کر دیکھتے

رہتے ہیں اور محض اپنی سابقہ کوتاہیوں اور گزرے ہوئے حوادث کے تصور میں زندگی گنوا دیتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جب حال سے مستقبل میں قدم رکھتے ہیں تو ماضی قریب پر بھی حسرت وندامت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ہر ہر قدم پر غلطی کرنے اور اس پر نادم ہونے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے۔

بے شک گزرے ہوئے ناگوار حوادث اور غلطیوں پر ہاتھ ملتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ روح خستہ وفرسودہ اور صلاحیتیں بے کار ضایع ہو جاتی ہیں اور انسان اس قابل نہیں رہ پاتا کہ اپنی مصلحتوں کے مطابق زندگی کی صحیح راہ کا انتخاب کر سکے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان کو زمانۂ حال پر توجہ دینی چاہئے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان آج ایسا کام کرے کہ کل پھر اس کے برے نتائج اس کے دامن گیر ہو جائیں۔ یا آج ایسی آگ سلگائے جس کے شعلوں سے کل جل مرے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اسے ماضی کی حسرتوں اور مستقبل کے اندیشوں سے مضطرب نہیں رہنا چاہئے اور اپنے سکون وراحت کو غمِ گزشتہ اور فکرِ فردہ سے درہم برہم نہیں کرنا چاہئے۔

انحرافی راہ اپنا لینا

محرومیت اور ضرورت انسان کو کاروکوشش پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت ضروریات کی تکمیل اور محرومیوں سے نجات کے لئے محنت ومشقت میں مصروف نظر آتی ہے۔ لیکن جو لوگ ہر لحاظ سے اپنی مادّی ضروریات پوری کر لیتے ہیں وہ ہیجان واضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس

سے نجات کے لئے ایسی راہوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی جسمانی توانائی اور عقلانی قوتوں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوتی ہیں۔ ان ہی راہوں میں سے ایک شراب اور منشیات میں پناہ ڈھونڈنا ہے۔

اس راہ کا انتخاب کرنے والوں کے نزدیک غم واندوہ سے نجات کا واحد علاج یہ ہے کہ جام و مینہ میں مست رہیں۔ اس طرح در حقیقت یہ لوگ جانتے بوجھتے اپنی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہوتے ہیں۔ وگرنہ سب ہی جانتے ہیں کہ منشیات کا استعمال نفسیاتی کرب واضطراب سے چھٹکارے کی صحیح راہ نہیں۔ جوں جوں اس کے اثرات کم ہوتے جاتے ہیں اور نشہ ٹوٹتا ہے انسان دوبارہ اور شدّت کے ساتھ اسی نفسیاتی عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازایں منشیات کا مستقل استعمال بتدریج ان کی تاثیر کو بھی ختم کر دیتا ہے اور یہ بات خود بہت سی بیماریوں اور پیچیدگیوں کا سبب بنتی ہے۔

نفسیات داں ان اسباب کی جو لوگوں کے منشیات میں پناہ ڈھونڈنے کا موجب ہیں یوں تشریح کرتے ہیں۔

"جو لوگ اس پیچیدہ اور نشیب و فراز سے پُر دنیا میں اپنی خواہشات کی تسکین پر قادر نہیں ہوتے وہ مشکلات سے فرار اور بے بنیاد تصوّرات میں غلطاں رہنے کے لئے شراب نوشی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ الکحل اعصابی نظام اور ذہنی صلاحیتوں پر نہایت تیزی سے اثر دکھاتی ہے اور شراب نوشی کی عادت عقل و بصیرت کے فاسد ہو جانے کا موجب بنتی ہے۔ نشہ میں مست شخص سے غیر فطری افعال سرزد ہوتے ہیں۔ یہ کام اس کے لئے ایسے نقصانات کا سبب

بنتا ہے جن کی تلافی ناممکن ہوتی ہے۔ شرابی نا صرف اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈالتا ہے بلکہ دوست احباب، اعزّہ واقرباء کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ جب اس کا نشہ ٹوٹتا ہے اور اس کی حالت معمول پر آجاتی ہے تو مشکلات کا سامنا کرنے کے سلسلہ میں اس کی قوّت کم ہو چکی ہوتی ہے۔

شراب کے استعمال سے مشکلات کے حل میں پیش رفت نہیں ہوتی اور جو شخص مشکلات سے فرار کے لئے شراب استعمال کرتا ہے وہ دراصل اپنی مشکلات میں مزید اضافہ کر رہا ہوتا ہے اور مشکل کا مشکل تر ہو جانا اسے پھر نشہ کی طرف لے جاتا ہے۔

دن میں خواب دیکھنے کی بعض حالات اور شراب نوشی مشکلات سے فرار کی راہوں کے لحاظ سے ایک ہی جیسے ہیں۔ البتہ شراب کا استعمال بہت زیادہ جسمانی نقصانات کا سبب ہے۔ یہ دونوں راہیں مشکلات کے حل کے سلسلے میں منطقی نہیں ہیں بلکہ مشکلات سے فرار کے مترادف ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ کے لئے فرار کر جانا ناممکن ہے اور بالآخر انسان کو حقیقت کی دنیا میں واپس آنا پڑتا ہے تو یہ موقع زیادہ ناگوار اور نہایت اندوہناک ہوتا ہے۔"

(روان شناسی برای زیستن۔ ص ۲۳۰)

افکار و نظریات کا بہاؤ انسانی روح کے سکون و آسائش پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ تنزل و ترقی اور ہر شخص کی روحانی کیفیت اس کے طرز تفکّر سے وابستہ ہے۔

کسی انسان کے افکار کیسے ہیں اور وہ انہیں مختلف اشیاء پر کس طرح منطبق کرتا ہے۔ اس بات پر مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو شخص عقلِ فعال سے مالامال ہوتا ہے وہ مادّی منابع سے مایوس ہونے اور جہانِ خارج سے استفادہ نہ کرسکنے کے باوجود ناامیدی کے بلاخیز مقابلہ سے پیٹھ نہیں پھیرتا اور دنیا اس کے لئے تاریک و مہیب نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وقت آنے پر یکایک روح پر مادّی امور کے دریچے بند کر کے معنوی لذّات سے بہرہ مند ہونا شروع کردیتا ہے اور اس طرح خود کو ایک ایسے جہاں سے منسلک کرلیتا ہے جو قلق ومایوسی کی قید سے آزاد ہے اور اس طرح خوش بختی و آسودگی کے چشمے سے سیراب ہوتا ہے۔

جن لوگوں کی فکر کوتاہ ہوتی ہے وہ تشویش واضطراب سے نجات کے لئے خارجی عوامل کی پناہ ڈھونڈتے ہیں اور کیونکہ انسانی خواہشات مسلسل تغیّر کا شکار رہتی ہیں اور دوسری طرف اس آشفتہ دنیا میں بھی کوئی چیز ثابت وپائیدار نہیں رہتی لہٰذا اگر انسان ان چیزوں میں اپنی خوش بختی تلاش کرے گا تو ہمیشہ کے لئے نابودی وفنا کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ ایسا آدمی اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو پھونکوں سے جنگل میں لگی آگ بجھانا چاہے۔ المختصر اس بے بضاعت وناپائیدار مادّی دنیا کی کوئی چیز اسے حقیقی معنوں میں سکون وراحت نہیں بخش سکتی۔

"کرلوس" اس قسم کے لوگوں کی بدبختی کو یوں بیان کرتا ہے۔

"ان میں سے کوئی شخص اپنی خلش سے نجات کے لئے، خوبصورت محل چھوڑ دیتا ہے۔ ایک دوسرا اِس سُرعت کے ساتھ اپنے بیوی بچوں سے دوری اختیار کرتا ہے جیسے کوئی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے کے لئے لپکتا ہے۔ لیکن ابھی اپنے مطلوب تک

پہنچ بھی نہیں پاتا کہ ایک مرتبہ پھر یہ برباد کر دینے والی دشمن یعنی ناگواری اور روحانی خلش اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اسے دیکھ کر انسان پھر اسی رفتار سے واپس پلٹتا ہے اور اس طرح دیوانوں کی مانند کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر سرگرداں وپریشاں رہتا ہے۔"

(افکارِ شوپنھاور۔ ص ۶۴)

زحمت وابتلاء کے گہرے اثرات

بنیادی طور پر انسان کی خلقت اس طرح کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بہت سی جسمانی و روحانی زحمتیں برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ مادّی رفاہ وآسائش کے سلسلے میں کی جانے والی اس تگ ودو کے نتیجہ میں انسان کی روح اور عقل قوّت وبلندی حاصل کرتی اور کمال وترقی کی جانب بڑھتی ہے۔

زندگی کی سختیاں اور مشقتیں گہرے و وسیع اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ اولوالعزم انسانوں کی روحیں مصائب کی کٹھالی میں پک کر کندن بنتی ہیں اور فلاکت کی تاریکیوں میں اپنی چمک دمک دکھاتی ہیں۔

اگر انسانیت اپنی حیات کے ابتدائی ایام ہی میں اپنی جہالت و نادانی سے ناگواری محسوس نہ کرتی تو کبھی اس بیماری کا علاج نہ کرتی اور وحشی پن وجہالت کی تاریکی میں پڑی رہتی۔ آج عقل، ذوق اور اخلاق کے جو مظاہر نظر آتے ہیں ان کا وجود نہ ہوتا۔ نادانی اور جہالت کا یہی رنج تھا جس نے انسانوں کو اس کے خلاف مسلسل جہاد پر ابھارے رکھا۔

انسانی حیات میں نظر آنے والا ہمہ جانبہ تکامل اور تمام مدنی و اجتماعی پیشرفت اسی راہ گزر پر گام برداری کا نتیجہ ہے۔ اکثر عظیم سماجی انقلابات جو ترقی کا پیش خیمہ اور تکامل و پیش رفت کی جانب سفر کا نکتہ آغاز قرار پائے وہ مشکلات اور سختیوں ہی کا نتیجہ ہیں۔

اگرچہ ظاہراً مشکلات و حوادث کی تُند موجیں تلخ و ناگوار اور خوشیوں ولذائز کی بادِ بہاری مسرور کن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت مسئلہ بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ لذّات و خواہشات کی تسکین انحطاط کا سبب بنتی ہے اور سعادت و خوش بختی مصائب کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ سختیوں پر تحمّل اور سعادت کا حصول لازم وملزوم ہیں اور ان کے درمیان علّت و معلول کا سا ربط پایا جاتا ہے۔

جرمن فلسفی ہیگل کہتا ہے۔

"تنازع پیشرفت کی بنیاد ہے۔ انسان کے صفات و کمالات تگ و تازِ زندگی ہی میں مکمل ہوتے ہیں اور انسان فقط مشکلات و مصائب ہی کی راہ سے اوجِ کمال پر پہنچتا ہے۔ زحمت و مشقت ایک معقول امر، حیات کی علامت اور اصلاح کا محرک ہے۔

زندگی سعادت و کمال کے حصول کا ذریعہ ہے (سکون و راحت اس کا ثمر نہیں ہے) دنیا سعادت و خوش بختی کا مقام نہیں۔ آسودگی و آسائش کا زمانہ کتابِ زندگی کے بے روح صفحات پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ سازگاری کا دور ہوتا ہے اور یہ اطمینان و سرمستی کسی مرد کو سزاوار نہیں۔ تاریخ ایسے ادوار سے بنی ہے جن میں عالم کے

تناقضات پیشرفت و تکامل کے ذریعہ حل ہوتے ہیں۔"

(تاریخِ فلسفہ، ویل ڈورانٹ۔ ص۲۴۹)

دھاتوں کو فاضل مواد سے پاک وخالص کرنے کی غرض سے بھٹی میں پکایا جاتا ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے مصائب انسان کے لئے یہی خاصیت رکھتے ہیں اور اسے آلائشوں سے پاک و صاف کرتے ہیں اور اسے اپنے انسانی فرائض کی ادائیگی پر آمادہ کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زحمتیں اور مشقتیں اٹھائے بغیر کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کرسکتا۔

قرآن کریم کہتا ہے۔

"لقد خلقنا الانسان فی کبد"

"ہم نے انسان کو مشقت میں رہنے والا بنایا ہے۔"

(سورۂ بلد ۹۰۔ آیت ۴)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الذین یلونهم الامثل فالامثل"

"ابتلاء و آزمائشوں کے لحاظ سے انبیاء الٰہی تمام انسانوں میں سرِفہرست ہیں، ان کے بعد وہ لوگ ہیں جن کا مرتبہ انبیاء کرامؑ سے کچھ کم ہے اور اس کے بعد جوں جوں آزمائشیں گھٹتی ہیں اسی ترتیب سے مقام بھی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔" (بحار الانوار۔ ج۱۵۔ ص۵۳)

مولانا روم اس حقیقت کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

گندمی را زیر خاک انداختند
پس زخاکش خوشه ها برساختند
بار دیگر کوفتندش ز آسیا
قیمتش افزون وناں شد جانفزا
بازناں را زیر دندان کوفتند
گشت عقل و جان و فہم سودمند

(جب گندم کے دانے کو زمین میں بویا جاتا ہے تو وہ خوشہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ پھر اسے چکّی میں پیسا جاتا ہے تو وہ روٹی بن جاتا ہے اور انسان کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر روٹی کو دانتوں تلے چباتے ہیں تو وہ سودمند انسانی عقل وفہم کا روپ دھار لیتی ہے۔)

ایک یورپی دانشور کہتا ہے کہ۔

"مشکلات و سختیاں اخلاق کی کٹھالی ہیں۔ جس طرح بعض نباتات کا عرق نکال کر اس کی خوشبو سے مشامِ جاں معطر کی جاتی ہے اسی طرح بعض طبایع کو بھی آزمائشوں میں پڑنا چاہئے تاکہ ان کے ذاتی اوصاف صیقل ہو جائیں۔

اس دنیا میں کوئی راحت و آسودگی ایسی نہیں جو رنج و مصیبت میں بدلنے والی نہ ہو۔ اسی طرح کوئی دشواری ایسی نہیں جس کا نتیجہ سعادت و خوش بختی کی صورت میں نمودار نہ ہوتا ہو۔ ان دونوں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمارے لئے اہم بات یہ ہے کہ ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں یا سوء استفادہ؟ اس دنیا میں کامل سعادت اور

مکمل آسائش میسّر نہیں اور بالفرض اگر میسّر ہو بھی تو ثمر بخش نہیں اور انسان کے لئے کسی قسم کی خیر اور فائدہ کی حامل نہیں۔ آج تک انسان کے سامنے جتنے بھی مکاتب رکھے گئے ہیں ان میں سب سے گھٹیا مکتب وہ ہے جو انسان کو محض عیش ونوش اور آرام و سکون کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ تمام مشکلات و مصائب عیش و آرام سے بڑھ کر انسان کے لئے استاد ہیں اور سختیاں انسان کی فطرت کی اصلاح اور تقویت کا ذریعہ ہیں۔ زحمتیں اور سختیاں انسان کی طبیعت کو رام کرتی ہیں اور اسے فہم و بصیرت عطا کرتی ہیں، انسان کو صبرو شکیبائی کی تعلیم دیتی ہیں اور انسانی ذہن میں عالی ترین افکار و خیالات کو پروان چڑھاتی ہیں۔"

"ہاپر" کہتا ہے۔

"انسان کے نہایت عمدہ تخیّلات کس چیز کے مرہونِ منت ہوتے ہیں؟ علم ودانش کے! نہیں۔ لیاقت و مہارت کے؟ نہیں۔ جذبات و احساسات کے؟ ہیجان کے؟ نہیں۔ ہاں! صرف ابتلاء و آزمائش انسانی فکر کو پروان چڑھاتے ہیں اور وہاں سے عمدہ افکار و تخیّلات کو ابھار کر لاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آسائشوں و راحت کی نسبت دنیا میں مشکلات و مصائب زیادہ ہوتے ہیں۔ مصیبتوں کے ذریعہ لوگوں کی آزمائش کرنے پر مامور فرشتہ نے فلاح و رفاہ بہم پہنچانے والے فرشتے سے زیادہ لوگوں کی خدمت کی ہے۔"

(اخلاق، ساموئیل ج ۲۔ ص ۲۰۴، ۲۰۵)

روحانی سکون پر ایمان کے قطعی اثرات

انسانی ترقی و پیشرفت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ تہذیب و تمدّن کی بنیادیں ہمیشہ ایسے ہی بزرگوں کے ہاتھوں رکھی گئی ہیں کہ جو "ایمانی قوت" کے بل بوتے پر بھاری ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل تھے اور اس راہ میں اٹھائے جانے والے رنج و مصائب ان کے طاقتور قلوب پر ذرّہ برابر اثر نہ ڈال سکے تھے۔

نفسیات کے ماہرین کی اکثریت کا اعتراف ہے کہ روحانی بیماریوں کے علاج اور قلبی اطمینان کے سلسلے میں "ایمان" کی طاقت غیر معمولی حد تک حیرت انگیز اور مفید ہے۔

جب طاقت فرسا دشواریاں انسانی شخصیت کو کچلنے کے لئے آگے بڑھتی ہیں اور اس سے امید و آرزو کی نعمت چھیننے کی کوشش کرتی ہیں، تو ایسے موقع پر خداوندِ عالم کی ذات پر توکّل انسان کی شکست خوردہ روح کے لئے محکم سہارے کا کام کرتا ہے۔ ناکامی، شکست اور مشکلات مردانِ باایمان کے ضمیر میں ہل چل بپا کرنے اور انہیں زبونی، ناامیدی و خودباختگی سے دوچار کرنے پر کسی صورت قادر نہیں ہوتیں۔

معروف ماہرِ نفسیات "یونگ" لکھتا ہے۔

"۳۵ سال سے زائد عمر کے نفسیاتی مریضوں کے بارے میں تحقیق کی گئی تو ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی بیماری کا تعلق آخرکار مذہبی ایمان سے جا کر نہ ہو گیا ہو۔ بہتر انداز میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہر شخص اس چیز کے فقدان کی بناء پر اس مرض

میں مبتلا تھا جو ایک زندہ دین انسان کو عطا کرتا ہے اور پھر ان میں سے جس کسی نے بھی دین و مذہب کا سہارا نہ لیا وہ اپنے علاج سے قاصر رہا۔" (جہانِ مادّیات۔ ص ۴۱)

نفسانی خواہشات کو اعتدال پر لانے کے لئے جو خود بے شمار روحانی الجھنوں کا علاج ہے، خدا پر ایمان ایک قابلِ بھروسہ سہارا ہے۔ خدا پر ایمان کے اثر سے زندگی حسنِ کمال کو دیکھ لیتی ہے۔ کیونکہ جب انسان کو اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد فنا اس کا مقدر نہیں ہے تو اس کی روح ایک خاص روحانی اطمینان سے سرشار ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری زندگی اعتدال کی راہ پر چلتے ہوئے گزار دیتا ہے۔

خدا پر ایمان کے نتیجے میں اور دین کے عطا کردہ اخلاقی اصولوں پر کاربند ہونے کی بناء پر زیادہ طلبی اور ثروت اندوزی کی حس جو قلبی اضطراب کے عوامل میں سے ہے معتدل ہو جاتی ہے۔ اور انسان عظیم اجر و ثواب کی امید اور سزاؤں کے خوف سے نامعقول اور بے حدوحساب مادّیات کی جانب رجحان اور جاہ و حشم سے گریز کرنے لگتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مطلوب اور انسانیت کے شایانِ شان اعتدال اس کی روح میں پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح آخرت اور حیاتِ بعد از موت کا عقیدہ اسے نیستی و فنا کے جانکاہ تصوّر سے نجات دلاتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ موت کے بعد ایک دوسری حیات کا دروازہ اس کے سامنے ہو گا جہاں دائمی نعمات اور حیاتِ ابدی اس کی منتظر ہیں؛ جن کا اِس دنیا میں ملنے والی خوشیوں سے موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا اور یوں اضطرابِ خاطر کا ایک عامل ختم ہو جاتا ہے۔

ایمان آدمی کے دل سے نا صرف یہ کہ بے اطمینانی و تشویش کو محو کرتا ہے بلکہ قلبی ہیجان واضطراب کی بھی روک تھام کرتا ہے۔ قرآن کریم ایمان کے اثرات کو یوں بیان کرتا ہے کہ۔

"ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"

"خبردار سستی نہ کرنا' مصائب پر محزون نہ ہونا اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔"

(سورہَ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۳۹)

اس آیہء شریفہ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان ناگوار روحانی عوامل سے مقابلے کے واسطے روح کے لئے ایک محکم زرہ ایجاد کرتا ہے اور انسان کے اندر ایک خاص حفاظتی حصار بناتا ہے۔ اگر انسان ایمانِ کامل سے بے بہرہ ہو اور ناگوار عوامل اس کی روح میں بسیرا کرلیں تب بھی صرف ایمان ہی پر تکیہ کرتے ہوئے دل کو غم واندوہ سے نجات دلائی جا سکتی ہے اور رنج والم کے نقش لوحِ دل سے صاف کئے جا سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے۔

"الا بذکر اللہ تطمئن القلوب"

"آگاہ ہو جاؤ کہ اطمینان یادِ خدا سے ہی حاصل ہوتا ہے۔"

(سورہَ رعد ۱۳۔ آیت ۲۸)

"ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین"

"وہی خدا ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا ہے۔"

(سورہَ فتح ۴۸۔ آیت ۴)

"الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن"

"جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انہی کے لئے امن وسکون ہے۔"

(سورہٴ انعام ۶۔ آیت ۸۲)

"الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

"آگاہ ہو جاؤ کہ خدا کے دوستوں پر نہ خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وہ محزون ورنجیدہ ہوتے ہیں۔" (سورہٴ یونس ۱۰۔ آیت ۶۲)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام یادِ خدا کے فوائد اور خدا کے دوستوں کی صفات کچھ یوں بیان فرماتے ہیں۔

"ان اللہ تعالی جعل الذکر جلاء للقلوب' تسمع بہ بعد الوقرۃ' وتبصر بہ بعد العشوۃ وتنقاد بہ بعد المعاندۃ وما برح للہ عزت آلائہ فی البرھۃ بعد البرھۃ وفی ازمان الفترات رجال ناجاھم فی فکرھم وکلمھم فی ذات عقولھم"

"خداوندِ عالم نے اپنی یاد کو دلوں کی نورانیت اور پاکیزگی کا باعث قرار دیا ہے۔ یادِ خدا ہی کی وجہ سے دلوں کا بہرا پن سماعت میں' اندھا پن بصارت میں اور سرکشی اطاعت میں بدل جاتی ہے۔ یکے بعد دیگرے ہر عہد اور انبیاء سے خالی ہر دور میں ربّ العزّت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ موجود رہے ہیں کہ وہ (خدا) جن کی فکروں میں راز

داری سے گفتگو کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے کلام کرتا ہے۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ نمبر۲۱۹)

ظاہر ہے ایسے باایمان حضرات کا مادّہ پرست اور بے دین افراد سے کوئی موازنہ اور مقایسہ نہیں کیا جاسکتا۔

جنگِ احد کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں ایک عورت کو خبر ملی کہ جنگ میں اس کے پیاروں نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس خاتون نے ایک اونٹ لیا اور شہداء کے اجساد لینے کے لئے عازمِ میدان ہوئی' وہاں پہنچ کر خاک وخوں میں غلطاں شہداء کے لاشوں کو اونٹ کی کمر پر لادا اور واپس مدینہ کی راہ لی۔

ابھی اس خاتون نے نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ سرِ راہ اس کی ملاقات رسولِ مقبولؐ کی ایک زوجہ سے ہوئی۔ زوجۂ رسولؐ جو آنحضرتؐ کی طرف سے پریشان تھیں انہوں نے سوال کیا۔ رسول اللہؐ کی کوئی خبر ہے؟ وہ معزز خاتون جو اونٹ کی لجام تھامے ہوئے تھی اور شہداء کے خون کے قطرات اونٹ کی کمر سے ٹپک ٹپک کر زمین کو گلگوں کر رہے تھے نہایت سکون و وقار سے بولی۔

"میں آپ کے لئے خوش خبری لائی ہوں' پیغمبرؐ بالکل صحیح و سلامت ہیں اور اس عظیم و گرانقدر نعمت کے مقابل ہر مصیبت قابلِ تحمل ہے۔

زوجۂ پیغمبرؐ نے سوال کیا : یہ لاشیں کس کی ہیں؟

جواب دیا : ایک میرے شوہر کی' ایک بیٹے کی اور ایک بھائی کی۔ میں انہیں سپردِ خاک کرنے کے لئے مدینہ لے جارہی ہوں۔"

کیا ایمان کے علاوہ کوئی اور عامل ہو سکتا ہے جس نے اس مصیبت زدہ عورت کو یہ سکون و راحت بخشا ہے۔

روسو لکھتا ہے۔

"اگر ہم غیر فانی موجودات میں سے ہوتے تو یہ ہماری بڑی بدبختی ہوتی۔ بے شک مرنا ایک مشکل کام ہے لیکن یہ تصوّر کہ ہم ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے اور مصائب و آلام سے بھرپور یہ زندگی بالآخر ختم ہو جائے گی دل پذیر و دل آرام ہے۔

اگر ہمیں دوامِ دائمی ہدیہ کیا جائے تو کون ہے جو اس غم انگیز تحفہ کو قبول کرے گا؟ اس صورت میں انسان کس امید پر مظالم و سختیوں کا مقابلہ کرے گا۔ جو جاہل شخص کسی چیز کے بارے میں پیش بینی نہیں کرسکتا اسے زندگی کی قدروقیمت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک صاحبِ فہم انسان کی نظر میں اس دنیاوی زندگی کے برخلاف حیات بعد از موت قابلِ قدر ہے فقط نیم آگاہ افراد اور بظاہر عاقل لوگ ہی ہیں جو صرف اور صرف اس دنیاوی زندگی کو نظر میں رکھتے ہیں اور موت کو انسان کی سب سے بڑی مشکل قرار دیتے ہیں۔ ایک صاحبِ فہم و شعور انسان کے نزدیک زندگی کی سختیوں کو برداشت کرنے کا ایک سبب موت کا حتمی ہونا ہے۔" (امیل ۔ ص۹۱)

تسلیم و رضا

جو شخص دولتِ ایمان سے بہرہ ور نہ ہو وہ نامساعد حالات میں خوف و

ہراس کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو فطرت کا قیدی اور اس کی قہر آلود اور ستمگر قوتوں کا محکوم سمجھنے لگتا ہے۔

ایسا انسان اگر ابتدائی مرحلہ میں مصائب و دشواریوں سے مقابلہ کا میدان چھوڑ کر فرار اختیار نہیں کرتا تب بھی آخر کار کسی خوفناک لمحے میں حوادث کی ہولناک اور تند موجوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس وہ شخص جو دینی عقیدہ کا حامل ہے وہ نظامِ آفرینش میں ارادۂ الٰہی کے سوا کسی چیز کو موثر نہیں سمجھتا۔ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ زندگی میں آنے والی خارج از اختیار مصیبتیں خداوندِ عالم کی جانب سے اس کے قلب کی تطہیر اور روح کی تہذیب کے لئے ہیں۔ لہٰذا وہ کسی صورت میں مصائب و مشکلات کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کی روحانی قوت کو مفلوج کر دیں۔ ہر حال میں اپنی متانت و وقار کو محفوظ رکھتا ہے اور خداوندِ عالم کی مدد و نصرت سے اپنے وجود کے سفینے کو ہر حادثے سے محفوظ رکھتے ہوئے کامیابی و سعادت کے ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ حتیٰ جس قدر اس کی مشکلات کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی کامیابی اور روحانی لذّتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

جابر بن عبداللہ جو مکتبِ اسلام کی پروردہ ایک شخصیت ہیں جب ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ان کی عیادت کو تشریف لائے اور ان کا حال دریافت کیا۔

"جابر نے عرض کیا : اس حال کو پہنچ چکا ہوں کہ پیری کو جوانی، بیماری کو تندرستی اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہوں۔

امامؑ نے فرمایا : لیکن ہم خاندانِ رسالتؑ ایسا نہیں سوچتے۔ خداوندِ عالم بیماری یا تندرستی، پیری یا جوانی، موت یا زندگی میں سے کسی ایک کا بھی ہمارے لئے ارادہ کرے تو ہم اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ دنیا میں پڑنے والے مصائب کے بارے میں ہمارا شیوہ رضاء رب ہے۔"

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے۔

"سعادت کے حصول میں تسلیم و رضا بھی موثر ہے اور اس کی اہمیت کسی طور بھی کوشش و جدوجہد سے کم نہیں۔ عاقل انسان قابلِ اجتناب ناگوار حوادث کے سامنے ہاتھ پر ہاتھ دھرکے نہیں بیٹھتا اور نہ ہی ان بدبختیوں پر اپنا وقت اور قوت برباد کرتا جن سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ حتیٰ جب ایسی مشکلات و حوادث کے مقابلے کے دوران بھی جن سے چھٹکارے کے لئے معمولی سی قوت اور تھوڑا سا وقت صرف کرنا پڑتا ہے اگر اسے یہ محسوس ہو کہ اس قوت اور وقت کا مصرف کسی اہم مقصد کے حصول میں مانع ہے تو وہ بخوشی ان مشکلات کو قبول کر لیتا ہے اور اپنی صلاحیتیں اس اہم کام کی تکمیل کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

بعض لوگ بہت معمولی ناگوار باتوں پر غم و غصّے کا شکار ہو کر کسی بہتر کام میں استعمال ہو سکنے والی اپنی توانائی کو برباد کر دیتے ہیں۔ مقصد تک رسائی کے لئے مسلسل ذہنی مشق کی شرط بھی اہم نہیں کہ انسان فکر و حواس کو اپنے مطلوبہ ہدف پر اس قدر مبذول کر دے کہ

اس سلسلے میں ممکنہ شکست کا خطرہ اسے ہمیشہ بے چین رکھے۔
ہر اہم کام میں کامیابی کے لئے اضطراب و ہیجان سے مبّرا ہونا ضروری ہے۔ درحقیقت بسا اوقات ہیجان و اضطراب کامیابی کے حصول میں مانع ہو جاتے ہیں۔ حصولِ مقصد کے لئے بہتر یہی ہے کہ انسان اپنی تمام مساعی بروئے کار لائے اور پھر فیصلہ تقدیر کے سپرد کر دے۔" (شاہراہِ خوش بختی۔ص ۲۶۴)

البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ تقدیر کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں اور اس پر بُردباری و تحمّل کا مظاہرہ کریں تو یہ ان ناگوار اور غیر متوقع حوادث کے بارے میں ہے جو انسان کی سوچ اور طاقت کی قلم رو سے باہر ہوں۔ وگرنہ انسان کو ہلاکت وبد بختیوں کی اس قسم کا گہری نظر اور مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کے خلاف سینہ سپر ہو جانا چاہئے جو سماج ومعاشرہ کی انحرافی اور غلط طرز و روش کی پیداوار ہیں۔

معاشرہ کی اس مفلوک الحالی کا علاج خود انسان کے اپنے اختیار میں ہے لہٰذا اس معاملہ میں سرِ تسلیم خم کردینا اور اس عمل کی قضائے الٰہی کے سامنے صبرو شکیبائی کے عنوان سے توجیہ کرنا درست نہیں۔

برطانوی دانشور "ڈاکٹر ایوی بری" کہتا ہے۔

"بد بختی اور بے چارگی کے عالم میں دین ہم پر سے مصیبتوں کے دباؤں کو کم کرنے اور تسلّی و تشفّی کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔ انسان ابدیت کا ایک جز ہے 'اس کے ماوراء ایک دوسری ابدیت موجود ہے' دین چاہتا ہے کہ انسان کی روح میں اس عظیم ابدیت کا ایک نمونہ

پیدا کردے۔
تسکینِ قلب اور ذہنی آسودگی کے لئے دین مسلّمہ طور پر ہمارے تصوّر سے بھی زیادہ موثر ہے۔ مذہبی افکار اپنی ظرافت و زیبائی کے ذریعہ ہمیں اس زندگی کی قید سے نجات دے کر اس خاکی دنیا سے بلند وبالا کرتے ہیں اور ایک عالی تر 'وسیع تر اور دل نواز جہان میں لے جاتے ہیں۔

دین ہم سے یہ نہیں کہتا کہ ہم دنیا سے بے اعتناو بے پروا ہو جائیں۔ بلکہ کہتا ہے کہ باوقار 'بُردبار اور پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ اپنی لگام ہوس کے ہاتھوں میں نہ دیں۔ اپنی جان کو حرص و آز کی آگ میں نہ جھلسائیں۔ ظلم و ستم کی بجلیاں دوسروں کے خرمنِ امید پر گرا کر اسے خاکستر نہ کریں۔

دین چاہتا ہے کہ ہماری خود پرستی کی (جو ہمیشہ آگ کے مہیب شعلوں کی طرح بڑھتی رہتی ہے) ایک حد معیّن کرے۔ ہماری نظر میں دوسروں کا وجود بے حیثیت نہ ہو جائے —— دین ہم سے کہتا ہے کہ زندگی فضیلت کے ساتھ بسر کریں' تقویٰ کو اپنا رہنما قرار دیں تاکہ ہماری روح پُر سکون اور ہمارا ضمیر آسودہ ہو جائے اور ہم سرچشمۂ سعادت سے سیراب ہوں۔

زندگی حوادثِ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔ جو چیزیں ہماری توجہ و دلچسپی کا مرکز ہوتی ہیں وہ ہماری ہی طرح ہمیشہ تغیّر و دگرگونی کا شکار رہتی ہیں۔ اگر زندگی میں حوادث کا مدوجذر ختم ہو جائے' ایک طرح

کا سکوت طاری ہو جائے، تو وحشت انگیز تاریکی ہمیں چاروں طرف سے گھیر لے گی اور ہم مایوسی کا شکار ہو جائیں گے، نہ کسی چیز سے انسیت ہو گی اور نہ کوئی امید باقی رہے گی۔ یہ وہ حالت ہے کہ کمزور اعصاب کے افراد ان مواقع پر خودکشی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔

"مارکوس" کہتا ہے۔

"اگر خدا پیشِ نظر ہو تو موت بھی کس قدر شیریں ہے اور اگر خدا مدِ نظر نہ ہو تو زندگی بھی کس قدر تلخ ہے۔ بعض اوقات مذہبی افکار و خیالات ہمیں مادّی حدود سے بلند و بالا کر دیتے ہیں۔ اپنی فکر کو زندگی کی حدود و قیود سے آزاد کر کے اسرارِ ابدیت، رموزِ مرگ و حیات اور کائنات کی گہرائیوں پر غور کیجئے۔ صرف یہی وہ راہ ہے جو زندگی کے اضطرابات سے نجات دلا سکتی ہے۔ اپنے بچکانہ خیالات کو پیروں تلے روند کر آگے بڑھ جایئے اور افکار و تصوّرات کی دنیا میں جمال، ظرافت، مسرّت اور سعادت کو تلاش کیجئے۔"

(در جستجوی خوش بختی۔ ص ۲۰۷، ۲۱۳ اور ۲۱۷)

عظیم نفسیات داں "ڈیل کارنیگی" کہتا ہے کہ۔

"قرض، تنگدستی اور بدحالی کی وجہ سے میرے والد کی صحت تباہ و برباد ہو گئی۔ معالجوں نے میری والدہ کو بتایا کہ ان کے شوہر مزید چھ ماہ سے زیادہ جی نہیں سکیں گے۔ اس دوران میرے والد نے بارہا گلے میں پھندا ڈال کر یا دریا میں کود کر خودکشی کی کوشش کی.....

کئی سال بعد میرے والد نے مجھے بتایا کہ اس زمانے میں مجھے خودکشی

سے باز رکھنے کا واحد سبب تمہاری ماں کا راسخ اور غیر متزلزل ایمان تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر ہم خدا سے لو لگائیں اور اس کے احکامات کی تعمیل کریں تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔۔۔

اس کا کہنا درست تھا، آخر کو تمام کام ٹھیک ہو ہی گئے۔ میرے والد نے اس کے بعد مزید ۴۲ سال خوش و خرم زندگی بسر کی۔ رنج والم سے بھرپور ان برسوں میں میری ماں کبھی گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار نہ ہوئی۔ ہمیشہ درگاہِ خدا میں اپنی مشکلات و پریشانیاں بیان کرتی رہتی۔ سب سے الگ تھلگ اور چھوٹے سے اس دیہاتی مکان میں دعا مانگتی رہتی کہ خداوندا! ہمارے لئے اپنی محبت اور پشت پناہی سے دریغ نہ فرما۔

جس طرح بجلی و آب و ہوا اور اچھی غذا کے فوائد و خصوصیات میری پرورش میں موثر و اہم ہیں اسی طرح مذہب پر ایمان کے منافع بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ بجلی، پانی اور غذا ایک بہتر اور پُر آسائش زندگی بسر کرنے میں میرے مددگار ہیں لیکن دین کا فائدہ اور قدر و قیمت ان سب سے کہیں زیادہ ہے۔

دین مجھے ایمان، امید اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔ مجھ سے ہیجان، اضطراب، خوف اور پریشانی کو دور رکھتا ہے اور میری زندگی کے لئے ایک راستے اور مقصد کا تعیّن کرتا ہے۔ دین میرے سامنے اس قدر مکمل سعادت و خوش بختی پیش کرتا ہے، میری حفاظت اور سلامتی کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ میں زندگی میں اٹھنے والے سرکش

طوفانوں کا بھی سکون ووقار کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہوں۔" (آئینِ زندگی)

بیسویں صدی کا معروف سائنس دان آئن اسٹائن مذاہب کی تقسیم بندی کے دوران' تیسری نوع کے مذہب جسے وہ "مذہبِ ہستی" کا نام دیتا ہے کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے اس احساس کے بارے میں جسے یہ مذہب بخشتا ہے یوں لکھتا ہے۔

"اس مذہب میں فرد انسانی خواہشات و اہداف کو معمولی و ناچیز اور اس عظمت و جلالت کو محسوس کرنے لگتا ہے جو موجودات سے ماوراء اور فطرت و افکار میں نمایاں ہے۔ وہ اپنے وجود کو ایک طرح کا زندان تصور کرتا ہے چنانچہ چاہتا ہے کہ اس قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے اور تمام عالم کو یکبارگی ایک حقیقتِ واحد کے عنوان سے پالے۔" (دنیائی کہ من بینم۔ص ۵۷)

اکثرلوگوں کی بے چینی ودلی اضطراب کا سبب زندگی کے بارے میں ان کے طرزِ تفکر میں تلاش کرنا چاہئے۔ ان کا تصوّر ہے کہ انہیں اس دنیا میں بے قیدوبند یہاں کی لذّتوں سے بہرہ مند ہونے کے لئے بھیجا گیا ہے اور کیونکہ یہاں ان کا اس تصوّر کے برخلاف حالات سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے ان میں سے اکثر کائنات' اس کی موجودات اور اپنے حالات کے بارے میں حرفِ شکایت لبوں پر لاتے ہیں۔

جس طرح پانی کی مدد سے آگ ٹھنڈی کی جاسکتی ہے اسی طرح دوسروں کے درد وغم پر توجہ مبذول کر کے اپنے رنج والم کو فراموش کیا جا سکتا ہے۔

لیکن بعض لوگ اس خام خیالی کا شکار ہوتے ہیں کہ دنیا کا ہر رنج والم ان ہی پر آپڑا ہے اور حالات انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ مصائب کے بوجھ سے دُہری ہونے والی اپنی کمر سیدھی کرلیں۔ ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے بارے میں ان کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا ہے اور وہ یہ تصوّر کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رفاہ و آسائش میں ہیں اور زندگی کے مصائب ومشکلات میں سے کچھ بھی ان کے حصّہ میں نہیں آیا ہے۔

لامحدود توقعات

توقعات کا دامن وسیع کرنا بھی غم واندوہ' یاس وحسرت کا سبب بنتا ہے۔ واقع بین نگاہیں رکھنے والے حضرات حدِّ اعتدال سے زیادہ مال و دولت کو خوش بختی' کامیابی اور آسودگیٔ خاطر کے حصول کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ خوش بختی وبد بختی' آسودگی وبے قراری میں مال ودولت' شکوہ وحشمت موثر نہیں۔ اس دنیا میں ایسے تنگ نظر تونگر بھی ملیں گے جو عین ثروت مندی کے عالم میں بھوکے اور تمام آسائشوں سے دور ہوں گے اور بہت سے ایسوں کو بھی پائیں گے جو دولت کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے اپنی غربت کا رونا رو رہے ہوں گے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے۔

"لا كنز اغنى من القناعة ولا مال اذهب للفاقة من الرضى بالقوت، ومن اقتصر على بلغة الكفاف فقد انتظم الراحة"

"قناعت سے زیادہ بے نیاز کر دینے والا کوئی خزانہ نہیں۔ قوت

لایموت (اس قدر جو زندگی کی بقاء کے لئے کافی ہو) پر راضی رہنے سے بڑھ کر کوئی مال نہیں اور جس نے گزارے کے لائق پر اکتفا کیا اس نے اپنی راحت کا انتظام کیا۔"

(نہج البلاغہ فیض۔ص ۱۲۵۰)

ماہرینِ نفسیات کا بھی یہی کہنا ہے کہ جوں جوں توقعات بڑھتی ہیں پریشانی ورنجیدگی کا گراف بھی بلند ہونے لگتا ہے۔ جو شخص اعتدال و قناعت کا اصول اپنالیتا ہے وہ قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔

علمِ نفسیات کا ایک اصول "اصولِ آسودگی" کہلاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق توقعات جتنی کم ہوں گی آسودگی اتنی ہی زیادہ ہوگی' اس کے برعکس توقعات جس قدر زیادہ ہوں گی آسودگی اتنی ہی کم ہوگی۔

ہم کم توقعات رکھ کر اپنی ناکامی ونامرادی کے احتمالات کو اسی قدر کم کرلیں گے اور اس کے نتیجے میں امید وبیم' بے قراری و بے اطمینانی اور حصولِ کامیابی سے پہلے جو جانکاہ انتظار ہوتا ہے اس کا آزار خود بخود گھٹ جائے گا۔ درحقیقت اصولِ آسودگی "قناعت" ہی کا دوسرا نام ہے۔

توجہ رہے کہ قناعت یا "اصولِ آسودگی" سے مراد یہ نہیں کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور ہر قسم کی فعالیت وجدوجہد سے ہاتھ کھینچ لے۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ انسان اپنی حدود' استعداد اور امکانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قناعت اختیار کرے۔ بالفاظ دیگر انسان کو اپنی صلاحیتوں اور توانائی سے زیادہ توقعات نہیں رکھنا چاہئیں۔

حیاتِ جاویداں سے لگاؤ

اسلام قلب میں حیاتِ جاویداں کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ ہر چند روزِ قیامت پر ایمان کہ جو ایک زندہ اور حقیقی ایمان ہے انسانوں کو محسوسات کی حدود سے بلند وبالا کرتا ہے اور ان کی قوتوں کو اعلیٰ ترین انسانی اہداف کو جامہ عمل پہنانے پر ابھارتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کو متاعِ دنیا سے مستفید ہونے سے نہیں روکتا۔ بس نفس کی من مانی پر پابندی لگاتا ہے۔ گویا ایک سرکش گھوڑے کے منہ میں لگام دے دیتا ہے تاکہ وہ راہِ راست پر چلتا رہے اور حرص وطمع کے مارے دیوانہ وار دوڑتا ہوا خود کو ہلاکت کے گڑھے میں نہ گرالے۔

جب انسان اس بات پر اعتقاد رکھتا ہو کہ دنیا کی فرصت کم اور محدود ہے۔ اور دنیا کی نعمتیں بے شمار ہونے کے باوجود آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے مقابلے میں مقدار میں بھی کم ہیں اور معیار میں بھی' تو اس کی نظر میں کائنات کی رنگینیاں اور لذّتیں بے رنگ وبے مزہ ہو جاتی ہیں اور اسے ان سے محرومی پر کسی حسرت و افسوس کا احساس نہیں ہوتا۔ اور وہ اس بات سے کہ اسے حسبِ توقع کچھ حاصل نہیں ہوا' اضطراب اور غم وغصّہ کا شکار نہیں ہوتا۔ ایسا انسان مادّی نعمتوں سے بہرہ اندوزی میں اس جلد باز شخص کی سی تیزی نہیں دکھاتا جو موت کو اپنے قریب دیکھتے ہوئے بے قراری کا شکار ہو۔ بلکہ وہ ایک گونہ قلبی اطمینان اور آسودگیِ ضمیر کا حامل ہوتا ہے۔ اور بے شک زندگی کی جن لذّتوں سے وہ عقل و متانت کی رو سے استفادہ کررہا ہوتا ہے ان کے ذریعہ اپنے اعتماد و سکون میں اضافہ کرتا ہے۔ بنابراین ایک مومن جانتا ہے

کہ یہ نعمتیں خود ہدف وغایتِ زندگی نہیں کہ انسان اپنی تمام عمر ان کے حصول کی جدوجہد میں صرف کردے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی روح کا توازن کھو بیٹھے بلکہ یہ بہتر اور مالی اہداف کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

جانکاہ دباؤ اور اندوہ واضطراب انسانی جسم کے ضعف وبیماری پر منتج ہوتا ہے۔ جسمانی سلامتی اور صحت کی حفاظت کے لئے روح پر غم واندوہ اور اضطراب وتشویش کو مسلط نہیں ہونے دینا چاہئے اور اپنے وجود کو تخریبی قوتوں کے تسلّط میں نہیں دینا چاہئے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"الحزن یهدم الجسد"

"غم واندوہ بدن کی عمارت کو منہدم کردیتا ہے۔"

(غررالحکم۔ص ۲۳)

"الهم ینحل البدن"

"رنج وغم بدن کو گھلا کر رکھ دیتے ہیں۔" (غررالحکم۔ص۱۶)

"تجرع الغصص فانی لم ارجرعة احلی منها عاقبةولا النمغبة"

"غصہ پی لیا کرو اور اسے بھول جایا کرو۔ کیونکہ اس تلخ گھونٹ کو پی لینے کا نتیجہ بہت شیریں اور اس کی انتہا بہت لذّت بخش وگوارا ہے۔" (غررالحکم۔ص۳۵۱)

سائنسی تحقیقات بھی یہ ثابت کرتی ہیں کہ بعض جسمانی بیماریوں کا سبب پریشانی اور ذہنی کرب ہے۔

مشہور ماہرِ نفسیات "ایل مون" کہتا ہے۔

"ہیجان و اضطراب کے جسمانی ردِ عمل سے متعلق جو تحقیقات کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی ہیجانی کیفیت رونما ہوتی ہے تو جسم کا پورا اعصلاتی نظم حرکت میں آجاتا ہے۔ دل کی دھڑکنیں، پسینے کے غدود، معدہ سے خارج ہونے والا رقیق مادہ جو غذا ہضم کرنے میں معاون ہوتا ہے اور دماغ کے ذریعہ پورے جسم کو کنٹرول کرنے والی لہروں کے افعال متاثر ہوتے ہیں۔ بدن کے اندر رطوبت چھوڑتے رہنے کا جو کام غدود انجام دیتے ہیں وہ بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ان چیزوں کی حالت میں پائے جانے والے تغیّر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان ہیجان میں مبتلا ہے۔ خاص کر ایڈرنالین نامی غدود اس سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جگر سے شکر کا مادہ باہر نکالتا رہتا ہے اور اس طرح جسمانی نظام کو شکر کی توانائی سے استفادہ کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ایک جدید طبی شعبہ سائیکٹرک جو جسم کی ایسی بیماریوں کے بارے میں بحث کرتا ہے جن کے اسباب نفسیاتی ہوتے ہیں، خاص طور پر جو بیماریاں اضطراب و ہیجان کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ اس شعبہ کی تحقیقات کے مطابق معدہ کے زخم میں مبتلا ۷۵ مریضوں میں سے ۶۳ شدید اضطراب کا شکار ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں دیکھا گیا ہے کہ جس عرصہ میں مریض شدید اضطراب سے دوچار ہوتا ہے اس کے دوسرے ہفتے کے اختتام پر اس کے

معدے کی دیواروں سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگتا ہے اور تیزابیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ معدہ پر ایک چھوٹا سا زخم ہو گیا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اضطراب کے باعث معدے کے افعال میں بہت زیادہ تیزی آجاتی ہے اور اسی بناء پر اس کی دیوار میں زخم (السر) پیدا ہو جاتا ہے۔"

(اصولِ روان شناسی، مان - ص ۱۳۶، ۱۳۹)

ایک باشعور انسان کو ناپختہ ذہن کے لوگوں سے ممتاز بنانے والی چیز "تخیّل" ہے۔ سطحی نظر رکھنے والا اور گہری سوچ وبچار نہ کرنے والا ظاہر بین انسان اپنی قوتِ تخیّل کا اس درجہ شیفتہ ہوتا ہے کہ ہر دم اس کے دل میں بے پایاں خواہشات و آرزؤں کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ حالات کو ان آرزؤں کے برخلاف پاتا ہے تو اس کی روح پر وحشت اور اندھیرا طاری ہو جاتا ہے۔ اپنے ہوش کھو دیتا ہے اور اس بُحران سے دوچار شخص اگر ضعفِ نفس میں بھی مبتلا ہو تو اس کا انجام خودکشی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس واقع بین انسان بچکانہ اور بے بنیاد افکار کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کی نظر وسیع و عمیق ہوتی ہے، وہ چیزوں کو سرسری وطائرانہ نظر سے نہیں دیکھتا اور اپنی زندگی میں موہوم و طلسمی خیالات کو نفوذ کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی زندگی کو قدرتی، اجتماعی اور بالآخر داخلی وخارجی حقائق کے ساتھ گزارے۔

حقیقتاً معتدل اور متوازن روح کا حامل شخص بید کی مانند ہوا کے جھونکوں پر نہیں لرزتا۔ بعض افراد فراغت کے اوقات میں یکدم بے چینی و اضطراب کا

اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر کافی روحانی قوت نہیں پائی جاتی اور وہ کسی محکم پناہ گاہ کے مالک نہیں ہوتے۔ لہٰذا وقت گزاری کے لئے زیاں بار اور غیر صحت مند تفریحات کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن جس انسان کے اندرونی قویٰ مضبوط ہوں وہ کبھی خارجی دنیا کی محتاجی کا احساس نہیں کرتا۔ جو ملک درآمدات پر کم انحصار کرتا ہے اس کی اقتصادی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں، جس ملک کی داخلی پیداوار کافی ہو اور اس کے لئے بیرونی امداد ناگزیر نہ ہو تو وہ خود کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اپنی اخلاقی خصوصیات میں تعادل پیدا کیجئے اور نفس پر پڑنے والے خارجی عوامل کو تبدیل کیجئے۔

"جان جاک روسو" کہتا ہے۔

"بدبخت ترین انسان وہ ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ بدبختی یہ نہیں کہ انسان کے پاس کسی چیز کی کمی ہو بلکہ بدبختی یہ ہے کہ انسان اس چیز کی سخت ضرورت محسوس کرے جو اس کے پاس نہ ہو۔

حقیقت کی دنیا کی ایک حد ہوتی ہے لیکن خیالات کی دنیا کی کوئی حد مقرر نہیں۔ ہم حقیقت کی دنیا کو بے انتہا وسیع نہیں کر سکتے۔ لیکن خیالات کی دنیا کو محدود کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ہماری وہ پریشانیاں جو ہمیں واقعاً بدبختی کے گڑھے میں پھینک دیتی ہیں ان ہی دونوں چیزوں کے درمیان پائے جانے والے عدم توازن کا نتیجہ ہیں۔

دور اندیشی ہمیں ہمیشہ مستقبل کی جانب متوجہ رکھتی ہے۔ ہماری

بد بختیوں کے حقیقی سرچشمہ میں اس کا شمار نہیں ہوتا۔ انسان جو خود ایک ناپائیدار موجود ہے وہ کیوں حال کو بالکل نظرانداز کر کے اس قدر وسوسوں کا شکار ہوتا ہے کہ اس کی تمام توجہ اس مستقبلِ بعید پر ہو جاتی ہے جس تک وہ ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ یہ وسوسہ اُس لئے مضر ہے کہ سال بہ سال اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے اور ایک مرتبہ اس مرحلہ پر جا پہنچتا ہے کہ عمر رسیدہ لوگ جو دوسروں کی نسبت زیادہ شکی' دوراندیش اور خسیس ہوتے ہیں وہ حال کی ضروریات پر سو سال بعد کی ضروریات کو ترجیح دینے لگتے ہیں تاکہ اس وقت ان چیزوں کی قلت کا شکار نہ ہوں۔

اس طرح انسان خود کو اشیاء سے وابستہ کرلیتا ہے اور اس کی نظر میں زمان' مکان اور اشیاء اہم ہو جاتی ہیں۔ پھر ہماری فردیت ہمارے وجود کے چھوٹے سے حصّے میں مکمل نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں ہم میں سے ہر ایک اپنے وجود کو پورے قطعہ، زمین پر پھیلا دیتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں حسّاس ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ہمارے دردوں کا بڑھ جانا کیا تعجب کی بات نہیں؟ بہت سے ایسے تاجر حضرات بھی ہیں کہ اگر کوئی ہندوستان میں ترقی کرتا ہے تو یہ اس کے خلاف پیرس میں شور شرب شروع کر دیتے ہیں۔ ہم جس جگہ ہیں وہاں وجود نہیں رکھتے بلکہ جہاں نہیں ہیں وہاں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اگر وہ چیز جس کی خاطر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں کہیں ایک جگہ جا کر رک جائے۔ تو ہمارے پاس موت سے خوف کی کوئی دلیل نہیں۔

اے انسان !اپنی زندگی کو خود اپنے میں محدود رکھ اور بد بختی سے نجات حاصل کر۔" (امیل۔ص ۹۳'۹۰)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"اصبر واعلی الدنیا فانما ھی ساعة فما مضی منه فلا تجدله المأ ولا سرورأ ومالم یجیء فلا تدری ماھو وانما ھی ساعتک التی انت فیھا فاصبر فیھا علی طاعة اللّٰه واصبر فیھا عن معصیة اللّٰه۔"

"دنیا کے معاملے میں صبر سے کام لو۔ یہ لمحہ بھر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس لمحہ میں سے بھی جو وقت گزر چکا ہے نہ تو تم اس کا کوئی رنج محسوس کر رہے ہو اور نہ ہی اسکا کوئی سرور تمہیں اس وقت کوئی مزہ دے رہا ہے اور جو وقت ابھی نہیں آیا ہے تم نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہوگا۔ اب بس یہی زمانہ حال کا عرصہ تمہارے اختیار میں ہے۔ پس اس عرصے میں اللہ کی اطاعت کے سلسلے میں ثابت قدمی سے کام لو اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرو۔"

(اصولِ کافی جلد ۲۔ صفحہ ۴۵۴)

اگر ماضی یا مستقبل پر توجہ زمانہ حال کی دشواریوں سے فرار کی خاطر ہو تو ماہرینِ نفسیات کی نظر میں یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے' یا ایک نفسیاتی بیماری کا پیش خیمہ ہے۔ ماہرین کہتے ہیں۔

"اگر کوئی یہ طے کرلے کہ زمانہ حال پر توجہ نہ دوں گا اور جو موقع آج میسّر ہے اس سے استفادہ نہ کروں گا اور ہمیشہ اس خیال میں مگن

رہے کہ "ٹھیک ہے کہ میں تعلیمی لحاظ سے اچھا نہیں جارہا ہوں' لیکن صبر کرو جب میں عملی زندگی میں قدم رکھوں گا تو دیکھنا کیا کارنامے انجام دیتا ہوں۔ اکثر وہ لوگ جن کا تعلیمی ریکارڈ اچھا نہیں رہا ہے عملی زندگی میں کامیاب رہے ہیں۔ میں بھی اپنے مستقبل سے بہت پُر امید ہوں۔"

ایسے خیالات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ انسان حقیقی زندگی یعنی زمانہ حال سے فرار چاہتا ہے۔ ایک ماہرِ نفسیات بخوبی جانتا ہے کہ ایسی باتیں درست اور حقیقت کے مطابق نہیں اور ان کی حیثیت لغو اور غیر منطقی استدلال سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مستقبل کے بارے میں ایسے خیالات مضر ہیں اور تقریباً یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسے خیالات رکھنے والا انسان زمانۂ حال کی مانند مستقبل میں بھی ناکام رہے گا۔

چنانچہ گزشتہ اور آئندہ ہی کے بارے میں سوچتے رہنا وقت اور صلاحیتوں کے زیاں کا باعث ہوتا ہے۔ اس طرح انسان روزمرّہ زندگی میں پیش آنے والے امور کی جانب سے غافل ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص (ABNORMAL) ہے اور اس کے لئے کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔

اگر انسان مشکلات کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور ان سے فرار کی غرض سے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتا ہے تو اس کا یہ طرزِ عمل جو اس کی مشکلات رفع نہ کرسکے بے سود اور ضرررساں

ہے۔" (روان شناسی برای زیستن۔ص ۲۳۸)

دنیا بھر کے حریت پسندوں کے قائد حضرت امام حسین ابنِ علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اذا وردت بلية على العاقل تحملها وقمع الحزن بالحزم وفرغ العقل للاحتيال"

"اگر عاقل و خردمند شخص پر کوئی اُفتاد آپڑے تو اندوہ گین نہیں ہوتا بلکہ صبرو تحمل سے برداشت کرتا ہے۔ دانائی و دور اندیشی کے ذریعہ دل پر چڑھے ہوئے رنج والم کے زنگ کو دور کرتا ہے اور قوتِ عقل کے ذریعہ اس کی چارہ جوئی کرتا ہے۔"

ہم ہر سمت سے پڑنے والی مصیبتوں اور آزمائشوں کا ان قوتوں سے مقابلہ کرسکتے ہیں جو ہمیں میسّر ہیں۔ اس مقابلہ میں جوں ہی سکوت واقع ہوتا ہے' ساکت قوتیں بارِ گراں کی مانند ہمیں آزار پہنچانے لگتی ہیں' پھر انسان مجبوراً ان قوتوں کو فضول خرچ کرنے لگتا ہے۔

ہیجان' اضطراب اور غم واندوہ کی تکلیف سے نجات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا شکار انسان مثبت کاموں میں مصروف ہوجائے۔ جو لوگ داخلی کشمکش کے موقع پر یہ طریقہ کار اختیار کرتے ہیں وہ اس دوران آسودہ رہتے ہیں اور جب اپنی ان سرگرمیوں کے ثمرات دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اپنے اندر اطمینان و آسودگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اگرچہ یہ بھی ایک طرح سے پریشانیوں سے فرار ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن پریشانی کا یہ ایک مفید اور اطمینان بخش ردِّعمل ہے اور اس ذریعہ سے

انسان کچھ دیر کے لئے آسودہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو کوئی لاینحل مسئلہ درپیش ہو تو اسے اس کی پریشانی سے نجات مل جاتی ہے۔ خاص طور پر اگر کوئی ایسا کام کیا جائے جو دوسروں کے لئے مفید ہو تو وہ کام خود کرنے والے کے لئے بھی سودمند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص دوسروں کے لئے تو مفید ہو لیکن خود اپنے لئے سودمند نہ ہو۔ مزید یہ کہ اس طرح انسان فضول کاموں کی جانب راغب ہونے سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

دوستوں کے سامنے دل کی گرہ کھول دینا

مخلص اور وفادار دوستوں کے سامنے دردِ دل بیان کر دینا بھی غم واندوہ سے نجات کا ایک ذریعہ ہے۔ غم زدہ اور پریشان حال لوگوں کو یہ موقع فراہم کرنا چاہئے کہ وہ اپنے دل کی بات دوستوں اور بہی خواہوں کے سامنے بیان کر دیں، اپنی مشکلات کا اظہار کریں اور اس طرح اپنی روح سے غم واندوہ کا دباؤ کم کریں

اسی طرح غم زدہ اور ابتلاء و آزمائش میں مبتلا دوست کے دل کی بات سننا اور حتیٰ الامکان اس کی مشکلات کے حل کے لئے کوشش کرنا حسّاس اور اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔ جس شخص کی دوستی سچّی اور حقیقی محبت کی بنیاد پر استوار ہے وہ مشکلات اور بحران کے موقع پر اپنے دوست کی مدد سے غافل یا لاتعلق نہیں رہتا۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"احب الاعمال الی اللہ سرور یدخلہ علی مؤمن

یطرد عنہ جوعتہ و یکشف عنہ کربتہ"

"خداوندِ عالم کے نزدیک بہترین عمل یہ ہے کہ انسان اپنے برادرِ مومن کی خوشحالی اور دلی مسرّت کا ذریعہ بنے اور اس کی روح سے غم واندوہ کا غبار دور کرے۔" (اصول کافی۔ ص ۴۰۵)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"اذا ضاق احدکم فلیعلم اخاہ ولا یعین علی نفسہ"

"جب بھی تم میں سے کوئی کسی مشکل میں گرفتار ہو تو اسے اپنے برادرِ مومن کے سامنے بیان کرے تا کہ وہ تمہارے دل سے غم واندوہ کی سیاہی کو صاف کر دے۔" (وسائلِ شیعہ جلد ۲۔ ص ۵۵)

مشہور ماہرِ نفسیات "شاختر" کہتا ہے۔

"اگر آپ ناگوار اور مشکل حالات کا شکار ہیں اور ان سے نجات پر قادر نہیں تو اپنے راز کو اپنے قابلِ اطمینان اور عاقل شخص کے سامنے بیان کیجئے۔ غم انگیز خیالات اور خوف وتشویش کو دل میں لئے پھرنا ان کی قوّت وقدرت میں اضافہ کا موجب ہے۔ راز کو زبان پر لائیے اور دانا و تجربہ کار شخص سے نصیحت حاصل کیجئے۔ ایسے شخص کے روبرو جانے ہی سے پریشانی آدھی رہ جاتی ہے۔ کسی ماہرِ نفسیات یا سمجھدار دوست سے اپنا دردِ دل مت چھپائیے۔ اس لئے کہ شعور میں پائے جانے والے کھٹکتے ہوئے افکار ہمیشہ اطمینان و آسودگی میں خلل ڈالتے ہیں اور سعادت کی راہ کے کانٹے ثابت ہوتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رکھئے کہ پریشانی دو طرح سے دور ہو سکتی ہے یا تو

قدرتی طور پر اور اچانک ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی۔ یعنی ہمارا ذہن باعثِ تشویش افکار کو بغیر اس کے کہ ہم متوجہ ہوں فراموشی کے غار میں پھینک دے۔ یا پھر ہم رنجیدہ کردینے والے ان افکار سے عمداً اور دانستہ طریقہ سے چشم پوشی برتیں اور انہیں دل میں نہ لانے پر مصر ہوں۔

نفسیات کی اصطلاح میں اس عمل کو "حذف" کہتے ہیں۔ لیکن اس عمل سے ذہن کی خلش کم نہیں ہوتی اور جس قدر ہم اسے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ ہماری یادوں میں آتی رہتی ہے اور رنج وملال میں اضافہ کا سبب بنی رہتی ہے۔ بہرحال دانستہ یا نادانستہ ہر خلش اور ملال انگیز فکر جسے ہم دفع یا حذف کرتے ہیں ہماری جان نہیں چھوڑتی اور پنہاں یا آشکارا طور پر ہمیں رنج واذیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ جب تک کہ اس مسئلہ کو کسی عقل مند کے سامنے نہ پیش کردیں اور اس سے مدد ونصیحت نہ حاصل کریں اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔" (رشدِ شخصیت۔ص ۱۱۰-۱۰۹)

اظہارِ مسرّت

جب دل میں اضطراب اور غم واندوہ کا ہجوم ہو تو اسے کم کرنے کا ایک مفید اور موثر عامل مسرّت وشادمانی کا اظہار کرنا ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔

"کن بالبلاء محبوراً وبالمکارہ مسروراً"

"مصیبت کے عالم میں بھی مطمئن نظر آؤ اور مشکلات کے باوجود خوش باش رہو۔" (غرر الحکم۔ص ۵۶۵)

"کن راضیاً تکن مرضیا"

"ہر حال میں راضی رہو تاکہ پسندیدہ قرار پاؤ۔"

(غرر الحکم۔ص ۵۶۴)

آج کے ماہرینِ نفسیات کی بھی یہی رائے ہے کہ خوشی کا اظہار غم کے دباؤ کو کم کردیتا ہے اور انسان کی شخصیت کو بلند کرنے میں موثر ہے۔

ماہرینِ نفسیات کچھ یوں ہدایت دیتے ہیں۔

"کوشش کیجئے کہ ہمیشہ آپ کا چہرہ خوشی سے کھلا رہے۔ ہر وقت ہشاش بشاش نظر آیئے۔ خود کو اس طرح غم واندوہ سے مبرّہ ظاہر کیجئے کہ جو کوئی بھی آپ کو دیکھے آپ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔ اگر آپ غم واندوہ یا غصّہ کی حالت میں ہیں تو کوشش کیجئے کہ دوسروں کے سامنے آپ کی یہ کیفیت ظاہر نہ ہو۔ یوں ظاہر کیجئے کہ آپ مطمئن ومسرور ہیں۔

جب آپ خوش وخرم نظر آئیں گے اور دوسروں پر بھی اس کا اظہار کریں گے تو وہ بھی آپ سے دوستانہ طریقے سے پیش آئیں گے اور آپ سے ہر موضوع پر گفتگو کریں گے اور لطف اندوز ہوں گے۔

اس طرح خوش رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ دوسروں کی توجہ اپنی جانب آسانی سے مبذول کرسکتے ہیں اور ہر دل عزیز بن سکتے ہیں۔

اظہارِ مسرّت کے لئے چہرہ سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پیشانی پر بل نہیں آنا چاہئے۔ لب پر ہمیشہ تبسم رہے۔ خود آپ کے دل پر اس کے صحت مند اثرات مرتب ہوں گے۔

خوش نظر آنا غموں کو کم کرنے کا ذریعہ ہے۔ لوگ مغموم نظر آنے والوں سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ہشاش بشاش چہرہ ہر کسی کو بھلا لگتا ہے۔ بزرگی و عظمت مغموم نظر آنے میں نہیں۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پیشانی پر بل ڈالے رکھنے سے رعب وداب بڑھتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس طرح آپ لوگوں کو خوفزدہ تو کر سکتے ہیں لیکن انہیں مرعوب نہیں کر سکتے۔ آپ لبوں پر مسکراہٹ تو بکھیریئے پھر دیکھئے کیسے چٹکیوں میں آپ کا غم دور ہوتا ہے۔" (روان شناسی برای زیستن۔ص ۷۸'۷۷)

چھٹا باب

زندگی پر نیکیوں کے اثرات

باہمی تعاون کی بنیاد

لطیف جذبات واحساسات جو انسان کی روح کی گہرائیوں سے ابھرتے ہیں اور بنی نوع انسان کے ساتھ گوناگوں نیکیوں، تعاون اور مدد کی صورت میں نمودار ہو کر قرطاسِ زندگی کو رونق بخشتے ہیں انسان کی اعلیٰ ترین فطرت میں سے ہیں۔ یہی احساسات دوسروں کو مشکلات، سختی اور مصائب میں مبتلا دیکھ کر انسان کو ان کی مدد اور اس راہ میں ہر قسم کے ایثار و قربانی پر ابھارتے ہیں۔

خوشی غمی، فقر و غنا انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ان سے مفر ممکن نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اکثر مشکلات و مصائب اور دلخراش آلام اپنی تلخی و ناگواری کے باوجود قابلِ علاج بھی ہیں اور ان کے عوامل کو عواطف و احساسات کے سرچشمہ سے ابھرنے والے باہمی تعاون کے جذبات کی مدد سے ختم کیا جاسکتا ہے۔

انسان محض اس مادّی پیکر کا نام نہیں بلکہ خوبی، دانائی، زیبائی اور اقدار کی حامل ہستی ہے۔ انسان کا دوسرے انسانوں سے رابطہ بے لوث محبت و انسیت اور باہمی تعاون کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے تاجرانہ ذہنیت، ریاکاری اور مجبوری کی بنا پر نہیں۔

اپنے ہم نوعوں کی مشکلات حل کرنا اور انہیں بحرانوں سے نکالنا ایثار و قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ "باہمی تعاون" کی بنیادوں کی ایک اینٹ حسِّ مہربانی، فداکاری اور ایثار ہے۔ ایسے افراد اور معاشرے جو اپنی اجتماعی سرگرمیوں میں اس حس کو اہمیت دیتے ہیں وہ کمال کے درجہ پر جا پہنچتے ہیں۔

جو لوگ زندگی کی قدر و قیمت جانتے ہیں انہیں سب سے پہلے زندگی کی خدمت کرنا چاہئے اور ایک صحت مند اور طاقتور معاشرہ کے قیام کے لئے اپنا معیّن کردار ادا کرنا چاہئے۔ جس قدر لوگوں کے جذبات و احساسات میں شدّت ہو گی اور اجتماعیت کے تصور میں اضافہ ہو گا اسی قدر وہ ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کا خیال رکھیں گے۔ مثبت افکار اور ایک دوسرے سے ہمدردی کے جذبات کمالِ آدمیت کا نشان ہونے کے ساتھ ساتھ خود فرد کی زندگی کے لئے ایک صحت مند ماحول کی تشکیل میں بھی مددگار ہیں۔ کیونکہ علمِ عمرانیات کی رو سے ثابت ہے کہ خود اپنے بارے میں فکر مند رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کی بھی فکر کرنے لگتا ہے اور دوسروں کی مدد و نصرت اور ان سے تعاون و ہمکاری پر آمادہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ :

"اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے نیز جو بوؤ گے وہ کاٹو گے۔"

اسی بناء پر انسان میں موجود فضائل اور اس کی شخصیت اجتماعی طرزِ تفکّر اور عادات و رسوم کے محور پر گردش کرتی ہے۔

اس کے برعکس افراد اور معاشروں میں اس جذبہ کا فقدان ان کے وجود میں اختلال اور ان کی پسماندگی کا عکاس ہے۔ دوسروں کے معاملات سے بے تعلقی، بے غمی اور اخلاقی ذمہ داریوں کے احساس کا نہ پایا جانا روح کی بیماری اور

اجتماعی سعادت کی راہ میں رکود کا آئینہ دار ہے۔ اس جذبہ کے فاقد افراد اپنی زندگی کی سلامتی اور کامیابی کی دوسروں سے وابستگی کو درک نہیں کرپاتے۔ ایسا معاشرہ بالکل اس ڈوبتی ہوئی کشتی کی مانند ہے جس کے مسافر اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش میں کشتی کو ڈوبنے میں مدد دے رہے ہوں۔ بے شک ایثار و فداکاری کی خو آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔ ایک دانشور کے بقول۔

"ابتدائی مراحل میں نیکوکاری مشکل محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں ہم اس راہ پر قدم بڑھاتے ہیں، ہماری اس توانائی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا اچھے کام ان ماؤں کی مانند ہیں جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ بچے جنتی ہیں۔"

در حقیقت خدمتِ خلق اور فداکاری و ایثار ایک ایسے شخص کے لئے مشکل کام ہے جو راحت طلب ہے۔ ہر چیز کی صرف اور صرف اپنے لئے طمع کرتا ہے اور اس سلسلہ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔

کیا زندگی میں کوئی ایسا کام بھی ہے جو مشکل نہ ہو؟ ہر حرکت اور ہر کوشش مشکلات کا دروازہ کھولنے کا سبب ہے۔ حتیٰ تفکّر و تعقّل بھی زحمت طلب کام ہے۔ المختصر ہم مسلسل جہد و کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ دو کوششوں میں سے ایک ہمیں بینا بناتی ہے۔ جس کے ذریعہ فکر و خیال کا افق وسیع ہوتا ہے، جو حق و حقیقت تک پہنچانے کا موجب ہے، انسان کو زمانہ کی حقیقت و اصلیت سے آگاہ کرتی ہے اور آخرت میں اس کے لئے عالی ترین اجر و ثواب کی راہ ہموار کرتی ہے۔ جبکہ دوسری کوشش انسان کو انحراف و گمراہی میں مبتلا اور حقیقتِ واقعی سے دور کردیتی ہے۔

ایسی کاوش جو محض فردیت کی تقویت کا باعث ہو اور حدود و قیود کی حامل ہو معقول نہیں اور ان قوتوں کے انتشار و اضمحلال پر منتج ہوتی ہے جو انسان کو اخلاقی سلوک کی پابندی پر اکساتی ہیں۔

بہت سے لوگ خود کو عواطف و جذبات کا حامل قرار دیتے ہیں اور دوسروں کے مصائب و آلام پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کے تدارک کے لئے کسی قسم کی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اگر ان پر کوئی ایسی ذمہ داری ڈالدی جائے جس میں انہیں کچھ مال خرچ کرکے کسی کی محرومی کو دور کرنا پڑے، یا کوئی زحمت برداشت کرنا پڑے یا کسی لذّت سے چشم پوشی کرنا پڑے تو وہ فوراً پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان لوگوں نے خود کو ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ نہیں کیا ہوا۔ حتیٰ یہ لوگ ایسی صلاحیت کے حصول بھی آمادہ نہیں جو اہم ترین کاموں کی انجام دہی کے لئے ان کی معاون ہو۔

دوسروں کا غم کھانا اچھی اور قابلِ قدر عادت ہے۔ لیکن اگر یہ جذبہ عمل پر منتہی نہ ہو اور اس کے ذریعہ دردمندوں کا درد کم نہ کیا جائے تو پھر اس غم خواری کا کوئی فائدہ نہیں۔ محض اچھے جذبات کس مرض کی دوا ہیں؟

وہ احساسات جو ضمیر کے اندر پوشیدہ ہوں اور عملی زندگی میں جن کی تاثیر نظر نہ آئے، ایسے احساسات سے کیا استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ میدانِ عمل میں محض حسنِ نیت ہی کافی نہیں۔ بلکہ حسنِ نیت رکھنے کے ساتھ ساتھ عمل و اقدام بھی لازم ہے۔

اعلیٰ ترین روحانی لذّات

دوسروں کو مصائب ومشکلات سے نجات دلانے کے لئے کوشش کرنا نہ صرف ہر فرد کی ذمہ داری ہے بلکہ اس عمل سے لذّت بھی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو محبت کا دامن اس قدر وسیع کردینا چاہئے کہ ہر فرد اس کے سائے میں آسکے۔ تاکہ اس ذریعہ سے اس کی روح پُرسکون اور دل رنج و غم کی آلائش سے پاک وصاف ہوجائے اور انسان حقیقی سعادت سے ہمکنار ہوسکے۔

ایک مغربی دانشور کہتا ہے کہ۔

"ہرنیکی کی جزا رکھی گئی ہے اور بُرائی کی سزا طے پاچکی ہے۔ لیکن یہ جزاء اور وہ سزا خوبی و بدی سے ماوراء نہیں۔ فضیلت کے بدلے فضیلت کے علاوہ کیا جزاء فرض کی جاسکتی ہے اور رذیلت کے لئے رذیلت سے بدتر کیا سزادی جاسکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ثواب وعقاب ہمارے اعمال کا فطری نتیجہ ہیں۔ جو آگ میں کودے گا لازماً تکلیف سے دوچار ہوگا۔ جو بُرائی کرے گا اور اپنے فرائض سے تجاوز کرے گا براہِ راست اس عمل کا نتیجہ دیکھ لے گا۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ نیکوکاری کا کیا فائدہ؟...... بلکہ نیکی کے لئے نیک بن جائیے۔ جس طرح شب کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے اور آفتابِ صبح سائے کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھتا ہے اسی طرح حقیقی سعادت جو روحانی سکون سے عبارت ہے' نیکوکاری کے نتیجے میں ہمیں اپنی آغوش میں سمیٹنے کو بڑھتی ہے۔

جو شخص اپنے فرائض کی حدود میں دوسروں سے نیک سلوک کرتا

ہے وہ اس عمل کے بعد اپنی روح میں بے پایاں طمانیت کا احساس کرتا ہے۔ اور گویا اس موقع پر عام ماحول سے بلندی پر پرواز کرنے لگتا ہے' خود کو ایک روشن ترافق پر پاتا ہے اور اس عالی ترین احساس کے نتیجے میں خوش بختی وسعادت سے بہرہ مند ہوجاتا ہے۔

نیک نیتی خود نیکی ہے لیکن ہمیں نیک عمل کو اپنا نصب العین قرار دینا چاہئے۔ جب ہمارے دل میں نیکی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو ہم خود بخود اپنے اندر لذّت کا احساس کرتے ہیں۔ لیکن نیک عمل درخشاں ستاروں کی مانند دوسروں کی روح کے افق کو روشن کرتے ہیں۔ ہم اپنے عمل کے ذریعہ فضیلت کی بنیاد استوار کرسکتے ہیں یا اس باشکوہ بنیاد کو ڈھاکر اس کے کھنڈرات پر فساد و ذلّت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ ہم ان دونوں میں سے کوئی بھی کام اختیار کرسکتے ہیں۔ لہٰذا اس آزادی کی بناء پر ہم پر ایک اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ دوسروں کے لئے راحت و آسائش کی فکر میں رہتا ہے اور دوسرا گروہ اپنی آسائشوں کے لئے دوسروں کے رنج والم کا سبب بنتا ہے۔ یہ گروہ اس حال میں کہ دوسروں کو بدبختی میں مبتلا کردیتا ہے خود بھی بدبختی کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ اس کے برعکس وہ گروہ جو دوسروں کی آسائش وراحت کا خیال رکھتا ہے دوسروں کے ساتھ ساتھ خود بھی سعادت و خوش بختی کی منزل حاصل کرلیتا ہے۔ جو کام دوسروں کی مدد و مساعدت کے لئے عمل میں آتے ہیں' ہرچند وہ چھوٹے اور معمولی

ہوں لیکن عظیم اور غیر معمولی نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔"

(در جستجوی خوش بختی۔ ص۲۰۱، ۲۰۳)

نیکی اور احسان کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کیونکہ انسانی جذبات و احساسات کا سرچشمہ عظیم اور اس کے ذخائر بے پایاں ہیں اور جس قدر زیادہ ان سے استفادہ کیا جائے اسی قدر وہ لبریز ہو جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ "عقل محدود ہے لیکن انسانی جذبات لامحدود اور ہر چیز کو اپنے عظیم پَروں کے نیچے جگہ دے سکتے ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ احسان، عملِ خیر اور دوسروں کو راحت پہنچانا ایسی سعادت ہے جو ہر ایک کو میسّر نہیں۔

دوسروں کے مسائل سے لاتعلقی

ایسے لوگ جنہیں نیک کاموں کی انجامدہی بوجھ معلوم ہوتی ہے اور جو دوسروں کو بغض و عناد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ دراصل اس دنیا سے اپنا معنوی رابطہ قطع کر لیتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں اور ان کے مسائل سے لاتعلق ہو کر محض اپنی ذات میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ دنیا میں ان کے علاوہ کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ حتیٰ ان میں عمومی خیر و سلامتی میں اپنا نفع دیکھنے تک کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

البتہ ایسے لوگ انسانی جذبات و احساسات سے عاری نہیں ہوتے۔ دوسروں کے دکھ درد کو درک بھی کرتے ہیں لیکن خودپرستی کے حصار میں اس

قدر محصور ہو چکے ہوتے ہیں کہ اپنے جیسے انسانوں سے محبت و دوستی کی آرزو کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہتی کہ "میں" سے آگے بڑھ کر اور اپنی ذات کو کچل کر "ہم" کی منزل پر پہنچ سکیں۔

مشہور دانشور "کارل" کے بقول۔

"جو شخص عقل و شعور سے رہنمائی حاصل کرتا ہے رفتہ رفتہ اس میں گہری تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جب جسم و جان اپنی ساخت کے مطابق عمل کرتے ہیں تو زیادہ ثمرات ظاہر ہوتے ہیں۔ زندگی کی حفاظت کرنے والے قوانین پر عمل، نسل کو جاری رکھنا اور روح کو بلند کرنا خود بخود تمام روحانی و جسمانی صلاحیتوں کو تقویت پہنچاتا ہے۔ یہ پیشرفت خاص طور پر اخلاق و فضائل کی پرورش، حسِّ اخلاقی، حسِّ مذہبی، انسان دوستی اور ایثار و فداکاری میں مشخص ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقل بھی روشنی قبول کرتی ہے۔

جب آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ زندگی کا مقصد مادّی فوائد کا حصول نہیں بلکہ خود زندگی ہے تو پھر اس کی توجہات خارجی دنیا تک منحصر نہیں رہتیں بلکہ وہ نہایت گہری نگاہ سے خود اپنی اور اپنے اردگرد رہنے والوں کی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے اور دوسرے اس سے وابستہ ہیں۔ اس طرح ہم پر "روسو" (Rousseau) کے نظریہ کا مصنوعی پن اور اجتماعیت کو لغو بے منطق قرار دینے اور "انفرادیت گردی" کا خطرہ اور زندگی

کے تمام مراحل میں خود اپنی ہی مانند دوسروں پر توجہ دینے کی ضرورت روشن ہوگی۔

خود پسندی اور اپنے ہم نوعوں سے محبت (جو سماجی زندگی کا لازمہ ہے) کے درمیان واضح تضاد پایا جاتا ہے۔ جسمانی نشوونما کے لئے ماحول اور دوسرے افرادِ معاشرہ کی مدد درکار ہے۔ انسان بطنِ مادر میں زندگی کے دوران اپنی ماں کا دستِ نگر اور سنِ بلوغ کو پہنچنے تک خاندان اور معاشرہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں معاشرہ میں پائی جانے والی سہولتوں سے استفادہ کو اپنا مسلّم حق سمجھنے کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ انفرادیت کا بڑھتا ہوا رجحان تمام جانداروں میں پائے جانے والے "خود خواہی" کے غریزہ کی بناء پر ہوتا ہے۔

دوسری طرف خود خواہی اور خود پسندی کے جذبہ کی بے انتہا زیادتی ایک حقیقی معاشرہ کی تشکیل کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ لہٰذا اپنے ہم نوعوں سے محبت خود خواہی ہی کی طرح لازم ہے۔ "میں" اور "ہم" کے دو متضاد رجحانات کے درمیان اعتدال قائم ہونا چاہئے۔ یہ اعتدال کامیاب زندگی کے لئے ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاتھ کی حرکات انگلیوں کی حرکت کے لئے معاون عضلات کی مرہونِ منت ہیں۔

"میں" مختلف طریقوں سے "ہم" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

(راہ رسمِ زندگی۔ ص ۱۴۶'۱۴۵)

اسلام اور معاشرتی روابط

اسلام کا تربیتی و تعلیمی پروگرام اس نہج پر ترتیب دیا گیا ہے کہ لوگوں کے افکار بلند ہوں اور ان میں تفکّر و تعقّل کو فروغ دیا جائے۔ کیونکہ جس قدر انسان کی فکر کا دامن وسیع اور اس کے افکار کی سطح بلند ہوگی اس قدر بہتر انداز میں وہ انفرادیت پسندی اور خود خواہی کی تاریکیوں سے باہر آئے گا۔

اسلام کا یہ تربیتی نظام اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ انفرادیت کی روح کی تقویت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کی روح کو بھی موثر بناتا ہے۔ تاکہ انسان اپنی انفرادیت کی بھی حفاظت کرے اور اجتماعیت کی بھی۔ نیز معاشرہ کی تشکیل ایسے افراد کے ذریعہ ہو جو نہ تو بے شخصیت اور کھوکھلے ہوں اور نہ ہی خود خواہ اور ایک دوسرے سے بے تعلق۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کی ایک دوسرے سے وابستگی خداوندِ عالم کے ساتھ پیوستگی سے مربوط ہے۔ اس معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کو نیکی و تقویٰ اور اعمالِ خیر کی انجام دہی پر اکساتے ہیں اور ایک ایسا ماحول ایجاد کرنے کے لئے باہمی تعاون سے قدم آگے بڑھاتے ہیں جس میں ان کی نسلیں ایمان و عملِ صالح کے سائے میں زندگی بسر کر سکیں۔ مختصر یہ کہ لوگوں کی تمام قوتیں تعمیری و نیک کاموں پر صرف ہوتی ہیں، شر و فساد کی راہ میں نہیں۔

یوں افرادِ معاشرہ کا ہدف اور ان کا عمل یکساں ہو جاتا ہے۔ سب میں باہمی تعاون و ہمکاری کی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ سب کے دل باہم جڑ جاتے ہیں اور سب انسانیت کی خدمت کے لئے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

خود اسلام اپنے ماننے والوں سے اجتماعی فرائض کی ادائیگی کے لئے تعاون و

همکاری کا تقاضا کرتا ہے۔ نیکی و نیکوکاری اسلامی اخلاق کی اساس اور اس کا بنیادی لائحہء عمل ہے۔ لہٰذا اسلام خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جو کوئی معاشرہ کی خدمت کے بارے میں نہ سوچے وہ مسلمان نہیں۔"

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"من اصبح ولا یھتم بامور المسلمین فلیس بمسلم"

"جو شخص صبح سو کر اٹھے اور مسلمانوں کے امور پر کوئی توجہ نہ دے تو وہ مسلمان نہیں۔" (اصولِ کافی۔ ص ۳۹۰)

اسلام نے انسانیت کے سامنے ایک ایسا مکتب پیش کیا جو فرد اور معاشرہ کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ زمانہء جاہلیت میں جبکہ لوگوں کے تعلقات پر کینہ توزی، جاہ طلبی، شہوت رانی اور استثمار کا راج تھا۔ اسلام نے اس قوم کے تزکیہء نفس اور تہذیبِ اخلاق کے لئے کمرِ ہمت باندھی اور انہیں برادری، نیکوکاری، مہربانی اور باہمی دوستی کی دعوت دی۔ ہر شخص کی طینت و سرشت میں ایسی مثبت بنیاد رکھنے کی کوشش کی کہ وہ انتشار وافتراق کے کسی بھی عامل مثلاً بغض وحسد یا لاتعلقی کی بناء پر ایک دوسرے سے کنارہ کش و روگرداں نہ ہوں۔ اس لائحہء عمل کے ذریعہ اسلام نے ایک محکم اور بافضیلت معاشرہ کی بنیاد استوار کردی۔

جس معاشرہ میں ایمان، نیکوکاری اور خدمتِ خلق کو عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں معاشرہ کا ہر فرد دوسروں کی اصلاح کے سلسلے میں خود کو ذمہ دار اور شریک سمجھنے لگتا ہے اور ایک وقت وہ اجتماعی فلاح وبہبود کے سلسلے میں

اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ گویا پورے معاشرہ کی ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہے۔ ایسے معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے لوگ ایک دوسرے کے لئے انتہائی محبت والفت، ایثار و فداکاری کے جذبات سے معمور ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم اس درخشاں اور عالی مرتبت رابطہ کی ان الفاظ میں توصیف کرتا ہے کہ۔

"والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ"

"اور جن لوگوں نے دارالہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا اور وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انہیں دیا گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔" (سورہء حشر۵۹۔ آیت۹)

قرآنِ کریم نیکوکاروں کو یوں پہچنواتا ہے۔

"واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب....."

("نیک وہ ہے جو) محبتِ خدا میں قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں، غربت زدہ مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کی آزادی کے لئے مال دے۔" (سورہء بقرہ۲۔ آیت۱۷۷)

دوسری طرف نہایت حساس نفسیاتی میدان میں بھی جب صاحبِ ثروت و

متمول شخص کسی محتاج کی مدد کرے تو اسے نہایت درست اور جچی تلی روش اختیار کرتے ہوئے محتاج کی عزّت نفس کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اسلام دولت مندوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ضرورت مند کو دستِ طلب دراز کرکے حقارت میں مبتلا ہونا پڑے۔ یہ طریقہ دینے والے کو بھی غرور و نخوت سے محفوظ رکھتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔

"احسن تواضع الاغنیاء للفقراء طلباً لماعنداللّٰہ واحسن منہ تیہ الفقراء علی الاغنیاء اتکالاً علی اللّٰہ"

"اللہ کے یہاں اجر کے لئے دولت مندوں کا فقیروں سے عجز و انکساری برتنا کتنا اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے دولت مندوں کے ساتھ بے نیازی سے پیش آنا ہے۔" (نہج البلاغہ کلماتِ قصار نمبر۴۰۶)

اسلام میں نیکی کا تصور

مسلمان کی واضح نشانیوں میں سے محبت و نیکی کا سلوک کرنا اور ایک خاص محرّک کے تحت عطا و بخشش ہے۔ رضائے رب کے لئے نیک عمل انجام دینے والے اپنے پرائے میں تمیز روا نہیں رکھتے۔ ان کے دل سب کی محبت و ہمدردی سے لبریز ہوتے ہیں۔ اسی لئے نہ تو انہیں اس کے بدلے کی فکر ہوتی ہے اور نہ سپاس و شکرگزاری کی طلب۔ ان کے رفتار و عمل کا محرّک وہ گہرا قلبی تعلق

ہے جو ان کی روح کی گہرائیوں میں جاگزیں اور ایک ایسے بے پایاں سرچشمہ سے سیراب ہوتا ہے جو محبتِ الٰہی سے لبریز ہے۔

کیا خداوندِعالم کی جانب سے جزاء خیر پر ایمان کے سوا کوئی اور عامل ہو سکتا ہے جو انسان کو بے لوث اور انفرادی مفادات سے بے نیاز ہو کر نیکی پر آمادہ کرے؟

پس نیکی اور نیکوکاری اسی وقت قابلِ قدر ہوگی جب اس کا منشاء و سرچشمہ ایک معنوی جذبہ اور مقدس ہدف ہو اور اس کے ذریعہ انسان خالقِ واحد کی رضایت کا خواستگار ہو۔ اسلام اس مقدس ہدف کو انسانی روح کی گہرائیوں میں بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طریقے سے انسان کے اندر گہری معرفت اور کبھی خشک نہ ہونے والا لامحدود سمندر اور کائنات کی وسعتوں کی مانند وسیع تصوّر پیدا کرتا ہے۔ اس ہمہ جانبہ وسیع النظری کے ذریعہ اور اس بنیادی احساس کے توسط سے جو اس کے اور خداوندِعالم کی حکیمانہ قدرت کے درمیان ظاہر ہوتا ہے اور حقِ تعالیٰ کی لامتناہی قوّت و قدرت سے آگاہی اور اس کی فکر کی وسعت کی بناء پر اس کی آنکھوں سے تمام دبیز مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔

یہ عالی شان اوراک خداوندِعالم کی بندگی اور اس کی ذات سے دائمی ارتباط کا نتیجہ ہے۔ خدا کی عبادت میں بے تکان مشغول رہ کر' ہمیشہ اسی کی پناہ میں زندگی بسر کرتے ہوئے' اسی کی رضا کا طالب رہتے ہوئے ایک وقت وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ روئے زمین پر خدا کی خلافت کا منصب حاصل کرلے اور انسانوں سے اس کی محبت اسے ان کے رنج و مصائب دور کرنے اور ان پر پڑنے

والے ہر شر کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتی ہے۔

اسلام اپنی تعلیمات و تاکیدات کے ذریعہ انسان دوستی کی بنیادی حس کو انسانی سرشت و طینت کا حصّہ بنانا چاہتا ہے۔ جب یہ محبت نفسانی احساسات کا جز بن جائے گی تو انسان نہایت ذوق و شوق سے آگے بڑھ کر نیک اعمال اور سماجی خدمات پر آمادہ ہو گا پھر بغض و عناد' بدخواہی اور سرکشی اس کے رگ و پے میں سما نہ سکے گی اور بہت معمولی توجہ کے ذریعہ اس سے بچا جاسکے گا کیونکہ نفس کی آلائشوں سے پاکیزگی پر اس عظیم اور گرانقدر سرمایہ سے زیادہ کوئی چیز قادر نہیں۔

قرآنِ کریم تمام مخلوقاتِ عالم پر گہری توجہ دیتا ہے اور جس دقّتِ نظر سے اس مسئلہ کو مدّنظر رکھتا ہے وہ تہذیبِ نفس کے لئے غیر معمولی حد تک موثر ہے۔ انسان اس نکتہ سے آگاہی کے بعد کہ اس کے اور پوری کائنات کے مابین ایک مضبوط و استوار اور ناقابلِ جدائی ربط پایا جاتا ہے' اپنے وجود کو بزمِ کائنات سے ہم آہنگ بناتا ہے اور ضرر رساں موجودات کے سوا تمام مخلوقاتِ عالم کو مہر و محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

جاندار موجودات اور تمام مخلوقاتِ عالم کے بارے میں لطافت آمیز احساسات کا عادی ہو جانے کے بعد جو انسان کی عظمت اور بلند مرتبے کی علامت ہیں انسان میں ایک ایسی درست خطوط پر اور مبنی برعدل' جستجو و کوشش کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو خود اس کے لئے ناگزیر ہے اس طرح یکبارگی اس کی روح کی تاریکی و ناہمواری کم ہونے لگتی ہے اور اس کی آلائشیں دور ہو جاتی ہیں۔

اسی لطیف آسمانی احساس کی بناء پر پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے شقاوت پیشہ اعزّہ

کے بارے میں' ان لوگوں کے بارے میں جو آنحضرتؐ سے درشتی سے پیش آتے تھے فرمایا۔

"پروردگارا! میری قوم پر اپنی رحمت و مغفرت کا سایہ قرار دے۔"

لطف و رحمت کے بارے میں آنحضرتؐ کے جذبات محض دعاؤں تک یا زبانی ہی محدود نہ تھے بلکہ آپؐ عملاً اپنے ماننے والوں کو نیکی و احسان کی تعلیم دیتے تھے۔

ایک روز اصحاب کی مجلس میں آپؐ نے یہ واقعہ بیان فرمایا۔

"ایک شخص بیابان میں پیاس کی شدّت سے دوچار ہوا۔ کچھ فاصلہ پر اسے کنواں نظر آیا' وہ کنویں میں اترا اور اپنی پیاس بجھائی' اسی اثنا میں اس کی نظر ایک کتّے پر پڑی جو پیاس کی شدت سے اپنی تھوتھنی خاک پر مل رہا تھا۔ کتّے کو دیکھ کر اس شخص کو بہت دکھ ہوا اور جذبہ ترحم کے زیرِ اثر وہ دوبارہ کنویں میں گیا اور اپنے جوتے میں پانی بھر کر دم بہ لب کتے کے سامنے رکھا۔

خداوندِ عالم کو اس شخص کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے اپنی خاص بخشش و عنایت کا مورد قرار دیا۔"

اصحابؓ نے دریافت کیا! کیا ہم خداوندِ عالم کی جانب سے حیوانات سے حُسنِ سلوک کی بھی جزاء پاسکتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا کیوں نہیں! تم ہر ذی روح کے ساتھ نیکی کر کے ماجور ہو سکتے ہو۔

ہر اقدام کی اچھائی یا بُرائی کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اس کے محرک

کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ہر عمل کے مقصد کو اس کے پس پردہ عزائم سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بیماری کے سبب پر خصوصی توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔

مغرب میں نیکی کا تصور

ترقی یافتہ ممالک، پسماندہ ممالک کو جو اقتصادی امداد فراہم کرتے ہیں اس کی پشت پر کسی قسم کا ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ کار فرما نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس سے خود ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کی قوتِ خرید کم ہونے کی وجہ سے ترقی یافتہ اقوام کی مصنوعات کو خریدنے والا کوئی نہیں رہتا۔ جس کی وجہ سے انہیں اقتصادی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا اس مشکل کا حل وہ یہ تلاش کرتے ہیں کہ پسماندہ ممالک کو امداد فراہم کرکے اسی امدادی رقم سے انہیں اپنی مصنوعات خریدنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ اقتصادی توازن برقرار رہے۔ المختصر اپنے اقتصادی توازن کو برقرار رکھنا اس عمل کا محرک ہوتا ہے۔

بہت سے افراد جو کارِ خیر انجام دیتے ہیں ان کے پیچھے بھی خود اپنے مفادات کار فرما ہوتے ہیں اور ان میں خلوص و نیک نیتی مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ ان نیک کاموں کو اپنے انفرادی مقاصد تک پہنچنے کے لئے ایک پُل کے بطور استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ نیکی کا سرچشمہ وہ فضیلت ہے جو صرف انسانی سرشت میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا کسی عمل کے بارے میں محض اس کا نتیجہ دیکھ کر فیصلہ صادر کردینا کسی طور بھی درست نہیں۔ صرف ریاضی کے قاعدے

اور جمع تفریق کے ذریعہ فضیلت اور نیکی کی قدر و قیمت کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا، دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ محض ریاضیات کو اخلاق میں دخیل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مشہور فرانسیسی دانشور "ڈاکٹر کارل" مغرب میں نیکوکاری کے تصوّر کی ان الفاظ میں تصویر کشی کرتا ہے۔

"ہمارے نیک کاموں کا محرّک خود اپنے شخصی منافع کا حصول اور سب سے بڑھ کر مالی فوائد کا حصول، حسِ خودنمائی کی تسکین، امتیازی مقام کا حصول اور سماجی مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ نفع جوئی کبھی ریاکاری اور کبھی انسان دوستی کا نقاب اوڑھ لیتی ہے۔ دفاتر، عدالتوں اور انتظامی امور کی یونیورسٹیوں میں ان خفیہ و درپردہ خیانتوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

شرافت کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔

جو لوگ خود کو ایک بلند ہدف و مقصد کے لئے وقف کردیتے ہیں اور اس راہ میں بے لوث مصروفِ کار نظر آتے ہیں انہیں حقیر اور دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔ ہر جانب مفاد پرستی کے آثار کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک عورت جو امورِ خیریہ انجام دیتی ہے اس کے اس عمل میں خلوصِ دل شامل نہیں بلکہ اس کا مقصد ہے کہ ادارے کی منیجر بن جائے یا "لژین ڈونر" کا تمغہ حاصل کرلے یا ایک مارکیٹ بنا کر مادّی نفع حاصل کرنے کے درپے ہے۔

ایک معروف ڈاکٹر ادویات بنانے والی کمپنیوں سے رشوت لے کر ان

کمپنیوں کی بنائی ہوئی دواؤں کو اپنے شاگردوں اور مریضوں کو استعمال کی تاکید کرتا ہے۔

ایک طالبِ علم جس کی جدوجہد علم کے حصول اور اس میں گہرائی پیدا کرنے کے سلسلے میں ہونی چاہئے وہ محض اچھی ملازمت کے حصول اور مالی فوائد کے لئے تعلیم حاصل کرتا ہے۔

ایسے طبیب جو امراض کی تشخیص اور معالجہ کے دوران اخلاق کو ملحوظ نہیں رکھتے، ایسے طالبِ علم جو قبل از وقت امتحانی پرچہ معلوم کرنے کے لئے تحریص و تہدید کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، ایسے افراد جو محکمۂ سماجی بہبود کی جانب سے اسپتالوں کو فراہم کی جانے والی وٹامن کی گولیاں بلیک مارکیٹ میں فروخت کردیتے ہیں اکثر اپنے چہروں پر ایثار و فداکاری، علم اور انسان دوستی کا نقاب اوڑھے ہوتے ہیں۔

ہم دھن دولت کے لالچی ہیں۔ کیونکہ دولت سے ہر کام کیا جاسکتا ہے، طاقت و قوت حاصل کی جاسکتی ہے، تقریباً ہر فرد کو یا تو روپیہ پیسے یا مالداروں کی جانب سے پیش کی گئی چیزوں سے خریدا جاسکتا ہے۔

المختصر دولت ہماری تمام آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ ہے خواہ یہ تمنائیں کتنی ہی پست کیوں نہ ہوں۔" (راہ و رسمِ زندگی۔ ص ۱۶، ۱۵)

اسلام کی نظر میں نیکی کی حقیقی ماہیت جاننے کے لئے مندرجہ ذیل داستان میں اسلام کے تربیت یافتہ افراد کے طرزِ تفکّر اور عمل کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

" پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیؐ اصحاب کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک مسافر آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا! راستے کی صعوبتوں نے میرے اعضاء شل کردیئے ہیں، تھکن سے چور ہوں اور سخت بھوک ستارہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فوراً ایک صحابی کو اس شخص کے کھانے کے انتظام کے لئے اپنے گھر روانہ کیا۔

وہاں زوجۂ رسولؐ کی زبانی معلوم ہوا کہ گھر میں پانی کے سوا کھانے کو ایک کھیل بھی میسر نہیں۔

صحابی نے آنحضرتؐ کی زوجہ کا جواب آپؐ کے گوش گزار کیا۔

آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب پر نظر دوڑائی اور دریافت کیا! کیا تم میں سے کوئی اس مہمان کی میزبانی قبول کرے گا؟

ایک انصاری نے اس شخص کو مہمان بنانے پر آمادگی کا اظہار کیا اور اسے لے کر اپنے گھر چلے آئے۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں محض بچّوں کی غذا بھر کھانا موجود ہے۔ انصاری نے اپنی بیوی سے کہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مہمان کو سیر کیا جائے۔

الغرض جب کھانا شروع ہوا تو ان لوگوں نے کسی بہانے سے چراغ گُل کردیا اور کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ اس طرح مہمان پر یہ ظاہر نہ ہوسکا کہ میزبان اس کے ساتھ کھانے میں شامل نہیں اور اس نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا۔"

پیغمبرِ گرامی قدر کا ارشاد ہے۔

"ان علی کل مسلم فی کل یوم صدقة' قیل : من یطیق ذلک ؟قال : اما طتک الاذی عن الطریق صدقة۔"

"ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ روزانہ صدقہ دے۔ اصحاب میں سے کسی نے سوال کیا۔ یا رسول اللہؐ ہر کسی میں اتنی استطاعت کہاں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"اگر راستہ سے کوئی رکاوٹ دور کردو تو یہ بھی صدقہ شمار ہوگا۔"

(بحار الانوار جلد ۱۵ – ص ۱۳۱)

غور فرمایئے کہ رسولِ مقبولؐ عمومی گزرگاہ سے کوئی رکاوٹ دور کردینے کو بھی نیکی اور عملِ خیر کے بطور متعارف کراتے ہیں اور یہ وہ کم از کم ممکن عمل ہے جو کوئی ناتواں ترین فرد بھی انجام دے سکتا ہے۔ یعنی اگر کوئی کسی بڑے کام کی انجام دہی پر قادر نہیں تو اس کا یہ معمولی عمل بھی عظیم فعل شمار ہوگا۔ وگرنہ اگر کوئی مختلف جہتوں سے وسیع امکانات رکھتا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی تناسب سے نیک اعمال انجام دے۔ کیونکہ افراد اور ان کے انجام دیئے جانے والے کام ایک نسبی ربط رکھتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے جو سماجی خدمات میں پیش پیش رہتا تھا ایک روز مجھے بتایا کہ۔

"میرا روز کا معمول ہے کہ ہر صبح کام پر روانہ ہونے اور اپنے انفرادی امور کی انجام دہی سے قبل کوئی نیک عمل انجام دیتا ہوں۔ ہر چند یہ عمل محض کسی مسئلہ کے بارے میں کسی کی رہنمائی ہو۔ یہ میری

زندگی کا ناقابلِ تغیّر معمول ہے اور اسے میں ایک فرض سمجھ کر انجام دیتا ہوں۔

واقعی اگر تمام مسلمان پیغمبرِ اسلامؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کریں اور دوسروں کے واسطے عملِ خیر کی انجام دہی کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کریں تو اجتماعی زندگی کا پہیہ بغیر کسی رکاوٹ کے رواں دواں رہ سکتا ہے اور لوگوں کی بہت سی مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔

بارگاہِ خدا میں محبوبیت کا معیار

جب پیغمبرِ اسلامؐ سے پوچھا گیا کہ خدا کی بارگاہ میں محبوب ترین افراد کون ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔

"انفع الناس للناس"

"جو انسانوں کے لئے سب سے زیادہ مفید ہوں۔"

(اصول کافی۔ ص ۳۹۱)

رسولِ مقبولؐ کا ارشاد ہے۔

"من سمع رجلا ینادی یا للمسلمین فلم یجبه فلیس بمسلم"

"اگر کوئی شخص سنے کہ کوئی مسلمانوں کو مدد کے لئے پکار رہا ہے اور اس کی مدد کو نہ پہنچے تو ایسا شخص مسلمان نہیں ہے۔"

(کافی جلد ۲ – ص ۱۶۴)

صفوان (امام جعفر صادقؑ کے صحابی) ایک روز امام جعفر صادق علیہ السلام

کی خدمت میں موجود تھے۔ ناگاہ ایک حیران و پریشان شخص حاضر ہوا اور امامؑ کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ اس کی مشکل کا تعلق کچھ مالی مسائل سے تھا۔ امامؑ نے صفوان کو حکم دیا کہ فوراً جاؤ اور اپنے برادرِ ایمانی کی مشکل حل کرو۔ صفوان حکم کی تعمیل میں اٹھے اور اسکا مسئلہ حل کرکے واپس پلٹ آئے۔ امامؑ نے دریافت کیا: مسئلہ کا کیا ہوا؟ صفوان نے جواب دیا: خدا نے اس کی مشکل حل کردی۔

امامؑ نے فرمایا۔

"جان لو کہ مشکل کو حل کرنے کے سلسلے میں یہ عمل کہ جو بہت معمولی سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں بہت تھوڑا سا وقت صرف ہوا ہے۔ لیکن اس کا ثواب مسلسل ایک ہفتہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے رہنے سے زیادہ ہے۔"

امامؑ نے مزید فرمایا کہ۔

"ایک دن امام حسنؑ کی خدمت میں ایک شخص پہنچا۔ اس نے اپنی پریشانی امامؑ کے گوش گزار کی اور اس سلسلہ میں مدد کی درخواست کی۔ امامؑ فوراً اس کی مدد کو اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے ساتھ چل دیئے۔ درمیانِ راہ میں امامؑ کی نگاہ امام حسینؑ پر پڑی جو نماز میں مشغول تھے۔

امام حسنؑ نے فرمایا۔

"تم نے حسینؑ سے مدد کی درخواست کیوں نہ کی۔ اس شخص نے جواب دیا: پہلے میرا ارادہ انہی کی خدمت میں جانے کا تھا لیکن

جب مجھے معلوم ہوا کہ حسین ابنِ علیؑ اعتکاف میں ہیں تو میرا ارادہ بدل گیا۔"

امام حسنؑ نے فرمایا۔

"اگر وہ تمہاری مشکل حل کرتے تو اس کی اہمیت ان کے لئے ایک پورے مہینے کے اعتکاف سے زیادہ تھی۔"

(اصول کافی جلد ٢۔ ص ١٩٨)

بے حد احسان و محبت

جو شخص جس قدر زیادہ احساس و عواطف کا مالک ہو گا اسی قدر وہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے گا۔ چھوٹے دل کے مالک افراد میں مہرو محبت کے جذبات پنپ نہیں پاتے اسی لئے ان کے احسان کا دائرہ وسیع اور عمومی نہیں ہوتا کہ معاشرہ کا ہر خاص و عام ان سے مستفیض ہو سکے۔ ایسی نیکی اور احسان کرنے والا خدا کی رحمت سے دور ہو گا۔

"قال رجل : ان المعروف اذا اسدی الی غیر اهله ضاع فقال (ع) : لیس کذلک ولکن تکون الصنیعة مثل وابل المطر فیصیب البر و الفاجر"

"ایک شخص نے امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا : کیا نااہل کے ساتھ کی جانے والی نیکی ضائع ہو جائے گی۔

فرمایا : نہیں ایسا نہیں! نیکی کرنا شدید اور موسلادھار بارش کی مانند

ہے جو ہر چیز پر برستی ہے ' گلستان اور شورزدہ زمین میں کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔" (تحف العقول۔ص ۲۴۵)

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"یابنی افعل الخیر الی کل من طلبه منک فان کان من اهله فقد اصبت موضعه و ان لم یکن من اهله کنت انت من اهله"

"اے بیٹے! جو کوئی بھی تم سے نیکی اور خیر کا طلب گار ہو تو اس کے ساتھ احسان و نیکی کرنے میں دریغ نہ کرنا کیونکہ اگر یہ شخص اس نیکی کا اہل ہو گا تو تم نے اپنا فرض بخوبی نبھایا اور اگر وہ اس احسان و نیکی کا اہل نہ ہوا تو تم نے اس کے تقاضے کا مثبت جواب دے کر اپنی شرافت و بزرگی کا ثبوت تو دے ہی دیا۔" (روضہ کافی۔ص ۱۵۳)

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے ایک نادر و لطیف خطاب میں لوگوں کو نیکو کاری کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"لوگو! عظمت و جوانمردی کی جانب بڑھے چلو۔ پسماندہ لوگوں کی مشکلات حل کرنے میں جلدی کرو۔ کیونکہ نیکو کاری بہت سودمند سودہ ہے۔

لوگو! بندگانِ خدا کی خدمت سعادت و نجات کا باعث ہے۔ تم دردمندوں کے دلوں پر مرہم رکھنے کی قدرت رکھتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کام میں تمہاری ٹال مٹول اور سستی کی بناء پر لوگ

تمہارے خلاف زبان دراز کریں اور تم پر اتہام لگائیں ..... اگر کسی ناتواں اور راستے میں ٹھوکر کھانے والے کو سہارا دو اور وہ تمہاری اس نیکی اور سپاس گزاری پر شکریہ ادا نہ کرے تو آزردہ خاطر نہ ہونا اور نیکی و احسان کے معاملہ میں ٹھنڈے نہ پڑ جانا کیونکہ خداوندِ عالم اس کے بدلے تمہیں عظیم اجروثواب سے نوازے گا اور تم پر اپنی بے پایاں نعمتوں کے خزانے کھول دے گا۔

یہ تو خود ایک نعمت ہے کہ خداوندِ عالم نے تمہیں نعمتوں سے بہرہ مند کیا اور ایک گروہ کو تمہارا نیاز مند و محتاج قرار دیا لہٰذا یہ روا نہیں کہ تم حرص و آز کا شکار ہو جاؤ۔

کیونکہ اگر تمہیں خداوندِ عالم کی عطا کردہ نعمتیں میسّر ہوں لیکن تم مظلوموں' بیکسوں اور محتاجوں کی دستگیری کے لئے آگے نہ بڑھو تو خداوندِ عالم ان نعمتوں کو رنج والم سے بدل دے گا اور تمہیں ذلّت وخواری سے دوچار کردے گا تاکہ تم بھی محروموں کے رنج و مصائب کا مزہ چکھو۔

کس قدر فرح افزا ہے ٹھوکر کھانے والے کا ہاتھ تھام لینا۔

اگر تم سخی ہو گے تو لوگوں میں تمہاری نیکی و نیک نامی کا چرچا ہو گا اور جب تم ان کے قریب سے گزرو گے تو وہ بجائے غصے و نفرت کے تمہیں شکر گزاری کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

چہ بسا کہ انہیں محتاجوں اور نیاز مندوں میں سے کوئی اپنے آسائش و خوشحالی کے ایام میں تمہیں بہترین بدلا دے۔

اگر نیکی ایک آدمی کی صورت میں ظاہر ہو اور تم اس کے خوبصورت سراپے کو دیکھ سکو تو تم دیکھو گے کہ یہ ایک حسین و جمیل انسان کی مانند ہے جو تمہارے دل کو خوش و خرم کرتا ہے۔ اگر برُائی اور بدکرداری کا مجسم ہونا ممکن ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ ایک ایسا کریہہ و نفرت انگیز چہرہ ہے کہ جسے دیکھنے سے تم اپنی آنکھیں بند کرلیتے۔

اے لوگو! عطاو بخشش کرنے والے بنو۔ سخاوت و فیاضی کو اپنا وطیرہ بناؤ تاکہ سیادت و سروری پاؤ کیونکہ بخیل و کنجوس شخص کی کوئی قدر وحیثیت نہیں ہوتی۔ سخی ترین شخص وہ ہے جو ایسے ضرورت مند کو مال دے جس سے کسی بدلے کی امید نہ ہو۔ سب سے زیادہ درگزر کرنے والا وہ ہے جو طاقت و قدرت اور امکان کے باوجود خطاکار کو معاف کردے۔ اپنے اعزّہ و اقرباء میں بزرگی و کرامت اسے حاصل ہوتی ہے جو ان کی دل جوئی میں غفلت نہ برتے' ہرچند انہوں نے محبت والفت کے رشتہ کو توڑ ڈالا ہو۔

اگر تم ایسے قابلِ احترام اور فیاض ہو تو تمہاری مثال منافع سے بھرپور ایک درخت کی سی ہے۔ جس کی جڑیں خیروبرکت سے سیراب ہوں' جس کی شاخیں سعادت و نیک بختی سے سرشار دوسروں کو سایہ فراہم کریں اور جو ایسے پھل پیدا کرے جن کی مٹھاس تلخ کاموں کے بھی منہ شیریں کردے۔

جو شخص خدمتِ خلق اور لوگوں سے نیک سلوک میں تیزی دکھائے گا' تو کل ایسی خیروبرکت پائے گا جس کی اسے ہرگز توقع نہ ہو گی اور

اگر اس نے صرف اور صرف رضائے رب کے لئے حاجتمندوں کی دستگیری کی ہو گی تو خداوندِعالم ضرورت کے روز اس کی دستگیری کرے گا اور اسے ناگوار حوادث سے محفوظ رکھے گا۔

لوگو!۔ تم میں سے جو کوئی غم واندوہ کے ماروں کے دل کا بوجھ کم کرے گا خداوندِعالم دنیا و آخرت کا غم واندوہ اس کے دل سے دور کر دے گا۔ نیک لوگوں کو ان کی نیکی کا صلہ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔" (کشف الغمہ ج ۲۔ ص ۲۰۴۔ طبع جدید)

احسان و نیکی محض مال، دولت بخشنے اور دردمندوں کو آلام و مصائب سے نجات دلانے ہی کا نام نہیں۔ بلکہ معنوی معاملات میں مددو تعاون اور اخلاق و کردار کی اصلاح مالی احسان سے کہیں زیادہ اجروثواب کا باعث ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کسی کو گمراہی کے اندھیرے غار سے نکال باہر لائے تو یہ اس پر ایک عظیم احسان ہے۔ اسلام کی نظر میں عالی ترین اور نہایت بیش قدر نیکی و احسان منحرف اور گمراہی کے دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کی دستگیری ہے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا۔

"لئن یهدی الله علی یدیک رجلا خیر لک مماطلعت علیه الشمس۔"

"اگر تمہارے ہاتھوں ایک فرد بھی ہدایت پا جائے تو یہ ان تمام چیزوں سے بہتر اور قیمتی ہے جن پر آسمان اپنی روشنی ڈالتا ہے۔"

(سفینۃ البحار۔ جلد ۲۔ ص ۷۰۰)

ساتواں باب

قدر دانی' پیش رفت کا عظیم عامل

روح کی تشنگی

جس طرح انسانی جسم اپنی بقاء کے لئے بعض اشیاء کا محتاج ہے اور انسان مسلسل ان ضروریات کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل رہتا ہے اسی طرح روح کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ دستِ قدرت نے روح کے ان تقاضوں و تمناؤں کے بیج انسانی سرشت میں بو دیئے ہیں۔

انسانی روح داد و تحسین' ستائش و تعریف کی پیاسی ہوتی ہے۔ اسی اندرونی تقاضے کی تسکین کے لئے ہر شخص ذوق و شوق کے ساتھ ایسے امور کی انجام دہی کی کوشش کرتا ہے جو معاشرہ کے نزدیک قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور جن کی انجام دہی پر اس کی لیاقت و قابلیت کو سراہا جائے' اس کی شخصیت کو مانا جائے اور اس کی روحانی تمناؤں کی کشتی ساحلِ مراد پر جا لگے۔

کیونکہ انسان خود خواہ ہوتا ہے اس لئے اپنی ایجادات و اختراعات اور اپنے کئے ہوئے کاموں کے ثمرات و نتائج سے بھی شدید عشق رکھتا ہے۔ لہٰذا حوصلہ افزائی اور تعریف و ستائش انسان کو کام پر لگانے کا بہترین محرّک ہے۔ قدر دانی سادہ اور ارزاں ترین دوا ہونے کے باوجود اس قدر معجزنما تاثیر کی حامل ہے کہ معاشرہ کے فرسودہ اور خفتہ نظام کو حیاتِ نو عطا کر سکتی ہے اور اس کے پہیوں کو

ایک نئے ولولے کے ساتھ حرکت میں لا سکتی ہے۔

اس کے برعکس حوصلہ افزائی اور قدر دانی میں بُخل سے کام لینا یا اس سے قطعاً پرہیز کرنا ترقی و پیشرفت کی راہ کی ایک ایسی بڑی رکاوٹ ہے جس سے انسان میں پنہاں اس کی پوشیدہ صلاحتیں ظاہر ہونے سے رہ جاتی ہیں اور اس کی اختراع و ایجاد کی صلاحیتوں میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔

عنفوانِ شباب کے حساس مرحلے میں جبکہ انسان اپنی مستقل اور خود مختار زندگی کا آغاز کرنے والا ہوتا ہے اسے اپنی جستجو اور جدوجہد میں اضافے کے لئے ہر چیز سے زیادہ قدر دانی اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے۔

"بچے جب شجاعت یا کسی مہارت کا مظاہرہ کریں یا اپنی کسی چیز کے بارے میں خود اپنی تمنا کو پسِ پشت ڈال کر ایثار و قربانی . مظاہرہ کریں تو ایسے موقع پر ان کی تعریف و تحسین سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

بچّوں کی تربیت و نشو و نما کے تمام مراحل میں ان کے نمایاں کاموں پر ان کی تعریف و قدر دانی کرنا چاہئے۔

جوانی میں مشکل و دشوار کاموں کی انجام دہی پر ملنے والی داد و تحسین کا مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لطف و لذّت کی جانب اشتیاق و رغبت ایک مکمل حقیقت اور ایک اضافی خواہش کی مانند ہے ہر چند کہ اسے بنیادی تحرک شمار کرنا چاہئے۔

اخلاقی ہدایت برمحل اور سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہئے اور لازم ہے کہ انہی واقعات سے استفادہ کریں جو فطرتاً پیش آئے ہوں نیز اس

مخصوص کیفیت کے تقاضے کے مطابق عمل کیا جائے' اس سے بڑھ کر نہیں۔ خود بچّہ اس حالت کے نتائج کی اسی جیسے دوسرے مواقع پر تطبیق کر سکتا ہے۔

بچّہ کلّی قاعدہ کے ذریعہ نہیں بلکہ مثالوں اور مواقع کے ذریعہ نہایت آسانی سے بات سمجھ سکتا ہے۔ اس سے کلّی طور پر نہ کہئے کہ شجاع ہو جاؤ' بہادر بنو' دوسروں سے محبت و مہربانی سے پیش آؤ بلکہ اسے ایسے عمل کی ترغیب دیجئے جس میں جرات کی ضرورت ہے اور اس عمل کی انجام دہی پر اس سے کہئے کہ واہ' واہ آفرین تم کتنے بہادر ہو۔ اسی طرح اسے اس بات پر ابھاریئے کہ اپنے کھلونے اپنی چھوٹی بہن کو دے دے اور جب وہ اپنی بہن کے خوش و خرم چہرے کو دیکھ رہا ہو تو اس سے کہئے کہ ـــ بہت خوب میرا بیٹا کتنا محبت کرنے والا اور مہربان ہے۔ اسی کلیہ کو قساوت اور دل کی سختی کے علاج کے لئے کام میں لایئے۔" (در تربیت۔ ص ۱۲۲-۱۲۳)

نوجوانوں کی تحقیر کرنا یا ان کے نمایاں کاموں سے بے اعتنائی برتنا ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو کاری ضربات سے کچل دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جب کوئی جوان یہ محسوس کرتا ہے کہ لوگ اس کے کارہائے نمایاں اور گرانقدر خدمات کی طرف سے بے توجہ ہیں اور اس کی محنتیں و زحمتیں کسی حساب شمار میں نہیں آتیں تو اس پر سخت گراں گزرتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما رک جاتی ہے اور مستقبل کے بارے میں اس کی امید و آرزوئیں دل ہی میں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور چونکہ اس حوصلہ افزائی کا تعلق انسانی نفسیات سے

ہے لہٰذا وہ نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جب صاحبانِ علم و فن پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس قدر زحمتوں اور مشقتوں کے باوجود معاشرہ میں ان کو سراہا نہیں جاتا تو ممکن ہے شکست خوردگی کا یہ احساس ان کی سرگرمیوں اور افکار کی سمت کو یکسر تبدیل کر دے اور وہ روحانی احتیاجات کی تسکین اور سماجی زندگی میں کامیابی و کامرانی کے حصول کی خاطر انحرافی راہوں کی جانب راغب ہو جائیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے روحانی کمالات اور انسانی فضائل کی جگہ حیلہ و مکر و فریب کی خصوصیات لے لیتی ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید آج کا علمِ نفسیات بھی کرتا ہے۔

تعریف و تحسین کے گہرے اثرات

کبھی کبھی محض ایک تحسین آمیز جملہ انسان کی روح پر نہایت گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے یہ ایک جملہ انسان پر ایسا اثر انداز ہو کہ وہ اپنی ہمہ جہت جدو کاوش کامیابی کی راہ میں صرف کر دے۔

بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنی تمام کامیابیوں کو کسی بڑے انسان کی تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر یہ حوصلہ افزائی شاملِ حال نہ ہوتی تو وہ آج کامرانیوں کی اس بلندی پر نظر نہیں آتے۔

ترقی یافتہ اقوام ممتاز اور نمایاں شخصیات کو غیر معمولی عزّت و مقام دینے کی

قائل ہیں اور اس سلسلے میں گوناگوں طریقے اختیار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاشروں میں نبوغ و استعداد کی شمع کبھی گل نہیں ہوتی بلکہ لوگوں میں استعداد کی نشوونما اور پنہاں صلاحیتوں کے ثمرات ظاہر ہونے کے لئے حالات ہمیشہ سازگار رہتے ہیں۔ وہاں کام اور علم کو حقیقی قدر و منزلت حاصل ہے اور لائق و شائستہ افراد کو بخوبی جانا پہچانا جاتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ مطبوعاتی ادارے جن کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت، تعلیم و تربیت، حقیقی مسائل کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے افکار کو جِلا بخشنا ہے ہمارے یہاں ان میں سے اکثر عوام الناس کی توجہ ایسے امور کی جانب جلب کرتے نظر آتے ہیں جو ان کی سطح فکری کو کم کرنے کا سبب ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ تر معمولی، فضول، لچر اور انحرافی امور کی ترویج پر مرکوز ہوتی ہے، ان میں صاحبانِ علم و فضل کی تشہیر اور حقیقی اقدار کا ذکر تک نہیں ملتا۔

ہمارے سماج کی اس بڑی اخلاقی و سماجی خرابی پر ایک معاصر مصنف یوں تنقید کرتا ہے۔

"حوصلہ افزائی ہماری ایک بڑی نفسیاتی و سماجی ضرورت ہے۔ لیکن یہ حوصلہ افزائی حقیقی اور دل کی گہرائیوں سے ہونی چاہئے، مصنوعی اور دکھاوے کے لئے نہیں۔ آج ہماری سوسائٹی میں مفاد پرست اور تاجر حضرات نے حوصلہ افزائی کے بہت سے مصنوعی طریقے ایجاد کر لئے ہیں۔

مثلاً اگر کوئی مرد یا عورت یہ بتادے کہ "لوئی شانزدہم" کی پانچویں محبوبہ کا نام کیا تھا تو اسے کمپنی اپنے خرچ پر ایک ماہ کے لئے یورپ کی

سیاحت کے لئے بھیجے گی۔ اسی طرح مقابلے میں شامل کوئی خاتون کسی خاص شیمپو کی خصوصیات اور فوائد بتادے تو اسے آرائش و زیبائش کا بہت سا سامان تحفہ میں دیا جائے گا۔ لیکن ہم نے اب تک بہترین تخلیقی ذہن رکھنے والے کے لئے کسی سالانہ انعام کا تعیّن نہیں کیا۔"

جوانی جو اخلاقی صفات کی بنیادوں کی تشکیل کا اہم ترین زمانہ ہوتی ہے اس دوران انسان دوسروں کے کارناموں کی تعریف و قدردانی کے لئے بہت زیادہ آمادہ رہتا ہے اور جوں جوں اس کے سِن و سال میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس میں دوسروں کی تعریف، حوصلہ افزائی اور ستائش کا جذبہ ماند پڑتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے عنفوانِ شباب میں جبکہ انسانی فطرت میں مختلف خُلق و خُو اپنانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اس کے اندر ستائش و قدردانی کی روح کو تقویت دی جائے اور اسے کارہائے نمایاں انجام دینے والے افراد کی قدرشناسی و حوصلہ افزائی پر اُبھارا جائے۔

یہ طرزِ عمل نوجوانوں میں نفسیاتی اعتدال و توازن قائم رکھنے میں نہایت موثر ہے۔ کیونکہ قدرتی طور پر انسان اسی دورِ جوانی میں اپنے لئے آئیڈیل و نمونۂ عمل کا انتخاب کرتا ہے۔ اس موقع پر اگر اس کی توجہات کا مرکز و محور پاک سیرت، اعلیٰ اخلاقی فضائل کی حامل ہستیاں نہ بن سکیں اور اس کی روح میں ان فضائل و کمالات کی ستائش و قدردانی کی حس پروان نہ چڑھ سکے تو ممکن ہے وہ منحرف اور غیر صالح افراد کو اپنا آئیڈیل بنالے اور ان کی رفتار و عمل، افکار و اقدار کی پیروی شروع کردے۔ ذرا سوچئے اس روش کو اپنانے کے نتیجے میں کس قدر ناگوار نتائج و عواقب ظہور میں آئیں گے۔

جو لوگ ذوقِ سلیم، فکرِ رسا اور لطیف احساسات کے مالک ہوں وہ کسی سے بھی سرزد ہونے والے نیک اور قابلِ قدر اقدام کی تعریف و تمجید سے دریغ نہیں کرتے۔ عظیم لوگوں کی بلند فکر اور عالی ترین ادراک غیر معمولی درخشندگی کی مالک ہوتی ہے جو دوسروں میں فعالیت ایجاد کرتی اور ان میں بھی حرارت پیدا کر دیتی ہے۔ عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونا انسان کی فکر کو بلند کرتا ہے، اس کے قدموں سے، اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ خود پرستی کی زنجیروں کو کاٹ دیتا ہے۔ جو افراد عظیم لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے سرچشمہ افکار سے روشنی حاصل کرتے ہیں وہ اپنے لئے اوج و کمال کی راہوں کو ہموار کر لیتے ہیں۔

لیکن بعض لوگ اپنے نزدیک ترین دوستوں کی تعریف و حوصلہ افزائی میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور کسی طور ان کے امتیازات اور عمدہ خصائل کا اعتراف نہیں کرتے اور ان کے کارہائے نمایاں دیکھ کر بے تعلقی اور چشم پوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

پست فطرت اور اعلیٰ انسانی فضائل سے عاری لوگ ہر ناپسندیدہ صفت اور عادت اپنانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ ہر قابلِ قدر اور لائقِ تحسین کام یا چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسروں کی کامیابی انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ کامیاب زندگی گزارنے والے اپنے ساتھیوں کی تعریف سننا پسند نہیں کرتے بلکہ اگر ان کے دوستوں کی راہ میں مشکلات حائل ہو جائیں تو انہیں ایک گونہ تسلی و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ صد افسوس کہ جب وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنے سے آگے بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں تو ان میں غم و

غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ممکن ہے ان کی یہ حسد اور کوتاہ فکری اس بات پر منتج ہو کہ وہ اپنے دوست کے خلاف کوئی نامناسب اقدام اٹھا بیٹھیں یا اس پر کاری ضرب لگانے کے لئے کسی بھی بزدلانہ اقدام کے لئے مناسب وقت کی تاک میں رہیں۔

منحط اور محدود نفسیات کا حامل شخص جو پاک اخلاقی ملکات سے مانوس نہیں ہوتا اس کی کیفیت کی درجِ ذیل فارسی شعر کے مضمون کے ذریعہ بخوبی تشریح کی جا سکتی ہے۔

"خدا نے میرے رقیب پر لطف و کرم کی نظر ڈالی ہے اور اسے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ اسے غصّے کی نگاہ سے دیکھوں اور اس سے نفرت و بے زاری کا اظہار کروں۔"

عاقل اور باشعور افراد نادانوں کے کردار سے درسِ عبرت لیتے ہیں اور ان جیسی خطاؤں کے ارتکاب سے اجتناب برتتے ہیں۔ لیکن بے وقوف لوگ عقلا کی رَوِش اور ان کے فضائل و کمالات کو کبھی اپنے لئے نمونۂ عمل قرار نہیں دیتے۔

تعمیری تنقید حوصلہ شکنی نہیں ہے

شخصیت کی نفی اور تنقید ہمارے معاشرے کا ایک بڑا عیب و نقص ہے یہ خرابی معاشرہ کے ہر طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ جوں ہی کوئی شخص کوئی نیا کام کرتا ہے یا نئی ایجاد سامنے آتی ہے تو بلا توقف اس پر اعتراض و انتقاد کی بارش ہونے لگتی ہے اور ایسے ایسے لوگ زبانِ تنقید دراز کرتے ہیں جو خود کوئی فیصلہ یا

اظہارِ نظر کرنے کی صلاحیت تک سے محروم ہوتے ہیں۔

امریکہ کی ایک معروف سماجی شخصیت "وانا میکر" کہتا ہے۔

"میں تیس سال قبل ہی اس حقیقت کو پاچکا تھا کہ دوسروں کو ہدفِ تنقید بنانا دراصل دیوانگی ہے۔ ہم کیونکر تنقید اور سرزنش کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ جبکہ ہمیں خود اپنے عیوب ونقائص دور کرنے کے سلسلے میں بے شمار رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ آج مجھے اس حقیقت کا اقرار ہے کہ خداوندِ عالم نے ہر کسی کو یکساں علم ودانش عطا کرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔"

(آئینِ دوست یابی - ص ۱۸)

بے شک اصولی اور صحیح تنقید اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک مفید اور سود مند ذریعہ ہے۔ لیکن بدبختی یہ ہے کہ تنقید اکثر بغیر جائزہ لئے اور بغیر تحقیق کئے کی جاتی ہے جو خود ایک طرح کی حق تلفی اور غیر عادلانہ روش ہے، یہ طریقہ اختراعات اور نئی نئی تبدیلیوں کی راہیں بند کردیتا ہے اور ممکن ہے اس غیر مناسب صورتحال سے باصلاحیت ترین افراد کے جذبے بھی سرد پڑ جائیں اور وہ ناامیدی کا شکار ہو جائیں۔

نفسیات دانوں کے نزدیک دوسروں کی لغزشوں پر تنقید اکثر لوگوں کی اپنی خطاؤں ولغزشوں کا انعکاس ہوتی ہے جنہیں وہ دوسروں میں نظر آتی ہے۔ بقول شاعر۔

"یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے"

ماہرین اس بارے میں کہتے ہیں کہ۔

"بطورِ کُلّی اکثر دوسروں پر انتقاد اور ان کی لغزشوں پر لعنت وملامت کا سبب خود ہمارے اندر پائی جانے والی وہ خرابیاں ہیں جن سے ہم آگاہ نہیں ہوتے۔ ہم دوسروں میں وہ نقائص دیکھتے ہیں جو نادانستہ طور پر خود ہمارے اندر پائے جاتے ہیں۔ ذی شعور اور مثبت فکر وعمل رکھنے والے افراد اپنا وقت دوسروں پر تنقید کرنے میں ضایع نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ ہروقت مفید اور مثبت کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ندرت وجدّت پر تنقید کرنے والے لوگ خود موجدین و مخترعین ہوتے ہیں۔ ہنر پر تنقید کرنے والے دراصل دوسروں پر تنقید کے ضمن میں خود اپنے کام کے نقائص گنوا رہے ہوتے ہیں۔ محض نظریات میں غلطاں شکست خوردہ لوگوں میں سے اکثر وہ ماہرین ہوتے ہیں جو صرف راہِ عمل کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

بے محل اور نامعقول تنقید اکثر دوسروں کی حق تلفی کا سبب بن جاتی ہے۔ اور اس طرح ہر چیز کی دائمی قدر وقیمت ختم ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے غیر عادلانہ اور غیر معقول تنقید کرنے والے حضرات میں ایسی ناگواری اور غیر آسودگی کے منبع کی نشاندہی کی جاسکے جس سے وہ خود بھی آگاہ نہ ہوں۔ یہ اندرونی ناگواری انسان کے باہر نمودار ہو کر ہر چیز کی قدر وقیمت اور تمام اقدار کو پامال کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس طرزِ عمل کا خاص طور پر ان افراد میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جن کی تمام عمر یاس وناکامی کا شکار رہی ہو اور جن کی نظر میں پوری کائنات عبث، بے قدر وقیمت اور مصنوعی ہو۔

اشیاء اور اشخاص پر ان کی تنقید سب ان کی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے۔
یہ لوگ جس چیز کو ایک دن عزیز رکھتے ہیں اگلے دن اس سے متنفر نظر آتے ہیں اور انہیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس نفرت کا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ خود ان کی روح میں ہے۔ درحقیقت بدنیتی اور عداوت انسان کے اندر مہر و محبت کے سوتے خشک ہو جانے کا نتیجہ ہے۔"

(روان شناسی برای ہمہ - ص ۲۵۸ ۲۵۷)

حتیٰ اگر کوئی نیک کام کسی کی ذمہ داری اور فرائض میں شامل ہے تب بھی قابلِ تحسین و قدردانی ہے اور ایسے فرض شناس افراد کی بھی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے فرائض کو مزید تندہی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں۔

راقم الحروف چند سال قبل ایران کے ایک معروف شہر میں رہائش پذیر تھا۔ ایک روز کسی فنی نقص کی وجہ سے ہمارے محلّہ کی بجلی فیل ہو گئی۔ میں نے ٹیلی فون کے ذریعہ بجلی کے محکمہ کے ذمہ دار سے رابطہ قائم کیا اور ان سے مذکورہ نقص کو دور کرنے کے لئے اقدام کی گزارش کی۔ کافی دیر بعد نقص دور ہوا اور بجلی بحال ہو گئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر فون کیا اور بجلی بحال کرنے کے سلسلے میں اس اہلکار کے اقدام کو سراہا۔ یہ اہلکار شروع میں جس کا لہجہ روکھا سا تھا قدردانی کے الفاظ سن کر نہایت خوشی اور حیرت سے پوچھنے لگا۔ آپ کون صاحب ہیں؟ میں نے جب سے یہاں کا چارج سنبھالا ہے یہ پہلی مرتبہ ہے کہ کسی نے میری حوصلہ افزائی کی ہے اور کام کو سراہا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اس

شہر کا باشندہ نہیں ہوں اور میں نے محض آپ کی فرض شناسی کی بناء پر آپ کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے بعد وہ محبت و عقیدت کا اظہار کرنے اور بالمشافہ ملاقات کی درخواست کرنے لگا۔

اس کے بعد جب کبھی ہمارے علاقے کی بجلی کی فراہمی میں خلل واقع ہوتا اور میں اس شخص سے رابطہ قائم کرتا تو وہ چٹکیوں میں نہایت محبت و عقیدت کے ساتھ اس کے نقص کو دور کر دیتا۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد اس نے ہمارے علاقے کے بجلی کے پُرانے تار ہی بدل ڈالے جو آئے دن بجلی کی فراہمی میں خلل کا سبب تھے۔

معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ مذکورہ شخص ایک طویل عرصہ سے اس عہدے پر فائز ہے اور اس پورے عرصے میں ایک مرتبہ بھی اس کی حوصلہ افزائی اور قدردانی نہیں کی گئی تھی۔

چاپلوسی

یاد رہے کہ ستائش و قدردانی سود مند نتائج اور گہرے اثرات کی حامل ہونے کے باوجود بعض حدود و قیود رکھتی ہے اور اسے معقول اور منطقی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ اسی طرح جیسے مثبت اور تعمیری کام انجام دینے والے لوگوں سے لاتعلقی ان کی کارکردگی اور استعداد میں جمود ورکود پیدا کر دیتی ہے بالکل اسی طرح حد سے زیادہ تحسین و آفرین بھی مذموم و ضرر رساں خوشامد و چاپلوسی شمار ہوتی ہے اور ایک طرح حقیقت سے عاری محسوس ہوتی ہے۔

ڈیل کارنیگی لکھتا ہے۔

"حساس اور صاحبِ شعور افراد پر چاپلوسی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔
کیونکہ چاپلوسی کھوکھلی اور لغو باتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے خوشامد کرنے والے کی غرض مندی کو ظاہر کردیتی ہے اور قدرتی طور پر خوشامد سننے والے کو یہ باتیں بُری محسوس ہونے لگتی ہیں۔
دل کی گہرائیوں سے پھوٹنے والی تعریف و تحسین اور چاپلوسی و خوشامد کے درمیان بہت فرق ہے۔ خوشامد فوائد سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ خوشامدی افراد اکثر بڑے نقصانات سے دوچار ہوتے ہیں۔
کیونکہ چاپلوسی ایک طرح کی چالبازی اور مضحکہ خیز حیلہ ہے جو آخرکار ظاہر ہوکے رہتا ہے۔ البتہ صدقِ دل سے کی جانے والی تحسین و ستائش ایک دوسری چیز ہے۔ میں ہرگز آپ کو خوش آمد اور چاپلوسی کی ترغیب نہ کروں گا۔ میرا مقصد ایک مخصوص طرزِ فکر ایجاد کرنا ہے جو زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دے۔
گفتگو و مکالمہ کے وقت تمام توجہات کا مرکز خود اپنی ذات کو نہیں بنانا چاہئے بلکہ کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے مخاطب کی صفات و اخلاق کو نظر میں رکھیں۔ اس صورت میں آپ اس شخص کی خوبیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ پھر دل کی گہرائی سے اس کی اس خوبی کی تعریف کیجئے۔ کسی کی ایسی نامناسب تعریف سے گریز کیجئے جس کی گواہی خود آپ کا دل بھی نہ دے۔" (آئینِ دوست یابی۔ ص ۴۲)
عمر بن عبدالعزیز دوسرے اموی خلفاء کی نسبت زیادہ انسانی فضائل کا مالک تھا۔ اس کے عہدۂ خلافت سنبھالنے پر بہت سے لوگ مبارک باد کی غرض سے

حاضر ہوئے۔ انہی میں عرب کا ایک معروف شخص "خالد ابنِ عبداللہ" بھی شامل تھا۔ جب حاضرین کی طرف سے خلیفہ کے لئے خیر مقدمی کلمات کہنے کا وقت آیا تو عبداللہ بھی ایک گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور یوں آغازِ سخن کیا۔
"اے خلیفۂ مسلمین! بعض لوگوں کا افتخار ان مناصب سے وابستہ ہوتا ہے جو وہ زندگی میں حاصل کرتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے شرف و فضیلت کی وجہ مقامِ خلافت اور مسلمانوں کی فرمانروائی ہوتی ہے.....
لیکن اے خلیفہ! آپ خلافت و فرمانروائی کے لئے باعثِ افتخار ہیں۔
تخت و تاج نے آپ کے وجود سے قدر و منزلت پائی ہے آپ ایک عرب شاعر کے اس قول کے مصداق ہیں۔"

اذالدر زان حسن وجوه
کان للدر حسن وجهک زینا

"چہرہ کو حسن دینے کے لئے اسے موتیوں سے سجایا جاتا ہے۔ لیکن تیرے چہرے کا حسن موتی کے لئے زینت ہے۔"
خالد بن عبداللہ پُرجوش انداز میں مخاطب تھا' کبھی نثر اور کبھی نظم کے ذریعہ خلیفہ کی مدح و ستائش میں مصروف تھا۔ لیکن خلیفہ اس کی نامعقول خوشامد و چاپلوسی سے بے زار بیٹھا تھا۔ جب بے زاری ناگواری کی حدود کو چھو گئی تو خلیفہ نے یکلخت اس کی گفتگو قطع کی اور عبداللہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی جگہ بیٹھ جائے۔ پھر خلیفہ نے حاضرین کی طرف رخ کیا اور کہا۔
"تمہارے دوست کو عقل و خرد سے کام لینا چاہئے زبان دانی سے

نہیں۔"

بے شمار دوسرے عیوب و نقائص کے ساتھ ساتھ چاپلوسی اور خوشامد بھی ہمارے معاشرہ کی ایک بیماری ہے' جو اپنی وحشت ناکیوں کے ذریعہ معاشرہ کے بہت سے شعبوں میں خلل کا موجب ہے۔ بہت کم ایسے افراد سے سابقہ پڑتا ہے جو محض حق و حقیقت کی بناء پر کسی کے اچھے کاموں کو سراہتے ہیں اور ان کی تعریف و ستائش کا مقصد واقعی کسی کے کام کی قدر و منزلت اور کارہائے نمایاں انجام دینے والے کی حوصلہ افزائی ہوتا ہے۔

ایران کے ایک مصنف اور سماجی شخصیت کہتے ہیں۔

"رفتہ رفتہ یہ بات میرے سامنے ایک کلّی اصول کے بطور واضح ہوگئی ہے کہ جو کوئی مجھ سے ملاقات کے لئے آتا ہے وہ پہلے تو میری تصانیف کی تعریف کرتا ہے اور پھر فوراً مجھ سے درخواست کرتا ہے کہ میرے فلاں الجھے ہوئے کام کا حل آپ کے ذریعہ ممکن ہے برائے مہربانی اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیے۔ یا کسی اور مسئلہ میں مدد کی درخواست کرتا ہے۔۔۔۔ کوئی بھی محض میری حوصلہ افزائی کی غرض سے مجھ سے ملاقات کے لئے نہیں آتا۔"

مزید کہتے ہیں کہ۔

"حقیقتاً کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مُترقی کہی جانے والی دنیا میں خطیبوں، مصنفوں اور ادیبوں کو روزانہ دسیوں ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں لکھنے والے بے لوث، بغیر کسی ذاتی غرض و مقصد کے، انتہائی صمیم قلب کے ساتھ محض حوصلہ افزائی کی غرض سے

ان کی تعریف و قدر دانی کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ملک میں بہت کم ایسے خطیب اور مصنف ہوں گے جن کی بغیر کسی غرض و مطلب کے تعریف و تشویق کی جاتی ہو۔"

پاکیزگی میں اضافہ کے لئے اسلام کا لائحہ عمل

اسلام کی ایک گرانقدر اور تعمیری اثرات کی حامل تعلیم یہ ہے کہ مسلمان خداوندِ عالم کی بے پایاں نعمتوں کا شکرگزار رہے۔ درحقیقت قدر شناسی کی حس باطنی آزادی (یعنی وہ چیز جو اسرار آمیز طور پر انسانی شخصیت سے پیوستہ ہے) کی تسکین کا ذریعہ ہے۔

معاشرہ میں انسانی فضائل کو فروغ دینے کے لئے جذبات کی تحریک و تشویق ایک موثر و مفید عامل ہے۔ اگر لوگ نیکوکاروں کے لئے خوشگوار اور بدکاروں کے لئے ناگوار ردِّعمل کا مظاہرہ کریں تو معاشرہ سلامتی و کمال کی جانب راہ پر آگے ہی آگے بڑھے گا۔ کیونکہ جب افرادِ معاشرہ کے دلوں میں بروں کے لئے سخت اور تنفر آمیز جذبات پائے جائیں اور نیک و پرہیزگار لوگوں کے بارے میں قدر دانی و ستائش کے جذبات موجود ہوں تو قدرتی طور پر معاشرہ کا رجحان فضیلت و تقویٰ کی جانب ہوگا اور پاکیزہ اہداف و خواہشات کو فروغ حاصل ہوگا۔ قدر و قیمت کا معیار و ملاک روشن ہونے کی وجہ سے اچھے اور برے افراد علیحدہ علیحدہ صفوں میں کھڑے نظر آئیں گے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام مالکِ اشتر کے نام اپنے تاریخی فرمان میں اس بارے میں یوں نصیحت فرماتے ہیں۔

"ولا یکونن المحسن والمسیٔ عندک بمنزله سواءٍ فان فی ذلک تزهید لاهل الاحسان فی الاحسان وتدریبا لاهل الاسائة علی الاسائة والزم کلامنهم ما الزم نفسه۔"

"تمہاری نظر میں نیکوکار اور بدکار کو ایک ہی مقام حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ طرزِ عمل نیکوکاروں کو نیکی و پرہیزگاری کے کاموں سے دور کردے گا اور بدکاروں کو بدی کی ترغیب دے گا۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کی اختیار کردہ راہ و رَوِش کے مطابق اجرو پاداش دو۔" (نہج البلاغہ مکتوب نمبر۵۳)

بعض ایسے افراد جو کمال کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہوتے ہیں ان کے لئے وظائف و فرائض کی بجا آوری کے بعد حاصل ہونے والا سکون و اطمینان ہی بہترین اجرو پاداش اور ان کاموں کی انجام دہی کے لئے تحریص و تشویق کا سبب ہے۔ لیکن ایسے افراد کمیاب ہوتے ہیں اور اس آئیڈیل اخلاقی سطح تک رسائی معدودے چند ہی افراد کو میسّر ہوتی ہے۔ اکثر لوگ کمال کی اس منزل پر نہیں پہنچ پاتے کہ تحسین و ستائش سے بے نیاز ہوں۔ لہٰذا حوصلہ افزائی، تشویق اور قدردانی کی اہمیت اور تاثیر سے کسی طور غفلت نہیں برتی جاسکتی۔

مشہور ماہرِ نفسیات "شاختر" کہتا ہے کہ۔

"اگر آپ کسی پر اعتراض کو ضروری سمجھیں اور اس کے کسی عمل پر تنقید کرنا چاہیں تو لازم ہے کہ پہلے اس کے کسی اچھے عمل کی تعریف کیجئے۔ تاکہ قدردانی کے بارے میں اس کی احتیاج کی تسکین ہو

جائے۔ پھر اس کے بعد اگر آپ اس کے کام پر تنقیدی رائے پیش کریں گے تو اُسے یہ بات چنداں ناگوار نہ گزرے گی بلکہ وہ آپ کے اعتراض اور اصلاح کے بارے میں آپ کے نکتۂ نظر کو نہایت ذوق و شوق سے قبول کرے گا۔"

اگر کوئی منیجر اپنے سکریٹری کے ٹائپ کئے ہوئے خط کو نامناسب سمجھتا ہو تو اُسے اس طرح اظہار کرنا چاہئے۔

"کل تمہارا ٹائپ کیا ہوا خط بہت واضح و عمدہ تھا لیکن یہ خط کچھ غیر واضح سا ہے۔ ذرا اس کی اصلاح کرکے دوبارہ ٹائپ کردو۔ یقیناً آپ کا سکریٹری اس بات سے دل گرفتہ نہ ہوگا بلکہ وہ شکریہ کے ساتھ آپ کی جانب سے کی جانے والی قدردانی اور توجہ کو قبول کرے گا اور اپنے کام کو زیادہ محنت اور توجہ کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرے گا۔

جب آپ دیکھیں کہ ہوٹل کا بیرا نہایت تیزی سے اِدھر اُدھر مختلف میزوں پر اشیاء خوردونوش فراہم کر رہا ہے لیکن کافی دیر گزر جانے کے باوجود آپ کے پاس نہیں آیا تو اس پر ناراض نہ ہوئیے اور اس سے ترش روئی سے پیش نہ آئیے۔ بلکہ جب وہ آپ کے پاس آئے تو اس کے کام کی سختی کا ذکر کرکے اس کی محنت و تندہی کو سراہتے ہوئے اپنی بات کیجئے۔ یقین رکھئے وہ مزید لگن سے اپنے کام میں مشغول ہوجائے گا اور ساتھ ہی جتنا جلد ممکن ہوگا آپ کی میز کو بھی اشیاء خوردونوش سے سجادے گا۔"

ہر شخص خواہ وہ کسی بھی سِن و سال کا ہو اور کسی بھی مقام و مرتبہ پر فائز ہو دلی طور پر اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ لوگ اس کے کئے ہوئے کاموں پر توجہ دیں۔ حتیٰ اگر کوئی عُمر رسیدہ مُعلّم مدّتوں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے اور برَسوں اپنی تعریف و تمجید سننے کے بعد بھی اپنے کسی چھوٹے سے شاگرد سے یہ سنے کہ۔

"سر آج آپ نے بہت اچھا پڑھایا ہے۔" تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

لوگ توجہ وقدردانی کے خواہشمند ہوتے ہیں' آپ ان کی یہ خواہش پوری کیجئے تاکہ زندگی کی سختیاں آسان وخوشگوار ہو جائیں۔ دوسروں کی حوصلہ افزائی اور تعریف و تمجید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجئے تاکہ دوسرے بھی توجہ وقدردانی کے سلسلے میں آپ کی خواہش کو پورا کریں۔"

(رشدِ شخصیت۔ص ۴۶'۴۵)

ہمیں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ افرادِ بشر میں جس طرح نمایاں اخلاقی خوبیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح ممکن ہے ان کے اندر بعض نقائص ومعائب بھی موجود ہوں۔ ہم خود اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور خرابیوں اور نقائص سے مبّرا نہیں۔ لہٰذا دوسروں کی کمزوریوں پر انگشت نمائی کی بجائے ان کی خوبیاں اور امتیازات پیشِ نظر رکھیں۔ حضرت علی علیہ السلام ایک نہایت عمدہ تعبیر کے ذریعہ اس جانب ہماری توجہ مبذول فرماتے ہیں۔

"کن کالنحلة اذا اکلت طیباً و اذا وضعت

وضعت طیبا وان وقعت علی عود لم تکسره"

"شہد کی مکھی کی مانند بنو جو بہترین چیز کو اپنی غذا بناتی ہے اور بہترین چیز (شہد) کو خود سے خارج کرتی ہے اور جب کسی شاخ پر بیٹھتی ہے تو اسے نقصان نہیں پہنچاتی۔" (غرر الحکم۔ص ۵۶۹)

جب کبھی آپ کے دوست احباب آپ سے محبت اور حُسنِ سلوک کا برتاؤ کریں' جب آپ دیکھیں کہ وہ نہایت خلوصِ دل اور حُسنِ نیت کے ساتھ آپ کی خواہشات و تقاضوں کی تکمیل اور مشکلات رفع کرنے میں مصروف ہیں تو اخلاقی طور پر آپ کا فرض ہے کہ ان کا شکریہ ادا کیجئے' ان کے خلوص کو سراہئے اور بے دریغ ان کے ساتھ اپنی محبت والفت کا اظہار کیجئے۔

قدردانی ممکن ہے کبھی آپ کے ایک مثبت' نیک' بے لوث اور ہر قسم کی ریا سے پاک اقدام سے ظاہر ہو جائے۔

"کروٹین" لکھتا ہے کہ میرا بیٹا جو میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہے یوں حکایت کرتا ہے۔

"اسپتال میں داخل ایک مریض کو خون کی ضرورت پڑی۔ اسے ایک شخص سے حاصل کیا ہوا خون چڑھا دیا گیا۔ صحت یابی کے بعد مریض نے کہا کہ جس شخص نے اسے خون دیا ہے وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ اسپتال میں خون دینے والوں کے نام ظاہر نہیں کئے جاتے۔ الغرض یہ مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو کر اپنے گھر منتقل ہو گیا۔ چند ہفتہ بعد وہی صحت یاب ہونے والا مریض خود بھی اسپتال خون دینے آیا اور پھر مسلسل وہ خون دینے آنے لگا۔ ایک روز ڈاکٹر

نے اس سے دریافت کیا کہ تم کیوں مسلسل خون دینے آتے ہو، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس نے نہایت سادہ سا جواب دیا کہ۔ "ایک اجنبی شخص نے اپنا خون دے کر میری جان بچائی تھی میں اس طرح خون دے کر اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

(دانستنیمائی جہانِ علم۔ص ۱۵۹)

نیکی واحسان پر کم از کم زبانی اظہارِ تشکر و قدردانی بھی نہ کرنا مردانگی اور مروّت کے خلاف ہے اور یہ عمل ایک طرح کی حق تلفی کے زُمرہ میں آئے گا۔

ناقدری کے عظیم نقصانات

ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ جس قدر بھی آپ ان کے ساتھ اچھائی اور نیک سلوک کریں، ان کی معاونت کریں لیکن پھر بھی زبانی تو در کنار وہ دل میں بھی آپ کے اس عمل کی قدر نہیں کرتے۔ گویا ان سے نیک برتاؤ اور ان کی مدد دوسروں کے فرائض و ذمہ داریوں میں سے ہے اور خود ان کا فرض محض ناشکری اور احسان فراموشی ہے۔ ہم سب ہی کا کبھی نہ کبھی ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کا یہ سلوک، عقل، انسانیت اور کسی بھی منطق سے سازگار نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ان ناقدر لوگوں کو حیوانات کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"من لم یشکر الانعام فلیعد من الانعام"

"جو شخص دوسروں کا شکریہ ادا نہ کرے اس کو جانوروں میں شمار کرنا

چاہئے۔" (غرر الحکم۔ص ۶۷۲)

حتیٰ اگر کوئی حسنِ نیت اور خلوصِ دل کے ساتھ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہو لیکن عملاً اس میں کامیاب نہ ہوسکے تب بھی اس کی نیک نیتی اور خلوص کو سراہنا چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"من لم یحمد اخاه علی حسن النیة لم یحمده علی الصنیعة"

"جو شخص اپنے دوست کی نیک نیتی اور خلوصِ دل پر اس کا شکریہ ادا نہ کرے تو وہ اس کے نیک عمل اور خدمت پر بھی اس کا مشکور نہ ہو گا۔"

امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا۔

"خیر اخوانک من نسی ذنبک وذکر احسانک الیه"

"تمہارا بہترین دوست وہ ہے جو تمہاری لغزشوں کو فراموش کردے اور تمہارے احسانات کو یاد رکھے۔"

انسان کو ناشکری کے ناقابلِ تلافی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص دوسروں کی مہربانیوں اور خدمات کا یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ انہیں اس سلسلہ میں کافی زحمتیں اور مشقتیں جھیلنا پڑیں ہیں شکریہ ادا نہیں کرتا، انہیں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو دوسرے بھی آئندہ اس کی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں رغبت کا اظہار نہیں کرتے۔ حضرت علی علیہ السلام

ایک مختصر جملہ میں اس زیاں اور محرومیت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں
کہ۔

"من لم یشکر الاحسان لم یعدہ الا الحرمان"

"جو شخص نیکی و احسان پر شکریہ ادا نہ کرے وہ محرومی کے سوا کچھ
نہیں پائے گا۔" (غرر الحکم۔ص ۷۰۴)

مالکِ اشترؓ کو اپنے فرمان میں قدردانی کی اہمیت اور اس کے پُرثمر نتائج کے
بارے میں فرماتے ہیں۔

"لا تدع تفقد لطیف امورھم اتکالا علی
جسیمھا فان للیسیر من لطفک موضعاً
ینتفعون به وللجسیم موقعاً لا یستغنون عنه
....."

"اس خیال سے کہ تم نے ان کی بڑی ضرورتوں کو پورا کر دیا ہے'
کہیں ان کی چھوٹی ضرورتوں سے آنکھ بند نہ کر لینا۔ کیونکہ یہ چھوٹی
قسم کی مہربانی بھی اپنی جگہ فائدہ بخش ہوتی ہے اور وہ بڑی ضرورت
اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔"

"فافسح فی آمالھم وواصل فی حسن الثناء
علیھم و تعدید ما ابلی ذوو البلاء منھم فان کثرة
الذکر الحسن افعالھم تھز الشجاع و تحرض
الناکل....."

"لہٰذا لوگوں کی امیدوں میں وسعت و کشائش رکھنا' انہیں اچھے

لفظوں سے سراہتے رہنا اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کرتے رہنا۔
اس لئے کہ انُ کے اچھے کارناموں کا ذکر بہادروں کو جوش میں لے
آتا ہے اور پست ہمتوں کو ابُھارتا ہے۔"

(نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۵۳)

حوصلہ افزائی اور قدردانی کے سلسلہ میں کئے گئے بعض تجربات کا حاصل
ملاحظہ فرمایئے۔

"اگر ماں باپ اور اولاد ایک دوسرے کے اچھے کاموں کی تعریف و
تمجید کریں تو نفسیاتی کلینک پر جمع ہونے والے احساسِ کمتری کے
مریضوں کی تعداد بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔"

"دوسروں کی طرف سے کی جانے والی تعریف و ستائش کی حرارت
سے انسان خود کو گرم رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ شدت کے ساتھ
احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔"

"اگر آپ اپنی اٹھائی گئی زحمتوں اور مشقتوں کے جواب میں کلمۂ تشکر
نہ سنیں تو آپ کی زندگی سخت دشوار ہو جائے۔"

"بسا اوقات میں اپنے آپ کو اس عورت کی مانند سمجھنے لگتا ہوں جس
نے اپنی زندگی کے انتہائی قیمتی بیس سال چرواہوں کی خدمت میں
گزار دیئے اور ہمیشہ ان کی طرف سے صرف ایک کلمۂ تحسین کی
منتظر رہی۔ لیکن ایک دن اس نے سنا کہ وہ اس کے بارے میں کہہ
رہے ہیں کہ یہ عورت تو بے وقوف ہے۔ اس عورت نے پلٹ کر
جواب دیا کہ آج تک میں نے تم سے کوئی ایک بھی ایسی بات نہیں

سُنی جس سے مجھے معلوم ہو کہ تم دیوانوں اور غیر دیوانوں میں تمیز کر سکتے ہو۔"

ڈاکٹر "وائل" جو بچّوں کے پیچیدہ امراض کے علاج کا کافی وسیع تجربہ رکھتے ہیں ایک دن ایک ایسے ہی بچّے کا علاج کرتے ہوئے جس کی بیماری قابلِ توجہ حد تک شدید تھی مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کبھی کبھی تعریف و توصیف کو بھی ڈاکٹری ہدایات میں شامل ہونا چاہیے۔ بتانے لگے کہ یہ قصّہ میرے زیرِ علاج دو جڑواں بچّوں کا ہے۔ ان میں سے ایک غیر معمولی طور پر ذہین جبکہ دوسرا ذرا کند ذہن نظر آتا تھا..... ان بچّوں کے والدین میرے پاس اسی ثانی الذکر بچّے کے علاج کے سلسلے میں آئے۔ دورانِ علاج جب اس بچّے کو مجھ پر اعتماد ہو گیا تو وہ اس مرض میں مبتلا اکثر بچّوں کی مانند مجھ سے پوچھنے لگا۔ لوگ میرے بھائی کی طرح مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ جب وہ کوئی غلط کام کرتا ہے تو مسکرا کے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن جب وہی بات مجھ سے سرزد ہوتی ہے تو سختی سے پیش آتے ہیں۔ میں ہرگز اس خوبی سے کام انجام نہیں دے سکتا جس قدر خوبی سے میرا بھائی کام کرتا ہے۔

ڈاکٹر وائل گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید کہنے لگے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا حتیٰ اسکول میں بھی علیحدہ علیحدہ کلاسوں میں بٹھایا۔ ان کے ماں باپ سے درخواست کی کہ کند ذہن بچّے کا اپنے بھائی سے مقابلہ نہ کروائیں اور کوشش

کریں کہ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی بھی تعریف کریں۔۔۔۔ اس کوشش کے نتیجہ میں یہ بچّہ کچھ ہی عرصے میں خود اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔"

"میرے ایک واقف کار جو خاصے صاحبِ ثروت ہیں اکثر اس بات پر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ انہوں نے کبھی اپنے خدمتگاروں کو ایک دینار بھی بخشش نہیں دی۔ ایک روز جبکہ سال کا پہلا ہی دن تھا اطلاع موصول ہوئی کہ ان کے اکاؤنٹنٹ نے خودکشی کر لی ہے۔ گو حساب کتاب بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اکاؤنٹنٹ غیر شادی شدہ اور خوشگوار زندگی بسر کر رہا تھا اس لئے خودکشی کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہاں اس نے اپنے مالک کے نام ایک مختصر نوٹ چھوڑا تھا جو اس کی خودکشی کی وجہ بیان کرتا تھا۔ اس نوٹ کا مضمون کچھ یوں تھا کہ۔

"میں نے تقریباً تیس سال سے حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی نہیں سنا اب یہ بات میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے اور میں اپنی زندگی سے سیر ہو چکا ہوں۔"

(کلید ہائی خوش بختی۔ ص ۳۳۵، ۳۳۷)

خود اعتماد اور صحت مند شخصیت رکھنے والا فرد ہی حوصلہ افزائی اور تشکر کی روح سے سرشار ہوتا ہے۔ جبکہ بے جا مدح و ثناء احساسِ حقارت، شخصیت کی فرومائیگی، خوف و تزلزل کی علامت ہے۔ بے موقع تحسین و آفرین ان لوگوں کا شیوہ ہے جو اس کے ذریعہ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی ستائش جو طمع ولالچ

کی غرض سے کی جائے کیونکہ خلوصِ نیت کے ساتھ نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے کی جاتی ہے اس لئے ہر قسم کی قدروقیمت سے عاری ہوتی ہے۔ یہ مفاد پرست ستائش کرنے والے ان ماہر شکاریوں کی مانند ہیں جو مدح و ستائش کا جال پھیلائے بیٹھے ہوں۔

"ولٹر" کہتا ہے۔

"جو لوگ چرب زبانی میں ماہر ہوں اکثر ان کے دل میں کوئی ناپاک ارادہ ہوتا ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا۔

"الثناء باکثر من الاستحقاق ملق والتقصیر عن الاستحقاق عی او حسد"

"کسی کے استحقاق سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی اور استحقاق سے کم تعریف کرنا عاجزی و حسد ہے۔" (سفینۃ البحار جلد ۲۔ ص ۵۲۸)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"لیس من خلق المؤمن الملق"

"چاپلوسی مومن کی صفت نہیں ہوتی۔"

بے جا مدح و ثناء غرور کا سبب بن جاتی ہے اور مغرور شخص اگر صاحبِ قدرت و نفوذ ہو جائے تو دوسروں کی پندونصیحت قبول نہیں کرتا اور حق و حقیقت پر انحصار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

حضرت علی علیہ السلام مالکِ اشترؓ کے نام اپنے فرمان میں فرماتے ہیں کہ۔

"ثم رضهم علی ان لا یطروک ولا یبحوک بباطل لم

تفعلہ فان کثرۃ الاطراء تحدث الزھو و تدنی من الغرۃ"

"لوگوں کی اس طرح تربیت کرو کہ وہ تمہاری بے جا مدح و ثناء نہ کریں۔ چاپلوسی نہ کریں اور ایسے کاموں پر تمہیں نہ سراہیں جو تم نے انجام ہی نہ دیئے ہوں۔ کیونکہ حد سے زیادہ ستائش انسان کو خود پسند بنا دیتی ہے اور آدمی کو غرور و نخوت میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

(نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۵۳)

لہٰذا اگر کسی کی حد سے زیادہ تجلیل کی جائے اور اس کے قد سے بڑھ کر اسے بتایا جائے تو نہ صرف یہ کہ ایسے شخص کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا' وہ جہاں ہوتا ہے وہیں رہتا ہے بلکہ خوش آمد و چاپلوسی کرنے والا اپنی شخصیت گرا بیٹھتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے استحقاق سے کم اس کی تعریف و توصیف کی جائے تب بھی یہ شخصیت کو گھٹا کر پیش کرنے والے کے نفسیاتی عدم توازن اور حسد کی علامت ہے۔

چنانچہ جو جس حد تک احترام و ستائش کے قابل ہے اسے اسی سطح پر رکھا جائے۔ اس طرح آپ اور اُس دوسرے' دونوں کی شخصیت محفوظ رہے گی۔ اِس طرح نہ وہ کبرونخوت کے دام میں پھنسے گا اور نہ آپ حقیر و بے مایا شمار ہوں گے۔

دوسری طرف کیونکہ چاپلوس آدمی کی باتیں حق و حقیقت پر مبنی نہیں ہوتیں اور وہ انسان کے باطن سے نہیں پھوٹتیں اس لئے اس ریاکارانہ تحسین و ستائش پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو شخص ایک خاص مقصد کے تحت

آپ کی تعریف کر رہا ہے ممکن ہے آپ کے غیاب میں اپنی کسی اور مصلحت کے لئے آپ پر اعتراض اور آپ کی بدگوئی سے پرہیز نہ کرے اور آپ کو ملامت واِستہزاء کا ہدف قرار دے۔

حضرت علی علیہ السلام چاپلوسوں کی اس نفرت انگیز خصوصیت کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

"من مدحک بما لیس فیک فهو خلیق ان یذمک بما لیس فیک"

"جو شخص تمہیں ایسے فضائل وخصوصیات کی وجہ سے سراہے جو تم میں موجود نہ ہوں، تو وہ ایسی برائیوں پر بھی تمہاری مذمت کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کرے گا جو تم میں نہیں پائی جاتیں۔"

جس طرح تشویق وتحسین انسان کی ایک نفسیاتی احتیاج اور اس کے تکامل وتعالی کا موجب ہے اسی طرح بے جا اور مسلسل سرزنش وملامت انسانی نفسیات پر نامطلوب اثرات کا سبب بنتی ہے اور ممکن ہے انسان کو ناپاکی اور مفاسد کی راہ پر کھینچ لے جائے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ایاک ان تکرر العتب فان ذلک یغری بالذنب ویهون العتب"

"بار بار سرزنش وملامت سے پرہیز کرو کیونکہ یہ طریقہ گناہوں میں آلودہ ہو جانے اور ملامت کے بے اثر بن جانے کا سبب بنتا ہے۔" (فہرست غرر الحکم۔ص ۳۵۹)

بچّوں کو خوش کرنا خود ایک طرح کی موثر تشویق ہے، جو ان کی محبت حاصل کرنے اور ان سے قلبی تعلق استوار کرنے کا ذریعہ ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"اذا نظر الوالد الی ولده فسره کان للوالدعتق نسمة"

"اگر باپ اپنی پیار بھری نظروں سے بچّے کو خوش کردے تو بارگاہِ خدا میں اسے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔"

(مستدرک جلد ۲۔ص ۶۲۶)

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے۔

"ضروری ہے کہ سرزنش وملامت کے مقابلہ میں تعریف وستائش زیادہ کی جائے۔ تنبیہہ وتہدید کا پہلو محدود ہونا چاہئے۔ اسے صرف ان مواقع پر کام میں لانا چاہئے جب بچّہ خلافِ توقع کوئی برا عمل انجام دے۔ اور جب یہ ڈانٹ پھٹکار اپنا اثر دکھادے تو پھر اسے جاری رکھنا مناسب نہیں۔

بچّوں کی پرخلوص محبت کا حصول ہماری قیمتی ترین خوشی ومسرّت ہے۔ ہمارے آباؤاجداد اور بزرگ اس مسرّت سے آگاہ نہ تھے اس لئے انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کس چیز سے محروم ہیں۔ یہ لوگ بچّوں کو اس بات کی تعلیم دیتے تھے کہ والدین سے محبت ان کا فرض ہے اور پھر ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے کہ اس فریضہ کی انجام دہی بچّوں کے لئے تقریباً ناممکن ہوجاتی۔ "کیرولین" اس فصل کے

آغاز میں ایک شعر روایت کرتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "بہت کم ایسا ہوا ہے کہ میں اپنے باپ سے ملاقات کے لئے گیا ہوں اور خوش ہوا ہوں کیونکہ میں صرف اور صرف اس لئے جاتا ہوں کہ کہیں وہ (نہ آنے پر) مجھے تازیانے نہ مارے۔" جب یہ طرزِ فکر مسلط ہو جائے یعنی محبت والفت ایک فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لئے باقاعدہ حکم دیا جانے لگے تو ہرگز بچّوں کی سچّی محبت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح لوگوں کے باہمی روابط خشک، سخت، سرد اور تلخ رہ جائیں گے۔ آزار اور تنبیہہ اس تصوّر کا ایک کُلّی حصّہ تھی۔ خدا کے کرم سے گذشتہ صدی میں والدین اور بچّوں کے اس ربط و تعلق کے بارے میں ایک بہتر تصوّر اجاگر اور رائج ہوا ہے اور بتدریج چھاتا جارہا ہے۔ اور قدیم سخت تنبیہہ آمیز رویہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے اور مجھے امید ہے کہ تعلیم و تربیت کے نئے اور روشن افکار جو دنیا بھر میں غلبہ حاصل کر رہے ہیں بتدریج دوسرے انسانی روابط میں بھی نفوذ کر جائیں گے۔ کیونکہ جس طرح بچّوں کے بارے میں ان نظریات و رجحانات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اسی طرح تمام دوسرے انسانی روابط بھی ان کے محتاج ہیں۔" (در تربیت۔ ص ۱۲۵-۱۲۲)

تربیت کا یہ اصول جسے انگریز دانشور گذشتہ صدی کی سوغات کہتے ہیں اس سے ۱۳۰۰ سال قبل پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات میں موجود تھا۔ آنحضرتؐ کی عطوفت و مہربانی صرف اپنے بچّوں تک محدود نہ تھی بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ آپؐ دوسروں کے بچّوں سے بھی محبت و مہربانی سے پیش آتے تھے اور ان پر

بھی بے دریغ لطف و کرم نچھاور کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی اسی رَوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ۔

"والتلطف بالصبيان من عادة الرسولؐ"

"بچّوں کے ساتھ مہر و محبت سے پیش آنا اور ان پر خاص توجہ دینا رسولِ اکرمؐ کے اخلاق میں شامل تھا۔"

خرابیوں کے خلاف جہاد

نیکوکاروں کو نیکیوں پر ابھارنے اور بدکاروں کی حوصلہ شکنی کے لئے ایک موثر عامل امربالمعروف و نہی عن المنکر کا رواج ہے۔ کسی معاشرہ کی عظمت و کامیابی کی بنیاد اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت سے وابستہ ہے لیکن اخلاقی خرابیوں کا پھیلاؤ اقدار کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور انسانوں کو خود بخود تقویٰ و پرہیزگاری کی راہ سے دور کر کے ہوا و ہوس کے راستے پر لے جاتا ہے۔ فطرتاً گناہ سرعت کے ساتھ پھیلتا ہے اور نہایت تیزی سے معاشرہ کے مختلف ابعاد اور پہلوؤں پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اگر گناہ کی جڑ کو ابتداء ہی میں نہ کاٹ دیا جائے تو اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے، اطراف و جوانب کے ماحول کو آلودہ کر دیتا ہے اور سالم و صحت مند چیزوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

بُرائیوں کے شرمناک اور قبیح نتائج محض ان گناہوں کے مرتکب افراد تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ اس کے شعلے ان لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں جو بُرائیوں کے پھیلاؤں سے لاتعلق رہ کر انہیں مزید پھلنے پھولنے کا

موقع فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ گناہوں کی روک تھام پر قادر ہونے کے باوجود منفی رویہ اختیار کرتے ہیں اور ہر قسم کی ہدایات ونصائح سے پرہیز کرتے ہیں۔ بے شک ایسے لوگ بھی کیونکہ معاشرہ کو گناہوں سے آلودہ کرنے میں شریک رہے ہیں اس لئے اس کی سزا سے بھی نہیں بچ سکتے۔

انسان کو بُرائیوں کے مقابل سکوت کی بجائے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح دوسروں کو باقاعدہ طور پر بُرائیوں کی جانب لے جانا گمراہی کا عامل ہے اسی طرح قدرت واختیار کے ہوتے ہوئے گناہگاروں کے کاموں سے بے اعتنائی برتنا' انہیں گناہوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کرنا بھی گناہ وانحراف کا ایک عامل شمار ہوگا۔

اخلاق وفضیلت کی راہ دکھانے والے اور بشریت کے رہنما گاہے بگاہے اپنے امکانات کے مطابق لوگوں کو مختلف برائیوں سے آگاہ اور ان کے زیاں بخش آثار ونتائج سے خبردار کرتے رہے ہیں۔

یہ ہستیاں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ معاشرہ میں گناہوں کے پھیلاؤ اور بُرائیوں کے جڑ پکڑ جانے کے نتیجے میں' ارتقاء کی راہ پر جاری انسانیت کا سفر رک جاتا ہے۔ منکرات سوائے مفہوم آزادی کو مضمحل اور نابود کردینے کے کوئی خاصیت نہیں رکھتیں۔ ایسا معاشرہ جس کے افراد حقائق کو درک کرنے کی قوت کھو چکے ہوں وہ برائیوں کو اچھائی' انحطاط کو ترقی اور بے لگامی کو آزادی سمجھنے لگتا ہے۔

مذہبی تعلیمات میں اس مفہوم کی تاکید ہوئی ہے کہ اگر کوئی یہ دیکھے کہ کوئی نازیبا حرکت انجام دی جارہی ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی تمام استعداد

وقوت کے ساتھ اس کے تدارک کی کوشش کرے۔

توانائی کے مختلف درجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بُرائیوں کے خلاف جہاد کے بھی گوناگوں مراحل بیان ہوئے ہیں۔ ان کی رو سے انسان ہر حال میں ذمہ دار ہے کہ بُرائیوں کے خاتمے کے لئے اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لائے۔ طاقتوروں پر واجب ہے کہ اپنی اس قوت کو جو خداوندعالم نے انہیں عطا کی ہے' جرائم کو ختم کرنے اور کجروں کی تادیب کے لئے کام میں لائیں اور اگر کوئی اصلاحِ معاشرہ کے لئے ضروری قوت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے کام لے اور دل پذیر گفتگو کے ذریعہ ناپسندیدہ اعمال کے معائب اور زندگی میں پیش آنے والے ان کے نامطلوب اثرات لوگوں کے سامنے واضح کرے۔

ظاہر ہے کہ نیکی کی تلقین کرنے والے کو خود بھی نیکی پر عامل اور اخلاقی فضائل کا حامل ہونا چاہئے تاکہ دوسرے اس کی باتوں کو دل وجان سے قبول کریں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی نصیحت آمیز گفتگو لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں نہ اتر سکے گی اور اس کی تمام تبلیغ بے روح اور بے اثر رہے گی۔ چنانچہ ایسا شخص بُرائیوں کے خلاف جہاد سے محروم اور قلبی طور پر ان سے تنفر سے عاجز رہے گا۔

البتہ اگر بُرائیوں کے خلاف جہاد کی راہیں مسدود بھی نظر آئیں تب بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہیں جانا چاہئے۔ بلکہ کم از کم اپنے رویے سے گناہ گار کو یہ احساس دلانا چاہئے کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے اور اس سے الفت ومحبت کے تعلقات کو توڑ لینا چاہئے۔ اس طرح گناہ گار محسوس کرے گا کہ وہ معاشرہ سے کٹ رہا ہے اور اس کے لئے گناہ کا مرتکب رہتے ہوئے معاشرہ سے تعاون

اور ہمدردی کا حصول ممکن نہیں۔

اسلام میں بُرائیوں اور مفاسد کے خلاف جہاد کو بہت اہمیت دی گئی ہے' اس جانب مسلسل متوجہ کیا گیا ہے اور بشریت کو نیکیوں کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنِ کریم نے کامیابی کی حدود کو بڑے واضح الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور کامیابی کو ایسے لوگوں کا مقدر قرار دیا ہے جو لوگوں کو نیکی کی جانب بلاتے اور بُرائیوں سے پرہیز کی دعوت دیتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

"ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولٓئك هم المفلحون"

"اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے' نیکیوں کا حکم دے' بُرائیوں سے منع کرے اور یہی لوگ نجات یافتہ ہیں۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۰۴)

لہٰذا وہی لوگ سعادت کے دائرہ میں قرار پائیں گے جن کی رَوِش اس بنیاد پر استوار ہو یعنی نیکیوں کا حکم دینا اور بُرائیوں سے روکنا ان کی زندگی کا ناقابل تفکیک لائحہ عمل ہو۔ پھر خداوندِ عالم اسی سورے کی ایک دوسری آیت میں اس قوم کے لئے شرف و فضیلت کے عالی ترین درجات کے قائل ہونے کا اظہار کرتا ہے جو زندگی کے مختلف مراحل میں ہمیشہ اس اصول پر تکیہ کرتی ہے۔

"كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون

بالله....."

"تم بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کے لئے منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو....." (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۱۰)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"كن آمرا بالمعروف وعاملا به ولا تكن ممن يا مربه وينهى عنه فتبوء باثمه وتتعرض لمقت ربه۔"

"نیکیوں کا حکم دو اور ان پر عمل بھی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نیکیوں کا حکم دینے اور بُرائیوں سے روکنے کے باوجود خود گناہوں کے مرتکب ہو کر اپنے پروردگار کے غضب کا نشانہ بن جاؤ۔"

(غرر الحکم۔ ص ۵۶۹)

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"لا يزال الناس (امتى) بخير ما امروا بالمعروف ونهوا عن المنكر وتعاونوا على البر"

"میری اُمّت کے لوگ اس وقت تک خیر و آسائش کے ساتھ رہیں گے جب تک وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل پیرا رہیں گے اور نیکیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔"

"فاذا لم يفعلوا ذالک نزعت منهم البركات وسلط بعضهم على بعض ولم يكن لهم ناصر فى الارض

ولا فی السماء۔"

"اگر لوگ ایسا نہیں کریں گے تو ان سے برکتیں واپس لے لی جائیں گی ان کے بعض افراد بعض پر مسلط ہو جائیں گے اور نہ زمین پر ان کا کوئی مددگار ہو گا اور نہ آسمان میں۔"

آج کی ترقی یافتہ دنیا کے بعض ممالک نے اپنے معاشروں میں عدل و انصاف کی ترویج اور سماجی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مِلتے جُلتے قوانین وضع و نافذ کئے ہیں۔ ایک آگاہ اور معروف شخصیت کے بقول

"—— لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مثلاً سوئزرلینڈ کے شہریوں کی طرح ہر شخص عدل وانصاف کا محافظ ہونا چاہیے۔ اور جس طرح ان کے آئین میں مقدس آسمانی فرمان کی مانند تحریر ہے کہ "اگر کسی فرد کو معمولی سی بے انصافی بھی نظر آئے تو اس کا فرض ہے کہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اس کا ازالہ نہ کر دے۔" (روزنامہ اطلاعات آذر ماہ ۴۲ھ ش)

اس قانون کی یہ شق عین وہی فریضہ ہے جسے اب سے ۱۴۰۰ سال قبل اسلام نے اپنے ماننے والوں پر عائد کیا تھا۔

آٹھواں باب

صبر و شکیبائی کامیابی کا پُل ہے

کامیابی کی مختصر ترین راہ

کائنات کا ہر موجود اپنی پیدائش سے لے کر اوجِ کمال حاصل کرنے تک مصائب و مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور یہ ایک ایسا فطری قانون ہے جو ہر خشک و تر پر حاکم ہے۔

ہر انسان اس بات کا خواہشمند ہوتا ہے کہ کامیابی کے لئے مختصر ترین راہ کا انتخاب کرے اور جلد از جلد اپنے عمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو۔ لیکن صبر و شکیبائی کے بغیر راستے کو گھٹایا نہیں جاسکتا اور منظورِ نظر ہدف تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس اخلاقی صفت سے متصف ہوئے بغیر انسان کے لئے کسی بھی قسم کی ترقی و پیش رفت کا امکان نہیں۔

کوئی بھی شخص خواہ وہ ایک عام سا آدمی ہو یا غیر معمولی قوتِ ارادی اور عقل و ہوش رکھنے والا فرد، اگر اپنے لئے کامیابی کی راہیں کھولنے کا متمنّی ہے اور اپنے وجود سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ صبر و تحمل کو کام میں لائے، حقیقت بینی اور تدبیر کی صلاحیتوں سے آراستہ ہو اور زندگی کے وسیع اور روشن افق پر نگاہیں جمائے۔

عظیم اور بڑے کام ہرگز آناً فاناً انجام نہیں پاسکتے۔ بڑے بڑے منصوبوں کو

جامہ، عمل پہنانے کے لئے بہت زیادہ توانائی اور وقت درکار ہوتا ہے۔ وقتی سرگرمیاں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں لیکن دیرپا اور پائیدار کامیابیوں کا سبب نہیں بن سکتیں۔

جی ہاں! عزم و ہمت اور صبر و شکیبائی ہی کے ذریعہ کامیابی کی راہ کی رکاوٹوں کو دور کیا جاسکتا ہے اور اسی کے ذریعہ سختیوں اور دشواریوں کو عبور کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ کامیابی ہمیشہ مشکلات اور زحمتوں کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افراد زندگی کی دوڑ میں قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور بعض پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کامیاب اور ناکام افراد کے درمیان بنیادی فرق نامساعد حالات میں ان کا طرزِ عمل ہے کہ آیا وہ اس حال میں فعال اور ثابت قدم رہتے ہیں یا نہیں۔

اکثر لوگوں کی راہ میں اگر کوئی مشکل آن پڑے تو وہ بجائے اس کی چارہ جوئی کے، قابلِ قدر صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود حرکت و عمل ہی سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو کبھی اِس شاخ پر اور کبھی اُس شاخ پر اڑتے پھرتے ہیں اور کسی کام کو سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ انجام نہیں دیتے، ہمیشہ تزلزل اور عدم اعتماد کا شکار رہتے ہیں۔ غفلت، سستی اور تقصیر ان کی ثانوی عادت بن جاتی ہے۔ ایسے لوگ کسی صورت کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

زندگی ایک ایسی جہدِ مسلسل کا نام ہے جو اوّلین دورِ حیات سے لے کر عمر کے آخری لحظات تک جاری رہتی ہے اور اس جہاد میں کامیابی کا موثر ترین

ہتھیار صبر و شکیبائی ہے۔ اس میدان میں کامیابی انہی شجاع لوگوں کے قدم چومتی ہے جو کسی قسم کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ٹھوکریں کھا کھا کر اٹھتے ہیں اور سعیٔ پیہم جاری رکھتے ہیں اور تدبیر کے ناخنوں سے مشکلات کی گتھیاں سلجھاتے چلے جاتے ہیں۔

اگر ہمارے باطنی قویٰ متوسط اور حتیٰ ضعیف ہوں اور فہم و ادراک بھی عام سا ہو تب بھی صبر و شکیبائی کے ذریعہ خود کو کامل اور قوی بنا سکتے ہیں۔ درمیانِ راہ سے ایک مشکل کو کم کرنا ہمیں عمدہ طریقے سے اگلی مشکل رفع کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔

چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انسان میں فعالیت ایجاد کرتا ہے' اس کی بڑے کاموں کی جانب رہنمائی کرتا ہے اور اسے مشکلات سے مقابلہ اور مقاصد کی راہ میں پیش رفت پر آمادہ کرتا ہے۔

"ڈاکٹر مارڈن" انسان کی باطنی قوتوں کی پرورش میں مشکلات کے کردار کی یوں تشریح کرتا ہے کہ۔

"جس طرح اوزار اور کَل پُرزے آگ پر تپ کر مضبوطی حاصل کرتے ہیں اسی طرح بہترین اخلاق مشکلات کی تنگنائے میں پرورش پاتے ہیں۔ الماس جس قدر مضبوط اور چمکدار ہوتا ہے' اسے تراشنے کے لئے اسی قدر کاوش و کوشش درکار ہوتی ہے۔"

جرمن فلسفی "کانٹ" کہتا ہے کہ۔

"ایک کبوتر دورانِ پرواز جب ہوا کو اپنی پرواز میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے تو خود سے کہتا ہے کہ اگر یہ ہوا نہ ہوتی تو میں نہایت آسانی

اور بہت تیزی کے ساتھ پرواز کر سکتا تھا۔ درحالانکہ اگر ہوا نہ ہوتی تو کبوتر خلا میں پرواز سے عاجز رہتا اور زمین پر آپڑتا۔ پس وہی عنصر جو پرواز کے دوران کبوتر پر دباؤ ڈالتا ہے خود اس کی پرواز کے لئے بنیادی عامل ہے۔"

وہ کوشش جو صعود و بلندی کے حصول کے لئے عمل میں آتی ہے خود بہت اہم ہے۔ خواہ ہم خود کو مطلوب ہدف تک نہ پہنچا سکیں اس کے باوجود ان کوششوں کے ذریعہ ہم اپنی قوت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ ایسے کاہل افراد جو اپنی قوتوں کو کسی کام میں نہیں لاتے اور بے مقصد زندگی بسر کرتے ہیں وہ بسا اوقات عظیم مشکلات کے اثر سے ایسے فضائل اور قابلیتوں کے مالک بن جاتے ہیں جن کا اس سے قبل ان میں نام و نشان بھی نہیں ہوتا اور یوں ایک کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔

بہت سے جوانوں میں باپ کی موت کی وجہ سے' یا کچھ پاس نہ ہونے یا کسی اور مشکل کا سامنا کرنے کی بناء پر غیر معمولی قوت اور حیرت انگیز صلاحیتیں جنم لیتی ہیں۔ قید و اسیری بہت سے لوگوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو آشکارا کرتی ہے۔ جب خدا چاہتا ہے کہ کسی شخص کی صلاحیتوں کو جِلا دے اور اسے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کرے تو اسے توفیق و آسائش کی دنیا سے احتیاج و ضرورت کی دنیا میں بھیج دیتا ہے۔

شاہ بلوط کی دو قلمیں جو ایک ہی درخت سے حاصل کی گئی ہوں اور

آپس میں تقریباً مشابہ ہوں دو مختلف جگہوں پر بو دیجئے۔ یعنی ایک کو کسی پہاڑ پر اور دوسری کو کسی گھنے جنگل میں بوئیے۔ پھر ایک عرصہ بعد ان کی جڑوں کو دیکھئے۔ وہ درخت جس کی نشوونما پہاڑ پر ہوئی اور جسے طوفانِ بادوباراں اور برفباری کا سامنا کرنا پڑا اس کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں گی اور وہ ایک تناور اور سایہ دار درخت میں تبدیل ہوچکا ہوگا لیکن شاہ بلوط کی وہ قلم جسے گھنے جنگل میں بویا گیا تھا کیونکہ اس کی پرورش دوسرے درختوں کے زیرِ سایہ ہوئی ہے لہٰذا وہ ایک کمزور اور لاغر درخت کی صورت ہوگا۔

اسی طرح آپ ایک ہی طرح کے دو بچوں میں سے ایک کی ایسے ماحول میں تربیت کیجئے جہاں اسے ابتداء ہی سے مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا ہو اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے سہولتیں بھی اس کی بغل ہی میں دبی ہوئی نہ ہوں۔ ایسا شخص جوں ہی لڑکھڑا کے گرے گا فوراً ایک عزمِ راسخ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوگا بالکل اس گیند کی مانند کہ جسے جتنی زور سے زمین پر پٹخا جاتا ہے اتنی ہی قوت کے ساتھ وہ بلندی کی جانب اُٹھتی ہے۔ وہ جس قدر بڑی مشکل کا سامنا کرے گا اسی قدر اس کا عزم راسخ تر ہوتا چلا جائے گا۔

لیکن دوسری طرف وہ بچّہ جس نے ناز و نعم میں پرورش پائی ہو' جسے کئی کئی گورنسوں نے پالا پوسا ہو' جس کی ہر خواہش پلک جھپکتے میں پوری ہوئی ہو' بے شمار روپیہ پیسہ جس کے اختیار میں ہو۔ وہ جلد ہی مشکلات سے ہار مان بیٹھتا ہے اور ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔

(اسرارِ کامیابی ص ۶۱-۵۹)

چھلکتا ہوا منبع قدرت

قدرت کی جانب سے ہر انسان میں مشکلات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ مشکلات سے مقابلہ کے لئے خود کو آمادہ کریں اور اپنی حیرت انگیز قوتوں کو کام میں لائیں۔ انسان کی باطنی قوتیں ایک نہ ختم ہونے والا بھرپور منبع ہیں۔ بلکہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ جتنا زیادہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا ان میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

مشکلات کے مقابلہ میں عاجزی اور ناامیدی کا اظہار صلاحیتوں کے فقدان کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ یہ مایوسی اور سستی کی زنجیریں ہیں جو بعض لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتی ہیں اور ان کے وجود میں پائی جانے والی مشکلات سے مقابلہ کی قدرت کو ختم کردیتی ہیں۔

ان لوگوں کو معمولی اور جزئی شکست بھی مبہوت و مفلوج کرکے رکھ دیتی ہے۔ ممکن ہے ایک ناگہانی اور دردناک حادثہ ان کی روح کو پاش پاش کردے اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھیں۔ اس نقص کی اصلاح دوسرے نقائص کی اصلاح کی نسبت بہت مشکل کام ہے۔

جو لوگ اپنی مسلسل جدوجہد پر بھروسہ کرتے ہیں ان لوگوں سے کہیں زیادہ ترقی و کمال کی منزل سے نزدیک ہیں جو اپنی ذاتی استعداد اور ذوق کے بھروسے پر ہوتے ہیں۔ انسان خواہ جس قدر بھی صاحبِ ادراک اور ہوش و ذوق کا مالک ہو جب تک ان کے ہمراہ مثبت عمل نہ ہو یہ صلاحیتیں بے ثمر رہیں گی۔

دنیا میں کہیں بھی مفکّرین اور بلند پایہ شخصیات رؤسا کے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ ان میں سے اکثر نے سخت حالات میں جنم لیا ہے اور مشکلات

کے درمیان ترقی کے درجات طے کئے ہیں۔ ایسے لوگ جو ممتاز شخصیات کے حامل ہیں، جن کی شہرت کا ڈنکا چہار دانگِ عالم میں بجتا ہے اور جنہوں نے اپنے سماج کو اوجِ افتخار پر پہنچایا ہے، ان میں سے اکثر سختیوں اور محرومیوں میں پلے بڑھے ہیں اور انہیں حالات کے دباؤ نے اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بقا کے لئے گوناگوں طاقت فرسا مصائب سے پنجہ آزمائی کریں۔ یہی عامل ان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں اضافہ کا سبب بنا اور وہ ترقی کے مدارج طے کرنے کے قابل ہوئے۔

کہتے ہیں کہ ایک چینی طالبِ علم، تعلیمی میدان میں اپنی ناکامی سے اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ یاس و ناامیدی کے عالم میں اس نے اپنی کتابیں جمع کرکے دور پھینک دیں۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ ایک غریب عورت پر پڑی جو بھاری ہتھوڑے سے لوہے کی ایک سلاخ کو پیٹ کر ایک بڑی میخ بنانے کی کوشش کررہی تھی۔ کمزور سی عورت کی سخت محنت اور جدوجہد اس لڑکے کے لئے درسِ عبرت ثابت ہوئی۔ اس کے اندر ایک انقلاب بپا ہوگیا، اس نے ایک مرتبہ پھر تعلیم شروع کرنے کا عزم کیا اور ہر قیمت پر اپنی تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا، صبر و شکیبائی کے ساتھ اس کی محنت کا ثمر یہ ملا کہ بہت جلد اس کا شمار ہم عصر دانشمندوں میں ہونے لگا اور وہ اپنے زمانہ کی ایک نمایاں علمی شخصیت بن گیا۔

زندگی گزارنے کے اصولوں سے آشنائی کی ضرورت

انسان کو تفکر و تعقل کے ذریعہ زندگی بسر کرنے کے اصولوں سے آشنا ہونا

چاہئے تاکہ ان کے ذریعہ خود کو مبارزاتِ حیات سے نبرد آزما ہونے کے لئے آمادہ کرسکے۔

زندگی کا پہیہ خام خیالیوں اور شاعرانہ تخیلات سے گردش میں نہیں آتا اور نہ ہی اس کے بارے میں بے بنیاد تصورات سے فیصلہ کرنا چاہئے۔ ہر دور میں مشکلات و مصائب کی ہیئت بدل جاتی ہے اور وہ ایک خاص روپ میں نمودار ہوتی ہیں۔ ایسی ایسی مشکلات پیش آتی ہیں جن کا ماضی میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ زندگی ان مشکلات کی گتھیوں کو سلجھانے کے سوا کچھ نہیں۔

ایسا شخص جسے پے درپے مشکلات کا سامنا ہو اور وہ موجودہ حالات میں خود کو ان مشکلات کے حل سے عاجز سمجھتا ہو تو ان پر قابو پانے کے سلسلہ میں اس کے سامنے صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ ان مشکلات سے نجات کے سلسلہ میں جدوجہد اور سنجیدگی میں اضافہ کرے۔ مستقل مزاجی سے کام لے اور فرصت کو غنیمت جانے۔ جب وہ ان خصائص کے ہمراہ مقصد کی جانب گامزن ہوگا تو بالآخر ایک روز اس کی بردباری نتیجہ خیز اور ثمر آور ثابت ہوگی اور وہ کمالِ مطلوب کو پالے گا۔

اکثر اوقات پریشانیوں کے مہیب سائے افقِ زندگی پر ابرِ تار کی مانند چھا جاتے ہیں لیکن جب انسان ان سے مقابلہ اور چھٹکارے کا ارادہ کرلیتا ہے تو انہی سیاہ بادلوں سے برقِ سعادت چمکنے لگتی ہے اور بارانِ رحمت اس انسان کی امید و آرزو کے گلشن کو سیراب کردیتی ہے۔

وہ درس جو شکست سے حاصل کرنا چاہئے

کامیابی انہی لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو اپنی شکست و ناکامی کے علل و اسباب

پر غور و فکر کر کے ان سے بہترین انداز میں استفادہ کرتے ہیں۔ ناکامی کے اسباب کا مطالعہ خود بخود اس کے ازالے کی راہ متعیّن کر دیتا ہے اور انسان کی نگاہوں کے سامنے امید افزا اور حرکت آفریں مناظر کھینچ کر کامیابی کی راہیں واضح کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذخیرہ شدہ قوتوں اور افکار سے کام لے کر یکایک ایک چھلانگ کے ذریعہ حالات کو اپنے حق میں کر سکتا ہے۔

بہترین صلاحیتیں اس وقت نمودار ہوتی ہیں جب آدمی کو اپنے مقاصد کی راہ میں دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہو۔ بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں کہ جب تک انہوں نے اپنا سب کچھ کھو نہ دیا خود کو پیدا نہ کر سکے۔ ہنر مند لوگ ہر کام کا آغاز بھرپور توانائی کے ساتھ کرتے ہیں اور ناکامیوں کے ملبے سے کامیابی کے عناصر حاصل کرتے ہیں اور جب تک کامیابی حاصل نہ ہو جائے میدانِ عمل سے باہر نہیں نکلتے۔

شکست و ناکامی پر شرمساری کا احساس محض ایک مبالغہ ہے۔ وہ حوادث جو انسان کی پیشرفت میں رکاوٹ بنتے ہیں ان کانٹوں کی مانند ہیں جو عام طور پر مردانِ عمل کی راہوں پر اُگتے ہیں۔ مکمل ناکامی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی کام میں عدم پیشرفت کو ایک دائمی مغلوبیت سمجھنے لگے اور خود کو اس عمل کے سلسلہ میں اٹھائی جانے والی سختیوں سے باز رکھے۔ نارسائی و ناتوانی کا احساس ممکن ہے انسان کو مکمل طور پر جامد بنا دے اور وہ اپنی پسماندگی اور شکست کے ازالہ کے لئے ہر قسم کی سعی و کاوش ترک کر دے۔

انسانی وجود میں ابتداء ہی سے دوسروں پر غلبہ اور فتح مندی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے کاموں کے سلسلہ میں معمول کے مطابق راہوں

سے پیشرفت جاری رکھتا ہے لیکن کاموں کے یوں آسانی سے انجام پانے سے اس کے اندر سعی و جہد کی حس سرد پڑنے لگتی ہے۔

ممکن ہے کسی شخص کے وجود میں ایسا گوہر پنہاں ہو جو زمانہ کی سخت ضربات ہی سے صیقل ہو اور اس کی چمک دمک آشکارا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر افراد رکاوٹوں اور شکست کا سامنا نہ کرنے کی بناء پر اپنی اندرونی خوبیوں اور پوشیدہ صلاحیتوں سے بے خبر رہ جاتے ہیں اور اپنے وجود میں پنہاں قوتوں کے ادراک سے عاجز رہتے ہیں۔

ڈیل کارنیگی لکھتا ہے۔

"تقریباً پچیس سال پہلے ایک روز ایک مدرسہ کے استاد نے اس بات پر اپنے ایک شاگرد کے زوردار تھپڑ رسید کیا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ استاد نے بچّے کے کان پکڑے اور پوری کلاس کے سامنے اس کی اس قدر بے عزتی کی کہ وہ روتا ہوا گھر کی سمت دوڑ پڑا۔ اس وقت اس بچّے کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن اسے اسی دن سے احساس ہو گیا کہ جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا گیا وہ عین ظلم و ناانصافی ہے اور اسی وقت سے اسے ظلم و ناانصافی سے شدید نفرت ہو گئی اور اپنی آخری عمر تک وہ اس کے خلاف سرگرم عمل رہا۔

اس بچّے کا نام "کلارنس ڈارو" تھا جو بعد میں ایک معروف وکیل بنا وہ حقیقتاً جرائم کے کیس لڑنے والا اپنے زمانہ کا سب سے بڑا وکیل تھا۔ لاتعداد مرتبہ اس کا نام امریکی اخبارات کے صفحۂ اول پر شائع ہوا اور

اب بھی امریکہ میں "آشتابولا" کے قدیم باشندے اس کے پہلے مقدمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے اس مقدمہ کے دوران آسمان سر پر اٹھالیا حالانکہ یہ قضیہ کسی بڑی چیز کی بابت نہ تھا بلکہ گھوڑے کی ایک لگام کے بارے میں تنازع تھا جس کی زیادہ سے زیادہ قیمت پانچ ڈالر تھی۔

جب اس سے سوال کیا گیا کہ آپ نے کیوں ایک اتنی بے قیمت چیز کے لئے اتنا ہنگامہ کھڑا کیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ اس کا سبب کچھ اور نہیں میرا بنیادی مقصد صرف حق و حقیقت کی پشت پناہی و حمایت تھا۔ وہ اس مقدمہ کے دوران اس قدر جوش و ولولے کا اظہار کر رہا تھا اور اس طرح لڑ رہا تھا کہ گویا اس کے سامنے بنگال کا ببر شیر کھڑا ہوا ہو جس سے بچنے کے لئے وہ یہ کوششیں کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے مؤکّل نے اسے حقِ وکالت کے پانچ ڈالر ادا کئے لیکن کیونکہ مقدمہ ختم نہ ہوا تھا اس لئے اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے مسلسل سات سال تک نہایت عرق ریزی کے ساتھ یہ مقدمہ لڑا اور بالآخر کامیاب ہوا۔ "ڈارو" کہتا تھا کہ میں نے کبھی روپیہ پیسہ کی خاطر یا کسی شخصیت سے مرعوب ہو کر کوئی مقدمہ نہیں لڑا۔"

(رمزِ موفقیت در زندگی۔ ص ۳۵)

تمام حیرت انگیز کارنامے اور گرانبہا آثار جن سے آج بشریّت فیضیاب ہو رہی ہے اور آج دیکھنے میں ایک عام سی چیز لگتے ہیں ابتداء میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ اگر ماضی میں کوئی اِن چیزوں کی جانب اشارہ بھی کرتا تو دیوانہ اور

احمق شمار ہوتا۔ حتیٰ علمی محافل میں بھی اس کا مزاح اڑایا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ چیزیں اپنی اہمیت و قدر و قیمت کے باوجود لوگوں کے نزدیک عام سی ہو چکی ہیں اور کوئی انہیں دیکھ کر حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کرتا۔

لیکن یہ تمام صنائع و ٹیکنالوجی مردانِ عمل کی برسوں کی محنت کا ثمر ہیں۔ حتیٰ البعض مواقع پر تو ان لوگوں نے کمالِ صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی تمام عمر ان پیچیدہ مسائل کے حل کے سلسلے میں کھپا دی اور اپنے عزمِ صمیم اور انتھک محنت کے نتیجہ میں انہیں عالمِ مجہول سے دنیائے حقیقت میں لے آئے۔

"ایمرسن" کہتا ہے۔

وہ لوگ فتح و کامرانی نے جن کے قدم چومے ہیں، تمام کے تمام ایک چیز پر متفق تھے اور وہ یہ کہ علّت و معلول کے درمیان لازماً ایک رابطہ پایا جاتا ہے۔ بالالفاظ دیگر وہ لوگ معتقد تھے کہ زندگی میں پیش آنے والے حوادث اتفاقاً اور نصیب و قسمت کی وجہ سے رونما نہیں ہوتے بلکہ ہر چیز ایک قانون کے تابع ہے۔ اس زنجیر کے پہلے اور آخری حلقہ کے درمیان کوئی حلقہ ٹوٹا ہوا اور کمزور نہیں ہوتا۔"

(رازِ خوش بختی۔ ص ۲۳)

حصولِ کمال کا ذریعہ

مشکلات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لئے سعی و کاوش کمال کی جانب ارتقاء کا ذریعہ اور آسائشات کے حصول کا مقدمہ ہے۔ گوناگوں مشکلات انسان کی ترقی و پیش رفت میں قطعی اور ناقابلِ انکار اثرات مرتب کرتی ہیں۔ یہاں

تک کہ اگر زندگی میں فریب و آزمائش نہ ہو تو تقویٰ و فضیلت کسی قدر و قیمت کے حامل نہ رہیں اور تہذیب و اصلاحِ نفس کا کوئی مقام نہ ہو۔

اسی طرح اگر دشواریوں اور رکاوٹوں کا وجود نہ ہوتا تو ہر کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوتی اور پھر حرکت و فعالیت کا کوئی محرک باقی نہ رہتا اور ہرگز اس بات کی ضرورت نہ ہوتی کہ انسان مسلسل کوشش اور پیہم جدوجہد میں مصروف رہے اور نامساعد حالات سے نبرد آزما ہو۔

لہٰذا نہ صرف سختیوں کا دباؤ اور ناکامی زیاں بخش نہیں بلکہ اس کے ذریعہ چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہو کر بروئے کار آتی ہیں اور بسا اوقات قوّت و قدرت کا عظیم سرچشمہ ثابت ہوتی ہیں۔

انسان کو چاہئے کہ زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے تاکہ حوادثِ زمانہ اسے آشفتہ و پریشان نہ کر سکیں اور وہ دریا میں ایک تنکے کی مانند اِدھر اُدھر ڈولتا نہ پھرے بلکہ اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے والے گوناگوں عوامل کے مقابلے کے لئے خود کو آمادہ کرے تاکہ ایک ماہر تیراک کی مانند حوادث کے بے کنار دریا میں جہاں چاہے تیر سکے۔ اگر رکاوٹی زنجیریں اسے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دیں اور صورتِ حال پیچیدہ ہوجائے تب بھی صبر و شکیبائی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اور عاقل وہ ہے جو نامساعد حالات میں تحمّل و بردباری کی راہ اختیار کرے۔

بہت سے لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو توہّمات میں مگن رہتے ہیں اور صرف تصوّراتی دنیا میں بڑی بڑی آرزوئیں لئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ان کے یہ خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن پاتے۔ بے شک مرحلۂ خیال سے مرحلۂ عمل تک کے درمیان ایک دنیا کا فاصلہ موجود ہے۔ ضروری ہے کہ انسان واقع بینی

کے ساتھ عمل کے میدان میں قدم رکھے اور ہدفِ مقصود تک رسائی کے لئے کوشش و شکیبائی کام میں لائے اور صلاحیتوں میں اضافہ اور ذوق و شوق میں زیادتی کے لئے کسی قسم کی کوشش سے دریغ نہ برتے۔

ایک بزرگ کے بقول۔

"جب کبھی بھی آپ ہواؤں میں محل کی تعمیر کی بات کرتے ہیں اپنی عمر کو ضائع و برباد کررہے ہوتے ہیں۔ البتہ ان تصوّرات سے زیادہ پُرفریب اور خوش کن تر چیز اور کوئی نہیں کہ انسان عالمِ وہم و گمان میں آسمانوں کی بلندیوں پر رفیع الشان محلات تعمیر کرے لیکن اگر ان خیالات کو عالمِ خیال سے دنیائے خارج میں منتقل کرنا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ اس عظیم الشان محل کی بنیاد آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر رکھی جائے۔" (راز خوش بختی۔ص۷)

اکثر لوگ اپنے بارے میں حقائق پر مبنی فیصلہ نہیں کرتے۔ جب کبھی انہیں شکست و ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو اس شکست کی ایسی توجیہات میں مشغول ہوجاتے ہیں گویا اس میں ان کی کوئی خطا نہیں ہے۔ بجائے یہ کہ اس موقع پر خود کو ملامت کریں دوسروں کو سرزنش کرتے ہیں اور انہیں اپنی شکست کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

شاید ہی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ لڑکھڑاتے قدموں اور متزلزل ارادوں کا مالک شخص ترقی و کمال کے حصول میں کامیاب ہوا ہو۔ ایسی اتفاقی کامیابیاں اپنے ساتھ نقصان یا شکست کا امکان بھی رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ جو دوسروں کی کامیابی کو بغض و کینہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ منزل

کے حصول کے لئے ان لوگوں نے کس قدر مشقتیں برداشت کی ہیں اور کتنے خطرناک مراحل کو عبور کیا ہے۔

یورپ کی ایک معروف فوجی شخصیت نے ایک روز اپنے ایک دوست سے جو اس سے حسد کرتا تھا یوں کہا۔

"تم میرے جاہ و مقام' عہدہ و وقار سے حسد کرتے ہو حالانکہ تم باآسانی یہ مقام و مرتبہ حاصل کرسکتے ہو۔ آؤ ہم دونوں میدان میں چلتے ہیں۔ میں تیس قدم کے فاصلے سے بیس گولیاں تم پر چلاؤں گا۔ اگر یہ تمام گولیاں خطا گئیں اور تم بچ گئے تو میں اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کردوں گا۔ لیکن مجھے معلوم ہے تم کبھی اس تجویز کو قبول نہ کروگے ـــــــ بہت اچھے۔ بس اس نکتہ کو اپنے ذہن نشین کرلو کہ میں نے یہ مقام و منزل یوں ہی حاصل نہیں کرلی بلکہ ہزارہا مرتبہ گولیوں کا ہدف بنا ہوں اور ہر مرتبہ موت کو قریب سے دیکھا ہے۔" (اخلاق ساموئیل-ج ٢-ص ١٨٥)

بعض لوگ شکست ہی سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور اسی سے سیکھتے ہیں کہ کامیابی کے لئے کس راہ کا انتخاب کیا جائے اور کس سے اجتناب برتا جائے۔ جب انہیں کسی زیاں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ مایوس ہو کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتے بلکہ جان لیتے ہیں کہ اس نقصان کے ازالے اور ہدفِ مطلوب تک رسائی کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دوسرے راستوں سے ناکامی کی تلافی کرنی چاہئے۔ آئندہ شکست اور ناکامی سے بچنے کا سہل طریقہ گزشتہ شکست سے عبرت و سبق حاصل

کرنا ہے۔ اسی طرح دوسروں کی شکست یا کامیابی کا جائزہ لے کر بھی سبق حاصل کیا جاسکتا ہے اور یوں تجربوں کے حصول اور کامیاب لوگوں کی زندگی کے مطالعہ کے ذریعہ بہت سی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے۔

اگر آپ تاریخ میں لڑی جانے والی جنگوں کا مطالعہ کریں تو محسوس کریں گے کہ ان جنگوں میں اسلحہ و گولہ بارود کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی۔ بلکہ فتح و نصرت نے انہی لوگوں کے قدم چومے جو ثباتِ قدم کے ساتھ دشمن کے مقابل سیسہ پلائی دیوار کی مانند ڈٹ گئے۔ اور بسا اوقات تو غالب و مغلوب کے درمیان چند لمحہ سے زیادہ ثابت قدمی کا فرق بھی نہیں ہوتا۔

ایک فرانسیسی مصنف جنگ میں فرانس کی شکست کے اسباب کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ۔

"فرانس کا وزیر اعظم "ولاڈی" تقریر کے دوران نہایت جوش و خروش سے ڈائس پر مکّہ مار رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر حاضرین میں شامل ایک فہیم اور دُور اندیش شخص نے کہا کہ یہ نہایت مضبوطی کے ساتھ ہاتھ ڈائس پر مار رہا ہے لیکن افسوس کہ آہنی دستانے کی جگہ ریشم کا بنا ہوا زنانہ دستانہ پہنے ہوئے ہے۔"

نظم و ضبط کی ضرورت

کاموں کی انجام دہی کے سلسلہ میں ایک مفید' موثر اور ضروری چیز نظم و

ضبط ہے جو کامیابی کے حصول میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ باشعور اور ہوشمند افراد کام شروع کرنے سے پہلے ہی اس کے بارے میں سوچ بچار کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنہوں نے دراصل زندگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا ہوتا ہے نہایت اطمینان اور سرعت کے ساتھ کامیابی کی راہیں طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ بے نظمی اور بے تدبیری کا لازمی نتیجہ ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص سالہا سال تک کسی خاص شعبہ میں مصروفِ کار رہا ہو لیکن عدم بصیرت اور کام پر دسترس نہ ہونے کی بناء پر طویل عرصہ کے بعد بھی وہیں کا وہیں رہے جہاں آغازِ کار کے موقع پر تھا۔ اس کے برعکس کوئی دوسرا شخص اسی میدان میں نہایت کم وقت صرف کرے لیکن ہر روز اپنے مقصود سے قدم بقدم نزدیک ہوتا چلا جائے اور مسلسل اس کی کامیابیوں کی فہرست طویل ہوتی چلی جائے۔

اسی طرح اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ انسان اپنے پیشِ نظر راہ کو عجلت کے ساتھ سلامتی سے طے کرلے اور منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔ کبھی کبھی تو یہی جلد بازی انسان کو اصل راہ سے منحرف کردیتی ہے۔ حتیٰ فیصلوں اور منصوبہ بندی تک میں عجلت کے نقصانات سستی، ضعفِ ارادہ اور تسامح سے کم نہیں ہوتے۔

پس سوچ سمجھ کر کام کا آغاز کرنا اور مشکلات کے حل کے لئے غور و فکر سے کام لینا ہی ترقی و تکمیل کے حصول کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ نیز یہ اصول صرف افراد ہی سے مخصوص نہیں بلکہ اقوام پر بھی صادق آتا ہے۔

ہر سماج اپنی بقاء اور پیش رفت کے لئے ہر چیز سے زیادہ ایسے باہمت اور بردبار افراد کا محتاج ہے جو مشکلات کے مقابل ثابت قدمی سے ڈٹے رہیں اور اپنی اس اخلاقی صلاحیت کو علم و دانش کے دوش بدوش پروان چڑھا کر اصلاحِ احوال کے لئے بروئے کار لائیں۔ کسی شخص میں علمی و سیاسی عبقریت کے ساتھ ساتھ اگر ثباتِ قدم اور صبر و شکیبائی نہ ہو تو قابلِ لحاظ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔

قرآنِ کریم پیغمبرِ اسلامؐ کو دعوت دیتا ہے کہ تمام مراحل میں کامیابی کے حصول کے لئے صبر و شکیبائی کا دامن تھامے رکھیں اور نامساعد عوامل کا مقابلہ کریں۔

فاستقم کما امرت ومن تاب معک

"لہٰذا آپ کو جس طرح حکم دیا گیا ہے اسی طرح استقامت سے کام لیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی جو اسلام لے آئے ہیں ہمیشہ ثابت قدم رہنا چاہئے۔" (سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۱۱۲)

واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم

"اور (اپنے مقدس ہدف کی جانب بڑھتے ہوئے) اس طرح استقامت سے کام لیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کریں۔" (سورۂ شوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۵)

خداوندِ عالم مسلسل ایسی آیات کے ذریعہ پیغمبرِ اسلامؐ کو تاکید فرماتا ہے کہ:

"ہاں زحمت کے ساتھ آسانی بھی ہے، بے شک تکلیف کے ساتھ سہولت بھی ہے، لہٰذا جب آپ فارغ ہوجائیں تو ایک مرتبہ پھر جد و جستجو میں مشغول ہوجائیں اور چشمِ امید خدا کی جانب لگائے

رکھیں۔" (سورۂ الشرح ۹۴۔آیت ۵ تا ۸)

ان آیات میں بارہا یہ یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ جوشِ عمل کی حدّت کسی صورت کم نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایک کامیابی کے حصول کے بعد خود کو دوسری مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس جہان میں آسائشِ مطلق کا کوئی وجود نہیں اور ایسی کسی بات کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے۔

"ویل ڈورانٹ" کہتا ہے۔

"قوتِ ارادی میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے جب زندگی میں روزانہ نت نئے حوادث رونما ہوں اور تازہ کامیابیاں حاصل ہوں۔ اگر قدرت کے حصول کے خواہشمند ہو تو ضروری ہے کہ پہلے ہدف کا انتخاب کرو' اپنی راہ کا تعین کرو اور پھر خواہ کچھ بھی ہو جائے اس راہ سے چمٹے رہو۔ لیکن یہ ضرور ملحوظ رہے کہ جس راہ کا ہم نے انتخاب کیا ہے وہ منزلِ مقصود تک لے جانے والی ہو۔

معمولی معمولی کامیابیاں بھی ہماری قوت و استعداد میں اضافہ کا موجب ہوتی ہیں اور ہمیں عظیم کامیابیوں کے حصول کا یقین دلاتی ہیں لیکن اگر کوئی غیر معمولی احتیاط سے کام لیتا ہو اور بڑے کاموں کے لئے قدم اٹھاتے ہوئے تذبذب و تردد میں مبتلا رہتا ہو تو ایسا شخص ہمیشہ پیچھے ہی رہتا ہے۔

انسان کو چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ معمولی کامیابیوں پر مثلاً صرف ایک روز جشن منانا چاہئے اور

اگلے روز کسی بڑے کام کے سلسلے میں مشغول ہو جانا چاہئے اور بڑے خطرے اور عظیم ذمہ داری کے سلسلہ میں سرگرم ہو جانا چاہئے۔ ممکن ہے شکست کھا جائیں اور نابود ہو جائیں لیکن ایسی موت سے ہمکنار ہونا اس قدر حقیر و ناچیز خطرہ ہے جو ہمارے عقیدہ اور رَوِش کو متزلزل کرنے میں معمولی سا اثر بھی نہیں ڈال سکتا۔ اگر تمہیں خطرات ہلاک نہ کر سکیں تو قوی بنا دیتے ہیں اور منزلِ مقصود سے نزدیک تر کر دیتے ہیں اور عظمت کی راہ کی جانب تمہاری رہنمائی کرتے ہیں۔" (لذّاتِ فلسفہ ص ۲۲۳-۲۲۲)

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے پیغمبرِ اسلامؐ کی پُر افتخار زندگی اور نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے سلسلہ میں آپؐ کے صبر و شکیبائی کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

صدرِ اسلام میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز بھی خطرناک دشمن کے مقابل ان کی ثابت قدمی اور محکم ایمان تھا۔

محض مسلمان ہونا ہی کامیابی کی ضمانت نہیں

قرآنِ کریم کی آیات میں اہلِ اسلام کو کامیابی و کامرانی کی نوید دی گئی ہے۔ لیکن یہ کامیابی یوں ہی با آسانی ہاتھ آنے والی نہیں بلکہ یہ نویدِ الٰہی صرف اسی صورت میں حقیقت کا روپ دھارے گی جب لوگ اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو پہچان کر ان پر عمل پیرا ہو جائیں۔ پاک و خالص عقیدہ کردار و عمل کے ملاپ کے بعد ہی ثمر بخش ثابت ہوگا۔ بنا بریں جن لوگوں کے عقیدہ اور

عمل کے درمیان دوئی و جدائی ہو وہ کسی صورت کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔ کوشش اور عمل ہی کے ذریعہ زیاں اور ناکامی کی دلدل سے نکلا جاسکتا ہے۔

یاایھاالذین آمنواان تنصرواالله ینصرکم ویثبت اقدامکم

"اے صاحبانِ ایمان اگر تم خدا (کے دین) کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔"

(سورہٴ محمدؐ ۴۷- آیت ۷)

جنگِ احد میں جب مسلمانوں کو حکمِ پیغمبرؐ سے روگردانی اور مالِ غنیمت کے لالچ میں ایک مورچہ خالی کردینے کی وجہ سے غیر متوقع شکست کا سامنا کرنا پڑا تو انکے حوصلے پست ہوگئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مسلمان ہونا ہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہے اور شکست ان کا مقدر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا وہ سوچنے لگے کہ آخر ہمیں کیوں شکست ہوئی اور دشمنوں کی طرف سے مال و اسباب کی غارت گری برداشت کرنا پڑی۔ یہاں تک کہ اِن افکار کی وجہ سے اِن میں ایک نفسیاتی تزلزل پیدا ہوگیا۔ اس موقع پر خداوندِ عالم نے ان کی ہدایت اور اس گومگو کے عالم سے نجات کے لئے فرمایا کہ۔

"لتبلون فی اموالکم و انفسکم و لتسمعن من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا و ان تصبروا و تتقوا فان ذٰلک من عزم الامور"

"یقیناً تم اپنے اموال اور نفوس کے ذریعہ آزمائے جاؤگے اور جن کو

تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور جو مشرک ہوگئے ہیں سب کی طرف سے بہت اذیت ناک باتیں سنو گے۔ اب اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو یہی امور میں استحکام کا سبب ہے۔"

(سورہٴ آلِ عمران ۳- آیت ۱۸۶)

اس آیہٴ شریف میں جانی و مالی نقصانات کو خداوندِ عالم کی طرف سے ایک آزمائش قرار دیا گیا ہے۔ اس دنیا میں مومن بھی دوسرے لوگوں کی مانند ناگوار حوادث کا شکار ہوتا ہے اور اس طرح سے خدا اپنے تمام بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ اس امتحان میں مومنین اس قدر بردباری و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کا خوف و تزلزل آسودگی و استقامت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

ایمان، وحشت اور ناامیدی کے خاتمے کا ذریعہ ہے، انسان کو ایثار و قربانی اور مشکلات برداشت کرنے کی عادت ڈالتا ہے اور قلب و ضمیر اور اس کے احساسات کو پاکیزہ کرتا ہے۔

"روسو" کہتا ہے کہ۔

"اگر ہم انسان کو ان تمام صدمات سے معاف رکھیں جو اس کی نوع کا لازمہ ہیں تو ایسا کرکے کیا ہم نے اس کی فطرت کے خلاف سلوک نہیں کیا؟ جی ہاں! بعض لوگ یہاں تک تاکید کرتے ہیں کہ بچّے کو بڑی بڑی کامیابیوں کی لذّتوں سے لطف اندوز کرنے کے لئے اسے چھوٹے چھوٹے مصائب سے آشنا کرنا ضروری ہے۔ انسان کی ذات اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر انسانی جسم زیادہ آسائشوں میں پروان چڑھے تو روح فاسد ہوجاتی ہے۔ جو درد و رنج سے آشنا نہ ہو وہ نہ

شفقت و محبت کی چاشنی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ترنّم کی شیرینی کو۔ ایسے لوگوں کا قلب کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ انسانوں کے درمیان زندگی بسر کرنے والے ہیولوں کی مانند قابلِ معاشرت نہیں ہیں۔

زندگی میں رونما ہونے والی ابتلائیں اسے بہت جلد سمجھا دیتی ہیں کہ اس میں جسمانی و روحانی وضع اور حقیقی قوتیں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ جب انسان اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہیں کرپاتا تو سمجھنے لگتا ہے کہ وہ کسی کام کا نہیں۔ یہ رکاوٹیں جن کا وہ عادی نہیں ہوتا اسے مایوسی کا شکار کردیتی ہیں۔ یہ توہین اس کی تحقیر کا موجب ہوجاتی ہے۔ وہ بہت جلد بے غیرت، ڈرپوک اور پست ہمت ہوجاتا ہے اور جس قدر اسے اپنے آپ کو عظیم سمجھنا چاہئے تھا وہ خود کو اسی قدر چھوٹا سمجھنے لگتا ہے۔" (امیل، ص ۱۰۳-۱۰۰)

صبر و شکیبائی کے یہ معنی نہیں کہ انسان مشکلات کے حل کے سلسلہ میں قضاو قدر پر تکیہ کرکے بیٹھ جائے اور مصائب کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ تکامل و بزرگی اور سقوط و بدبختی کے بارے میں قانونِ قضاء الٰہی کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لئے نہایت غور و فکر کی ضرورت ہے۔

کامیابی کے سلسلہ میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اس کا حصول کوشش، جدوجہد اور استقامت کا متقاضی ہے۔

"یاایھا الذین آمنوا اصبروا و صابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون"

"اے ایمان والو! صبر کرو۔ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، جہاد کے لئے تیاری کرو اور اللہ سے ڈرو شاید تم فلاح یافتہ اور کامیاب ہوجاؤ۔" (سورۂ آل عمران ۳۔آیت ۲۰۰)

اس آیت میں لوگوں کو تاکید کی گئی ہے کہ بیداد گردی، ظلم و ستم اور انحراف و گمراہی کے خلاف ڈٹ جائیں اور معاشرہ کی کشتی کو مشکلات کے منجدھار سے نکالنے کے لئے مشترکہ جدوجہد کریں، خطرناک دشمن پر ہوشیاری کے ساتھ نظر رکھیں اور بردباری و متانت کے ساتھ اجنبیوں کی رخنہ اندازیوں کی روک تھام کریں۔

سرکشوں کے خلاف مضبوط محاذ کا قیام، دشمنوں سے مقابلہ اور خود کو ہر قسم کی ذلّت و خواری سے محفوظ رکھنا مردانِ خدا کی ذمہ داری و فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح خداوندِ عالم کے حوالہ سے بھی ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا شعار قرار دیں تاکہ ان کے کام نتیجۂ مطلوب تک جا پہنچیں۔ کیونکہ یہ تقویٰ ہی ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان کسی صورت بھی اپنے وظائف سے غافل نہیں ہوسکتا اور احکامِ الٰہی کو بہترین طریقے پر انجام دیتا ہے۔ انسان خارجی دباؤ کے اثر سے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب جھکاؤ کا اظہار کرتا ہے لیکن تقویٰ اور خلوصِ نیت اس کے اندر ایک ہم آہنگی اور تعادل پیدا کردیتے ہیں۔

یورپ کی ایک علمی شخصیت کہتی ہے۔

"ناگوار حوادث اور آلام و مصائب اخلاقی فضائل اور تقویٰ کی درسگاہ کی مانند ہیں۔ مصائب روح کو عاقل و ہوشیار اور فیصلہ کی حس کی

تصحیح کرتے ہیں' انسان کو ہوس پرستی اور گناہوں میں آلودہ ہونے سے باز رکھتے ہیں۔ خداوندِ عالم جو نظامِ ہستی کو اپنی رحمت و حکمتِ کاملہ سے چلاتا ہے ان تمام سختیوں اور دشواریوں کو اس جہان پر نازل کرتا ہے اور خاص طور پر صالح اور دانشمند افراد کو ان میں مبتلا کرتا ہے۔ تاکہ اس طرح انہیں آسائش و راحتِ حقیقی تک پہنچنے کی راہ سکھائے' ان میں صبرو شکیبائی اور تحمل و برداشت کی عادت پختہ کرے تاکہ وہ جلالت و افتخار کے آستانے پر حاضری دے سکیں۔

کوئی اس شخص سے زیادہ بدبخت نہیں جو کبھی مشکلات و مصائب کا شکار نہ ہوا ہو' ایسے شخص کا حقیقی چہرہ پہچانا نہیں جاسکتا جو آزمائش کی کٹھالی میں ڈالا نہ گیا ہو۔ ایسے فضائل جو کسی شخص کی سرشت وطبیعت کا حصہ ہوں خداوندِ عالم کی نگاہ میں کسی قدر و قیمت کے حامل نہیں۔ ذاتِ باری محض ان مکارم و فضائل کی جزا و پاداش دیتی ہے جو کوشش و محنت سے حاصل کئے گئے ہوں اور عمل و اجراء میں آئے ہوں۔" (اخلاق ساموئیل' ج ۲۔ ص ۲۰۹)

انسانی پرورش کے لئے دو قوی عامل

متعدد داخلی اور خارجی عوامل موجودات میں پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور تکامل کی راہیں طے کرنے کے سلسلہ میں ان کے مددگار ہوتے ہیں۔ انسان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے موجودات میں رونما ہونے والی ترقی ایک محدود شکل میں ہوتی ہے اور انسان کی ترقی و تکامل

کے مراحل بے پایاں اور لامحدود ہیں۔ اسی وجہ سے راہِ کمال طے کرنے اور انسانیت کے اعلیٰ مقام تک رسائی کے لئے اس کی بکثرت ضروریات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لہٰذا ضروری ہے کہ متعدد عوامل انسان کی روحانی پرورش کا بوجھ اٹھائیں۔

انسان کی تربیت کے سلسلہ میں دو عوامل انتہائی اہم اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ پہنچنے والی آسمانی تعلیمات ہیں جو سورج کی روشنی کی مانند انسانی روح پر پڑ کر اسے مُنوّر کردیتی ہیں اور اس کے صفحۂ دل سے بتدریج ناپسندیدہ صفات اور بُرے اخلاق زائل کرکے اس کی روح کو نورانیت وصفا اور درخشندگی بخشتی ہیں۔

دوسرا عامل جو ہدفِ مطلوب تک رسائی اور کمال تک پہنچنے کے سلسلہ میں انسان کا مددگار ہوتا ہے وہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات' زحمات اور دشواریاں ہیں۔ اس سے قبل کہ انسان کی درخشاں آسمانی تعلیمات کے سائے میں اور زندگی کی مشکلات کے ذریعہ اصلاح و تہذیب ہو اور اس کی روح حیوانی خصائل سے پاک ہو متاعِ دنیا اس کی روح و ارادہ کو اس قدر اپنے زیرِ اثر کرلیتی ہے کہ وہ خدا کے علاوہ ہر چیز کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور اس کی روح اس قدر تاریکیوں کی اسیر ہوجاتی ہے اور ہوس کے پردے اس حد تک اس پر سایہ افگن ہوجاتے ہیں کہ وہ دشواریوں کے ثمر بخش نتائج کو جو اسے حقیقی استقلال تک پہنچانے اور انسانیت سے آراستہ کرنے میں حساس کردار رکھتے ہیں درک کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ لہٰذا مصائب کا دباؤ اس میں ایک طرح کی بے چینی اور تزلزل پیدا کردیتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے۔

"ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسه الشر جزوعا"

"بے شک انسان بڑا لالچی ہے جب تکلیف پہنچتی ہے تو فریادی بن جاتا ہے۔" (سورۂ معارج ۷۰-آیت ۱۹-۲۰)

"فاما الانسان اذا ما ابتلئه ربه فاکرمه و نعمه فیقول ربی اکرمن و اما اذا ما ابتلئه فقدر علیه رزقه فیقول ربی اھانن۔"

"لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب خدا نے اس کو اس طرح آزمایا کہ عزّت اور نعمت دے دی تو کہنے لگا کہ میرے رب نے مجھے باعزّت بنایا ہے اور جب آزمائش کے لئے روزی کو تنگ کردیا تو کہنے لگا کہ میرے پروردگار نے میری توہین کی ہے۔" (سورۂ فجر ۸۹ - آیت ۱۵-۱۶)

یہ کیفیات غیر مہذب انسانوں کی خصوصیات ہیں لیکن جب دل مذہبی محرکات کی نشوونما کے ذریعہ زندہ ہوجاتے ہیں اور نفس کی آزادگی جو آسمانی تربیت کا منتہائے مقصود ہے حاصل ہوجاتی ہے تو اس موقع پر وہ خود کو ہر قسم کی مادّی اور مصنوعی وابستگیوں سے بے نیاز سمجھنے لگتا ہے۔ یہ ایسی پاکیزہ حرّیت و آزادی ہے جو حیوانی بندھنوں سے آلودہ نہیں ہوتی۔ یہ ایسی تمام رکاوٹوں سے آزادی ہے جو بشریت کو رشد و کمال اور رفعت و سربلندی سے باز رکھتی ہیں۔

فریب دینے والی مادّی چمک دمک صالح اور تربیت یافتہ انسان کو متزلزل نہیں کرتی اور اس کے فہم و ادراک اور روح پر مسلط نہیں ہوتی۔ خداوندِ عالم مقامِ آزادگی تک پہنچانے والے زندگی کے مصائب و مشکلات کے فلسفہ کو بیان

کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"لکیلا تاسوا علیٰ مافاتکم ولا تفرحوا بما اتبکم

"یہ تقدیر اس لئے ہے کہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس کا افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر غرور نہ کرو۔"

(سورۂ حدید ۵۷ - آیت ۲۳)

پس جب انسان ہر قسم کی بندگی سے آزاد ہو کر محض خدا کی بندگی اختیار کرلیتا ہے اور اس کے سوا کسی کے سامنے سرسپردگی کا اظہار نہیں کرتا تو وہ اپنے اندر ایک غیر معمولی قوّت و طاقت محسوس کرتا ہے۔ جو لوگ اس مکتب میں پرورش پاتے ہیں وہ بلند نگاہ، بیدار دل اور بابصیرت ہوتے ہیں۔

ہاتھ سے نکلی ہوئی چیزوں کو فراموش کردینا اور حاصل ہونے والی نعمتوں پر مغرور نہ ہونا ایک دوسرا تربیتی اثر بھی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے فقدان کا اندوہ و تاسف اور اسی پر اپنی تمام فکر کو مرکوز کردینا انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جامد کرنے کا موجب ہوتا ہے اور دوسری طرف متاع دنیاوی کے حاصل ہوجانے پر شادمان و سرمست ہوجانا انسان کی ہمت اور ہدف کو محدود کردیتا ہے اور اس وجہ سے وہ عالی تر اور بہتر امور کی جانب توجہ مبذول نہیں کرپاتا نتیجہ کے طور پر وہ ترقی اور اعلیٰ اہداف کی جانب راہ پر قدم بڑھانے سے عاجز رہتا ہے۔

"روسو" کہتا ہے۔

"جب میں جانتا ہوں کہ مجھے ایک دن فنا کے گھاٹ اتر جانا ہے تو پھر

کیوں میں اس دنیا میں اپنی وابستگیاں ایجاد کروں؟ اس جہاں میں جہاں ہر چیز تغیّر کا شکار ہے ہر چیز سفر میں ہے اور میں خود بہت جلد نابود ہو جاؤں گا وابستگیاں کس کام کی؟...... اے امیل! اے میرے بیٹے اگر تو مجھ سے بچھڑ جائے تو اس دنیا میں میرے لئے کیا باقی بچے گا؟ بہر حال مجھے خود کو اس ناگوار حادثے کے لئے تیار رکھنا چاہئے کیونکہ کوئی مجھے مطمئن نہیں کر سکتا کہ میں تجھ سے قبل مرجاؤں گا۔

پس اگر تو چاہتا ہے کہ خوشبخت زندگی بسر کرے تو اپنے دل کو صرف لافانی زیبائیوں سے وابستہ کر۔ کوشش کر کہ تیری خواہشات محدود اور وظائف ہر چیز پر مقدم ہوں۔ فقط ان چیزوں کو طلب کر جو اخلاقی قانون سے مغایرت نہ رکھتی ہوں۔ اپنے اندر یہ عادت ڈال کہ اگر کوئی چیز تجھ سے چھن جائے تو تجھے ناگوار نہ ہو اور جب تک ضمیر اجازت نہ دے کسی چیز کو قبول نہ کر۔ اس صورت میں یقیناً تو خوش بخت ہو گا اور اس دنیا کی کسی چیز سے شدید دلبستگی پیدا نہ کر۔" (امیل ص ۵۴۷)

حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک جملہ میں درس دیتے ہیں کہ۔

"بالتعب الشدید تدرک الدرجات الرفیعة والراحة الدائمة۔"

"دشواریاں برداشت کرنے اور سخت مصائب اٹھانے کے ذریعہ ہی انسان ہمیشہ کی آسائشیں اور زندگی کے اعلیٰ درجات حاصل کر سکتا ہے۔" (غرر الحکم ص ۳۳۷)

امریکی فلسفی "ایمرسن" لکھتا ہے کہ۔

"انسانی زندگی میں کبھی کبھی ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اس کے معمولات کو درہم برہم کر دیتی ہیں لیکن وہی تبدیلیاں اس کی ترقی کا سبب بنتی ہیں۔ خطرے میں پڑے بغیر' مال و متاع اور وقتی طور پر دوستوں کو چھوڑے بغیر روحانی کمالات حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ مشکلات کے فوائد زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ سمجھ میں آتے ہیں۔ بیماری' اعضاء کے نقائص' دولت کا چھن جانا اور دوستوں کا بچھڑ جانا بظاہر ناقابلِ تلافی نقصان نظر آتے ہیں لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ازالہ کی صلاحیتیں جو انسان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ عزیزوں کی موت جو پہلے پہل مصیبت اور محرومیت کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتی کچھ عرصہ بعد اس کا روشن پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام وقائع ہماری زندگی میں انقلابات کو جنم دیتے ہیں۔" (فلسفہ اجتماعی' ص ۳۹۸-۳۹۷)

حضرت علی علیہ السلام عثمان بن حنیف کے نام اپنے ایک خط میں ایسے لوگوں کو جو مشکلات اور دشواریوں کے سائے میں پلے بڑھے ہوں پہاڑوں پر اگنے والے درختوں اور تن پرور اور راحت طلب لوگوں کو گلستاں میں پروان چڑھنے والے نرم و نازک پودوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

"الا و ان الشجرة البرية اصلب عودا والروائع الخضرة ارق جلوداً والنابتات الغذية اقوى و قودا وابطأ خمودا"

"جان لو کہ بیابانوں میں اگنے والے درخت جو سختی اور کم آبی میں پروان چڑھتے ہیں ان کی لکڑی سخت اور ان کی آگ خوب بھڑکنے اور جلانے والی ہوتی ہے اور بہت دیر میں بجھتی ہے۔ لیکن باغوں میں پروان چڑھنے والے درختوں کی چھال نازک اور لکڑی نرم ہوتی ہے اور جلد ٹوٹ جاتی ہے۔" (نہج البلاغہ، مکتوب نمبر۴۵)

آنحضرتؑ وصیت کرتے ہیں کہ۔

"علیک بادمان العمل فی النشاط والکسل"

"کسی حال میں بھی ہو خواہ ست ہو یا ہشاش بشاش کاموں کے سلسلہ میں ثابت قدمی اور مسلسل جدوجہد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔"

(غرر الحکم ص ۴۸۰)

"علیک بالجدوان لم یساعد الجسد"

"ہر کام میں سنجیدگی سے کوشاں رہو ہر چند بدن میں کافی قوت وطاقت نہ ہو۔" (غرر الحکم ص ۴۸۳)

"من قعدعن الفرصة اعجزه الفوت"

"اگر فرصت کے دوران انسان بیٹھا رہے اور سہل انگاری کا مظاہرہ کرے تو یہ وقت گزر جانے کے بعد وہ عاجز ہوجاتا ہے۔"

(غرر الحکم - ص ۶۵۳)

معروف امریکی محقق "ولیم جان ریلی" لکھتا ہے کہ۔

"ہم تاریخ کے قبرستان میں ہزارہا انسانی ڈھانچوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو عین دمِ کامیابی شک وشبہ اور ارادے کے فقدان کی بناء پر تھک کر

بیٹھ گئے اور اسی حال میں فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ ہمارے ذہن میں اٹھنے والے بیشتر تفکّرات اس قدر خود بخود رواں ہوتے ہیں کہ ہمیں بعض اوقات ان کا جائزہ لینے کا موقع بھی نہیں مل پاتا۔ اگر ہم یہ جائزہ لینے کے لئے کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں ایک لمحہ کے لئے اپنی فکر کی روانی کو قابو میں کریں تو دیکھیں گے کہ ہم ہر روز متعدد عزم کرتے ہیں اور سینکڑوں ارادے باندھتے ہیں لیکن اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ ہمارے اکثر ارادے ناقص اور بے توجہی کا شکار ہیں یعنی ہماری خواہش ہوتی ہے کہ کوئی کام انجام پائے، ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم نے اس کا اراد بھی کرلیا ہے حالانکہ درحقیقت ہم ایک قسم کی سہل انگاری کا شکار ہوتے ہیں اور یوں کام مؤخّر ہوجاتا ہے۔

البتہ جب کسی ارادہ کو مؤخّر کرتے ہیں تو درحقیقت ہم نے یہ ارادتاً کیا ہوتا ہے یعنی ارادہ کیا ہوتا ہے کہ یہ کام انجام نہیں دیں گے اور اس کے بارے میں خم ٹھونک کر میدان میں نہ آئیں گے اور ہماری یہی تاخیر ایک طرح کا ارادہ ہے۔

کاموں میں تعطل اور سستی برتنا بہت آسان ہے۔ خاص طور پر اگر آپ خود کو عملاً فریب دیں اور اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیں کہ میں مستقبل میں بہتر انداز میں پیش رفت و ترقی کرسکتا ہوں۔ یعنی اس وقت اپنے ذہن کو یہ دلاسہ دے کر مطمئن کردیں کہ آئندہ بہتر حالات رونما ہوں گے۔ اس صورت میں آپ صرف خود کو فریب

دے رہے ہوں گے اور اس خام خیالی کا شکار ہوں گے کہ مستقبل مشکلات سے مبرّا اور جدوجہد سے خالی اور موجودہ سختیاں عارضی اور جلد گزر جانے والی ہیں۔لیکن در حقیقت کاموں کے دوران اور اچھے اور اہم کاموں کی راہ میں مشکلات منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں کسی سحر آمیز طلسمی مستقبل کا کوئی وجود نہیں۔ تمہارا حال ہی نعمت ہے جو تمہارے اختیار میں ہے اور اس وقت ہاتھ آئی ہوئی فرصت گزشتہ کامیابیوں اور آئندہ کی امید سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہے۔"

(تفکرِ صحیح' ص ۱۰۵-۱۰۳)

ایک اعلیٰ امتیاز

ایمان ہی وہ واحد عامل ہے جو انسانی روح کو اس قدر قوی بنا سکتا ہے اور اس کی استعداد کے دائرہ کو اس حد تک وسعت دے سکتا ہے کہ وہ سخت ترین مصائب اور پیچیدہ ترین مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہے اور کسی صورت ضعف و زبونی کا اظہار نہ کرے۔ باایمان شخص جانتا ہے کہ سختیاں جس قدر بھی گراں ہوں' وہ شکست تسلیم نہ کرنے والی روح کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور آخر کار گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔

زحمات اور مشکلات پر تحمل و برداشت بعض نفسیاتی بیماریوں کے نقصانات انسان تک نہیں پہنچنے دیتا۔ یہ ایمان کی قوت ہے جو صبر و تحمل کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ اس خصوصیت کو مردانِ خدا کا امتیاز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مثل المؤمن مثل سبيكة الذهب ان نفخت عليها احمرت وان وزنت لم تنقص"

"مومن کی مثال سونے کی ڈلی کی سی ہے کہ اگر اس کا رنگ سرخ ہونے تک اسے آگ کی بھٹی میں پکایا جائے تب بھی اس کے وزن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔" (نہج الفصاحہ' ص ۵۶۴)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"المؤمن نفسه اصلب من الصلد"

"مومن کا نفس سخت پتھر سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔"

(بحار الانوار ج ۱۵- ص ۹۴)

"مان" کہتا ہے کہ۔

"جب ہدف تک پہنچنے کے سلسلہ میں ہماری کوششوں کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ حائل ہوجائے جس کو عبور کرنا مشکل یا غیر ممکن ہو' تو ہمارے اندر ناکامی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ہماری ناکامی کا باعث بننے والی رکاوٹیں ممکن ہے بیرونی ماحول کی پیداوار ہوں' دوسرے افراد ہوں اور ممکن ہے ہمارے اپنے نقائص ہوں۔ ناکامیوں کو برداشت کرنے کی طاقت مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے۔ ممکن ہے ایک معیّن حد تک ناکامی کا سامنا کرنے سے بعض لوگ نفسیاتی طور پر شکست و ریخت کا شکار ہوجائیں اور عین ممکن ہے کچھ دوسرے لوگ اسے آسانی سے سہ جائیں۔ وہ لوگ جن میں ناکامیاں برداشت کرنے کی طاقت کم ہو' ممکن ہے ناکامی کے موقع پر اپنی راہ

گم کر بیٹھیں اور ایسے کام کر بیٹھیں جو انہیں اپنے ہدف سے دور کردیں۔" (اصولِ روان شناسی' "مان" ص ۱۴۸)

ضعف و ناتوانی کی پردہ پوشی

کسی عمل سے گریز کے لئے خود اپنے آپ کو دھوکا دینا اور جو کام انسان اپنے ضعف و کمزوری کی بناء پر انجام دینے سے قاصر ہے اس کے بارے میں بہانے تراشنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جو شخص اپنے کاموں میں ثابت قدمی اور مسلسل جدوجہد کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے اسے یا تو ناتمام چھوڑ دیتا ہے یا زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہے' اپنے اس نقص کے سلسلہ میں مسلسل عذر و بہانے تراشتا ہے اور یوں خود کو فریب دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"قد یکذب الرجل علی نفسہ عند شدۃ البلاء بما لم یفعلہ"

"بسا اوقات انسان مشکلات و مصائب سے گھبرا کر جب عمل سے کترانا چاہتا ہے تو خود سے جھوٹ بولتا ہے اور اپنے نفس کو فریب دیتا ہے۔" (غرر الحکم ص ۵۳۷)

یہ بات اب علمی سطح پر بھی ثابت ہو چکی ہے جس کے لئے نفسیات دان "خود فریبی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

"جب کوئی شخص کسی کام کی انجام دہی سے عاجز رہتا ہے اور اپنا پیشہ

ترک کر کے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ "میرے خیال میں اس پیشہ کو اختیار کر کے میں لوگوں کی اور اپنے وطن کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔"

حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ یہ کام کرنے کی لیاقت و اہلیت نہیں رکھتا اس لئے اپنا پیشہ بدل لیتا ہے۔ انسان اپنے اعمال و افعال کے حق میں دلائل و براہین لاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے کاموں کو درست اور صحیح ثابت کرے۔

غیر واقعی استدلال ایک دفاعی عمل یا شکست کی علامت ہے۔ یا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان مشکلات کے مقابلہ کی راہ سے واقف نہیں۔ ایسے لوگ جو واضح طور پر نقائص میں مبتلا ہوتے ہیں اس قسم کے غیر واقعی استدلال کا سہارا لیتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ اپنے نقائص کی تشخیص کے بعد ان کے علاج کی کوشش کریں۔ جب ہم شکست کھاتے ہیں تو ہمارا غافل ضمیر یاس و پژمردگی پیدا کرتا ہے ہمیں غیر حقیقی استدلال پر اکساتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے یاس و ناامیدی کا اعتراف کریں اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے قوت کے حصول کی کوشش کریں اور اس شکست کو بھول جائیں جو ہمارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا نتیجہ تھی اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں اس شکست سے فائدہ اٹھائیں۔

مشکلات اور دشواریوں سے فرار غلط علاج ہے کیونکہ ایک قلیل مدّت تک تو یہ فریب کارگر ہے لیکن بہت جلد انسان درد و بیماری اور

ضعف و ناتوانی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جب انسان مشکلات کے مقابل ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے تو اسے خود سے سوال کرنا چاہئے کہ کیا میں خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دے رہا ہوں؟ کیا میں نے غیرواقعی استدلال کا سہارا لیا ہے؟ مجھے کس طرح حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا چاہئے؟

کسی موضوع پر محض گفتگو کرنا کافی نہیں بلکہ مشکل کے حل کے لئے قدم بڑھانا چاہئے اور اس پر وقت صرف کرنا چاہئے اور عذر تراشی و بہانہ بازی کے ذریعہ وقت نہیں گزارنا چاہئے۔

غیرواقعی استدلال ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح سے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو نادانستگی میں فریب دینا ہے۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقائق کا سامنا کرے صواب اور ناصواب کی تشخیص کرے اور مشکلات کے حل کے سلسلہ میں قدم بڑھائے۔"

(روان شناسی برای زیستن -ص ۱۹۳-۱۹۱-۱۸۹)

مشکل حالات اور بحرانی صورتِ حال میں یاس و ناامیدی کی ممانعت کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نصیحت کرتے ہیں کہ پیچیدہ ترین اور دشوار ترین مراحل میں بھی انسان کو مشکلات سے فرار اختیار نہیں کرنا چاہئے اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

"عندتناهی الشدائدیکون توقع الفرج"

"سختیاں اور پریشانیاں اپنی انتہا کو پہنچ جائیں تب بھی فراخی اور کامیابی کی امید رکھو۔" (غرر الحکم ص ۴۸۹)

"عندتضایق حلق البلاء یکون الرخاء"

"جوں ہی مشکلات کی زنجیر کا حلقہ تنگ ہوتا ہے آسائش آپہنچتی ہے۔" (غرر الحکم ص ۴۸۹)

مصائب کے مقابل صبر و شکیبائی پیغمبرانِ الٰہی کی ان تعلیمات میں شامل ہے جو وہ انسانیت کی تربیت کے لئے لے کر آئے ہیں۔

"کسی پیغمبر کو بتایا گیا کہ ایک بوڑھی عورت کا اکلوتا لڑکا جو نہایت لائق و فائق تھا وفات پا گیا ہے۔ عورت کا غم سے بُرا حال ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کرجائے گی۔ آپؑ سے گزارش ہے کہ اس کے یہاں تشریف لے چلئے اور پندو نصیحت اور نرم گفتاری کے ذریعہ اسکو دلاسہ دیجئے' اس کا غم ہلکا کیجئے۔ پیغمبرِ خداؑ اس عورت کے گھر تشریف لے گئے اسی دوران انہوں نے دیکھا کہ گھر کے ایک کونے میں کبوتر پلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بڑھیا سے دریافت کیا : کیا یہ کبوتر یہاں بچّے دیتے ہیں۔

عورت نے جواب دیا : ہاں۔

کیا وہ تمام بچّے اپنی عمر پوری کرتے ہیں؟ پیغمبرؑ نے سوال کیا۔

عورت نے کہا : ان میں سے بعض کو ہم ذبح کرکے ان کا گوشت استعمال کرلیتے ہیں۔

پیغمبرؑ نے پھر سوال کیا : کیا انہیں ان کی ماؤں کے سامنے ذبح کرتے ہو؟

جواب ملا : جی ہاں۔

کیا اس کے بعد ان بچّوں کے ماں باپ تم سے دور ہو جاتے ہیں؟

نہیں ہرگز نہیں۔ عورت نے جواب دیا۔

جب گفتگو یہاں تک پہنچی تو پیغمبر نے فرمایا۔ اے خاتون تم خداوندِ عالم کی بارگاہ میں اور اس کی مشیت کے سامنے ان کبوتروں سے زیادہ ضعف اور کم ہمتی کا اظہار نہ کرو۔ حالانکہ تم ان کی نگاہوں کے سامنے ان کے بچّوں کو ذبح کرتے ہو تب بھی وہ تم سے دوری اختیار نہیں کرتے اور تمہارا گھر نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ تمہارا یہ عمل خود تمہارے ہی لئے مفید ہوتا تھا اس کا ان کبوتروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ جب کہ تمہارے فرزند کی موت میں خود تمہاری اور تمہاے فرزند کی مصلحت ہے۔

یہ گفتگو سن کر عورت کی حالت میں یک بیک تغیّر رونما ہوا اُس کے اندر ایک عجیب انقلاب پھوٹ پڑا' بے اختیار سجدے میں گر پڑی' عذر خواہی کرنے لگی اور بارِ غم اس کے دل سے ہلکا ہو گیا۔

"ہے کوئی ایمان سے بڑی قوّت جو چند کلمات کے ذریعہ زخمی دلوں کو یوں آسودہ کردے۔"

پائیدار دوستی

ایک اور اخلاقی فضیلت جس کی پابندی ہر مسلمان پر ضروری ہے دوستی اور مودت میں ثابت قدمی و پائیداری ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ اپنے ماننے والوں کو آپس

میں پائیدار قلبی روابط اور باہمی دوستی کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ان اللہ یحب المداومۃ علی الاخاء القدیم فداوموا"

"خداوندِ بزرگ و برتر کو یہ بات پسند ہے کہ مسلمان اپنی دوستیوں میں ثابت قدم رہیں اور اپنی قدیم دوستیوں کو اسی طرح محفوظ رکھیں۔ پس ہمیشہ دوستی اور قلبی تعلق میں وفادار رہو۔"

(نہج الفصاحہ۔ ص ۱۵۲)

اسی بارے میں "ڈاکٹر آویبری" لکھتا ہے کہ۔

"بسا اوقات مدّتِ مدید تک ہم کسی کے ساتھ میل ملاپ رکھتے ہیں لیکن پھر بھی خاطر خواہ طور پر اسے پہچاننے سے عاجز رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "قدیم دوستوں کو کسی صورت گوانا نہیں چاہئے کیونکہ ان جیسے آسانی سے نہیں پاسکتے۔"

حقیقی دوست وہ ہے جو مشکل وقتوں میں محبت کے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دے اور جب مصائب کا سیلاب ہمارے سروں سے گزر رہا ہو تو اس کی آتشِ مودت ٹھنڈی نہ پڑے ۔ اگر تمہیں ایسے دوست میسّر ہوں تو ان کی قدر کرو۔ اس نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ دوست بنانا جتنا مشکل ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اس دوستی کی حفاظت ہے۔ ہم انصاف سے کام نہیں لیتے ورنہ اس بات کا اعتراف کریں کہ ہمارے اکثر دوست ہماری سستی کی وجہ سے ہم سے دور ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ یوں ہی آسانی کے ساتھ اپنے دوستوں سے

ہاتھ نہ دھوئیے کیونکہ سچّے دوست کیمیا کی طرح کمیاب اور سونے کی طرح گرانبہا ہیں۔ دوستی وہ ہے جو تادمِ مرگ پائیدار ہو اور مرنے کے بعد بھی اس میں کمی نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اپنے دوستوں کا وقت کے ساتھ اور حکمت کے تقاضوں کے تحت انتخاب کریں اور ان کو ان کی فضیلت و تقویٰ، عظمت و روحانیت کی وجہ سے دوست رکھیں تو کسی وقت بھی حوادثِ روزگار ہمارے اور ان کے درمیان دوری پیدا نہ کرسکیں۔"

(در آغوشِ خوشبختی۔ ص۶۷-۶۹)

نواں باب

حقیقی عزّت و شرافت

ایک روحانی ضرورت

انسان بنیادی طور پر جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ روحانی ضروریات بھی رکھتا ہے جن کا ہر حال میں پورا ہونا اس قدر واضح و آشکارا ہے کہ اس کے بارے میں کسی بحث و گفتگو کی گنجائش نہیں۔ اگر کسی وقت اچھی طرح اور مناسب موقع پر ان ضروریات کی تسکین نہ ہو پائے تو روح اعتدال کی راہ چھوڑ دیتی ہے اور اجتماعی و انفرادی زندگی میں مشکلات اور نقصانات وجود میں آتے ہیں اور ایسے ناقابلِ برداشت اختلال و ناگواریاں ظاہر ہوتی ہیں جن کی تلافی تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔

انسان کی مادی احتیاجات کے برخلاف اس کی روحانی ضروریات بہت وسیع ہیں۔ اسی بناء پر روحانی تقاضوں اور خواہشات کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ہرچند روحانی ضروریات کے بارے میں علمی تحقیقات کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن ان کا وجود کوئی نئی بات نہیں بلکہ انسانی حیات کے آغاز سے ہی یہ احتیاجات اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔

روحانی اعتبار سے افرادِ بشر مساوی سطح پر نہیں بلکہ ان کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے اور یہی چیز لوگوں کا طرزِ تفکر اور احساس و عمل ایک دوسرے سے

مختلف و متمائز بناتی ہے اور بے شک انسان کی سعادت یا بدبختی کے سلسلے میں اس کے اثرات ان اختلافات سے زیادہ موثر ہوتے ہیں جو انسانوں کے اپنے ساختہ و پرداختہ مقررات کا نتیجہ ہیں۔

انسان کی بنیادی روحانی ضرورت اور کمال دوستی کے لوازم میں سے ایک "عزّت طلبی" کی حس ہے جو اس کی بہت سی سرگرمیوں کا ہدف ہے۔ آدمی عزّت کا شیفتہ ہے اور اسی نسبت سے ذلّت و خواری سے متنفر و بیزار رہتا ہے۔ جب اس کی عزّت و آبرو کو خطرے کا سامنا ہو تو وہ اس سے نجات کے لئے اپنی تمام قوتوں اور استعداد کو بروئے کار لاتا ہے اور ہر ممکن طریقہ سے اپنی شکست کی راہیں مسدود کرتا ہے۔ انسان کے لئے ناکامی کا خوف اور اس رنج و ناگواری کا احساس جو بے عزّتی کے تصور سے ہوتا ہے اصل شکست اور عقب ماندگی سے زیادہ سنگین ہے اور یہ اکثر زندگی کو وحشت ناک بنانے کا سبب بنتا ہے۔

بے عزّتی کا یہی احساس ہے جو بعض افراد کی حساس روح میں سہمگین اور مہیب طوفان بپا کردیتا ہے یہاں تک کہ ان کی نظر میں دنیا ملامت خیز اور بے مفہوم ماتم کدے کا روپ دھار لیتی ہے اور بسا اوقات ان میں سے بہت سے لوگ اس وحشت اور اضطراب سے نجات کے لئے خودکشی کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔

شکست اور ناکامی کے بعد ایک شرمندہ اور مایوس وجود میں بدل جانے کی بجائے انسان کو چاہیے کہ وہ اس صورتِ حال سے مقابلہ کی صحیح اور مناسب راہ کے بارے میں غور و فکر کرے۔ عاقلانہ رَوش یہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ایک مناسب راہ پر بروئے کار لائے اور شائستہ طریقے سے اپنی لیاقت کا اظہار اور

شخصیت کا اعلان کرے تاکہ اسے کھویا ہوا روحانی اعتدال اور شخصیت کا توازن دوبارہ حاصل ہوجائے اور اس تلافی کے بعد اپنی بقیہ عمر کو عزّتِ نفس اور استقلال کے ساتھ بسر کرسکے۔

عزّت طلبی کی حس، جس کا بیج خود دستِ قدرت نے انسانی وجود میں بویا ہے بچپن ہی سے مختلف صورتوں میں پروان چڑھنا شروع ہوجاتی ہے اور دوسری روحانی خصوصیتوں کی نسبت بہت جلد ظاہر ہونے لگتی ہے۔ کم سن بچے کا حساس دل بھی عزّت افزائی کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ فطرتاً اکثر بچّے اپنے اطراف زندگی بسر کرنے والوں سے عزّت افزائی کی توقع رکھتے ہیں اور اس میں دوسروں کی حصّہ داری برداشت نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے گھر میں کسی نئے بچّے کا اضافہ ہوتا ہے اور ماں کی زیادہ توجہ اس نومولود کی طرف ہوجاتی ہے اور اسے بڑے بچّے پر پہلے جیسی توجہ کا موقع نہیں مل پاتا تو یہ بچّہ عجیب گستاخانہ اور تندخوئی پر مبنی رویہ اپنالیتا ہے۔ نومولود سے غصّہ و نفرت کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔

اگر بچے کو مسلسل حق تلفی اور اس بات کا احساس ہونے لگے کہ اسے نظر انداز کیا جارہا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کی اندر کینہ توزی، ضد اور حسد کے جذبات جڑ پکڑنے لگتے ہیں اور وہ بہت آسانی سے گمراہی اور فریب کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس میں نفسیاتی عوارض جنم لینے لگتے ہیں اور متعدد پیچیدہ مشکلات اسے گھیرلیتی ہیں۔

ہر قوم کی عظمت و انحطاط یا عزّت و پستی اس کے نفسیاتی حالات سے وابستہ ہے۔ اور آخرکار یہ کیفیات قوموں کے طرزِ تفکر اور اعمال پر اثر انداز

ہوتی ہیں۔ انفرادی خصوصیات، جیسے پاکیزہ احساسات اور نمایاں روحانی خصائل کا ایسے امتیازات سے جو زندگی میں کسب کئے جاسکتے ہیں مثلاً منصب و مقام وغیرہ کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شخص یا قوم کی عزّت و احترام کے سلسلہ میں بیرونی عوامل سے زیادہ اندرونی اسباب کا دخل ہوتا ہے۔ بدبختی و ذلّت اور سعادت و شرف اندرونی حیات کے تابع ہے حالانکہ کوتاہ فکر افراد کا خیال ہے کہ طبقاتی تفاوت اور ذات پات شرافت کے درجات کے تعین میں اصل عامل ہیں۔

مصنوعی امتیازات

معاشرہ میں بکثرت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو عزّت و شرف کے عوامل کی تشخیص کے سلسلے میں غلطی کا شکار ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی روحانی ضروریات صحیح راستے سے پوری نہیں ہوتیں اس لئے وہ اصل راستہ ترک کرکے انحرافی اور ضرر رساں راستے اختیار کرلیتے ہیں، اپنی تسکین کے جعلی طریقے دریافت کرتے ہیں اور بالکل اس ڈوبنے والے کی مانند جو اپنی نجات کے لئے ہر بے قیمت سہارے کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہے عزّت پانے کے لئے جعلی امتیازات کے حصول کی خاطر کسی قسم کی کوشش سے دریغ نہیں کرتے۔

مثلاً ممکن ہے ایسے لوگوں میں مال و دولت کے حصول کی نہ ختم ہونے والی خواہش جنم لے لے اور یہ خواہش اس قدر حاوی ہوجائے کہ ان کے اندر سے اختیار، عقل، انصاف اور مصلحت جیسی چیزوں کو ختم کردے۔ یہ غیر صحت مندانہ کیفیت انسان کو ایک بے چین اور مجبور و لاچار وجود کی صورت میں بدل

دیتی ہے جو خود اپنے لئے بھی رنج و غم کا سبب ہوتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی
ضرر رساں بن جاتا ہے اور اگر کسی معاشرہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ جائے
اور اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہوجائے تو یہ لوگ سماج کو اختلال اور دشواری
میں مبتلا کردیتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال و دولت اکثر ان دو صفات کا
سبب بنتی ہے کہ جن میں سے ہر صفت اپنے مقام پر شقاوت و بدبختی پر منتہی
ہوتی ہے۔ یا تو یہ کہ انسان کو جادۂ اعتدال اور راہِ مستقیم سے منحرف کرکے
ہوس بازی کی جانب لے جاتی ہے اور یا یہ کہ انسان دولت و ثروت کے عشق کا
اس قدر اسیر ہوجاتا ہے کہ بت کی مانند اس کی پرستش کرنے لگتا ہے اور ہر چیز کو
اس کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ رہتا ہے۔

البتہ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ انسان کو مال و دولت کے حصول اور ضروریاتِ
زندگی پوری کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی رغبت کا اظہار نہیں کرنا چاہئے بلکہ
مراد یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال و دولت کسی کی خوش بختی میں معمولی سا
اثر بھی نہیں رکھتے۔ یہ چیز کسی صورت کسی کی روحانی تسکین اور آسودگی کا
سبب نہیں بن سکتی ——— انسانوں میں پائے جانے والے اکثر روحانی
عوارض کا سبب مال و دولت کی جانب ضرورت سے زیادہ میلان اور محض اسی
جانب جھکاؤ ہے۔

ظاہر ہے کہ نامناسب ہدف کے ذریعہ اچھا نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔
روحانی اضطراب بے سوچے سمجھے نامناسب ہدف کے انتخاب کا منطقی نتیجہ ہے۔
لہٰذا ایسے بے حساب دولت مند بھی ملتے ہیں جو معنوی اقدار سے فاقد ہونے کی

بناء پر نہ صرف یہ کہ عزّت و شرافت کے احساس سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ
زندگی کی بپھری ہوئی موجوں کے سامنے خود کو تنہا، بے یارومددگار اور پریشان
پاتے ہیں اور بالآخر اسی بے چارگی اور تنہائی کے عالم میں موت کی آغوش میں
چلے جاتے ہیں۔

عزّت ایک ایسا شیریں احساس ہے جو روح کی گہرائیوں سے ابھر کر ہر سو
پھیل جاتا ہے۔ ایسا انسان جو عزّتِ نفس کا حامل ہو معاشرہ کا بھی محبوب ہوتا
ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں افتخار کے اعلیٰ درجات کے
حصول کی خواہش ہوتی ہے، سماج کے افق پر ستاروں کی مانند چمکنا چاہتے ہیں،
اپنے شکوہ و رونق سے دوسروں کو خیرہ کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ان کا دل
چاہتا ہے کہ نہ صرف ان کا نام لوگوں کے وردِ زبان ہو بلکہ لوگ ان کی تصویر
دلوں میں سجائے رکھیں۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کے لئے انسان کو اپنا وطیرہ
حقیقت بنی بنانا چاہئے اور زندگی کے ستون کو عزّت و شرافت کی حقیقی بنیادوں پر
اٹھانا چاہئے۔

ایک مغربی دانشور کہتا ہے کہ۔

"دولت محض درہم و دینار کا نام نہیں۔ اصل ثروت وہ معنوی صفات
ہیں جو چور بھی نہیں چرا سکتے۔ بکثرت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو
ان صفات کی بدولت صاحبِ ثروت لوگوں کی توجہ و احترام کا مرکز بن
جاتے ہیں۔ دولت محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے
لیکن شرافت و آبرو کا حصول کیونکر ممکن ہے----؟ یہ وہ چیز ہے
جو سونا، چاندی کے ذریعہ بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

مجھے نہیں معلوم لوگ حقیقت سے کیوں روگرداں ہیں۔ دولت کو اس قدر عزیز رکھتے ہیں کہ اس کے حصول کے لئے جان ہتھیلی پر لئے مشتاقانہ آگے بڑھتے ہیں اور کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنے جسم کی صحت اور روحانی اطمینان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ دولتمند بننے کے لئے اپنی زندگی کے اہم ترین حصّے کو رنج و ابتلا کی نذر کردیتے ہیں۔ درحالانکہ سونا انسانی زندگی کے ایک دقیقہ کی برابری نہیں کرسکتا۔

لوگ گمان کرتے ہیں کہ دولت انہیں سعادت تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ خوش بختی مال و دولت سے نہیں خریدی جاسکتی۔ (خام خیال) بے چارے جس قدر اس کے حصول کے لئے آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی خود سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار اس پُرپیچ و خم راہ میں خود کو گُم کربیٹھتے ہیں اپنی روح، احساسات اور فضائل کو پامال کردیتے ہیں۔

سعادت کے لئے نہ روپیہ پیسہ لازم ہے، نہ دولت و ثروت۔ جو چیز ضروری ہے لوگ اس سے غافل ہیں اور طالبانِ سعادت میں مجھے ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس چیز کی جستجو میں ہو۔"

(در جستجوی خوش بختی۔ص ۱۳۶)

جب اسکندر کو ایران پر لشکر کشی کے لئے سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا گیا تو معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ گروہ در گروہ اسے مبارک باد دینے آنے لگے۔ لیکن "دیوژن" جو معروف یونانی فلسفی تھا حاضر نہ

ہوا۔ اسکندر جو اس فلسفی سے ملنے کا شدید اشتیاق رکھتا تھا خود ہی اس سے ملاقات کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

"دیوژن" جو ایک آزاد منش اور بے نیاز انسان تھا اور اپنی عزّتِ نفس کا تحفظ اس کی نمایاں خصوصیت اور شعارِ زندگی تھا زمین پر لیٹا ہوا سورج کی کرنوں کی تپش سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ جوں ہی اسے احساس ہوا کہ کچھ لوگ اس کی سمت آرہے ہیں، اس نے تھوڑا سا اُٹھ کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اسکندر جاہ و حشم، شکوہ و جلال کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھنے کے بعد دیوژن پھر بے نیازی سے زمین پر لیٹ گیا۔ اسکندر نے قریب پہنچ کر نہایت ادب سے اسے سلام کیا اور بولا آپ مجھ سے جو چاہیں طلب کیجئے میں تعمیلِ حکم میں کوتاہی نہ کروں گا۔

"دیوژن" نے کہا میرا صرف ایک تقاضا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں سورج کی کرنوں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ آپ آکے ان کرنوں کی راہ میں حائل ہوگئے ہیں برائے مہربانی ذرا ایک طرف کو ہٹ جایئے۔

یہ سن کر اسکندر کے ساتھ آنے والے لوگ ناک بھوں چڑھانے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ کس قدر نادان شخص ہے جس نے اتنے اچھے موقع کو ضائع کردیا۔ لیکن اسکندر جو "دیوژن" کی اس اعلیٰ ظرفی اور عزّتِ نفس کے سامنے خود کو حقیر سمجھ رہا تھا، سوچ میں پڑگیا، مبہوت ہوگیا۔ بالآخر واپس آتے ہوئے اپنے ہمراہیوں کی باتیں سن کر جو وہ اس فلسفی کی تحقیر و ملامت کے سلسلہ میں کررہے تھے بولا۔ "سچ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی دیوژن بن جاؤں" (تاریخِ علم۔از جارج سارٹن، ص ۵۲۵)

ہر زمانے میں ایسے لوگ ملتے ہیں جو اپنے اکثر احساسات و اعمال پر حکم فرما
غیر سالم روح کے سبب دوسروں کے مقام و منزلت کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتے
اور چاہتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو ان بزرگوں سے برتر جلوہ دیں یا خود کو کم از کم
ان کے مساوی و برابر ظاہر کریں۔ لیکن کیونکہ سرمایۂ عظمت سے تہیدست
ہوتے ہیں اس لئے مختلف ذرائع سے کوشش کرتے ہیں کہ ان (بزرگوں) کی
عظمت کی درخشندگی کی راہ میں حائل ہوجائیں لیکن وہ کسی صورت کامیاب
نہیں ہوپاتے۔ مختلف حیلے بہانوں اور تخریبی عوامل کے ذریعہ ان شخصیات کی
قدر و قیمت اور منزلت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیونکہ یہ صاحبِ عظمت ہستیاں جنسِ بشر سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے
زمان و مکان کے فاصلے پیدا ہوجاتے ہیں اس کے باوجود یہ ناقابلِ فراموش ہوتی
ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے ان کی عظمت کے ستارہ کی چمک دمک میں
اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

نفسانی خواہشات کو حدِّ اعتدال میں رکھنے کی خاطر اور نامطلوب میلانات کو
قابو میں رکھنے کے واسطے عزّت طلبی کی حس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے
کوئی شخص درست اخلاق کا حامل نہ ہو اور باطنی طور پر انحراف کی جانب ایک
خاص رجحان رکھتا ہو لیکن کیونکہ اپنی عزّتِ نفس کے تحفظ کا آرزو مند ہوتا ہے
اس لئے ناپسندیدہ اعمال اور آلودگیوں سے اجتناب برتتا ہے اور یہ فطری سرمایہ
اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ خلافِ شرافت اور ناپسندیدہ اعمال میں ہاتھ آلودہ
نہیں کرتا۔

اسلام کی نگاہ میں عزّت کا مفہوم

حیوانیت کی سطح سے بلند ہوکر عظمت کی بلندیوں کو چھولینا ہر ایک کے لئے
ممکن ہے۔ کیونکہ کمالِ مطلوب تک رسائی کی آرزو ہر انسان میں رکھ دی گئی
ہے اور یہ سوچ انسانی روح میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود
تربیت کی ضرورت مسلّمہ ہے کیونکہ سقوط و گمراہی کی راہوں کو اپنانے کے لئے
کسی اہتمام کی ضرورت نہیں بلکہ پست خواہشات خود بخود انسان کو انحطاط کی
راہ پر لگادیتی ہیں۔

پست حیوانی خواہشات کی تنگنائی سے باہر نکل کر ہی انسان حقیقی کمال تک
پہنچ سکتا ہے اور وسیع تر افق اور عالی تر افکار سے آشنا ہوسکتا ہے۔ پس اگر وہ
چاہے تو لغزش کے موقع پر پست حیوان ہوجائے اور چاہے تو مخرّب محرّکات کے
غلبہ سے قبل ان سے نجات حاصل کرلے اور فرشتوں کی مانند جہانِ بالا کی
جانب پرواز کرجائے۔

اسلام خارجی و داخلی عوامل کے درمیان جو ہم آہنگی ایجاد کرتا ہے وہ
کامیابیوں تک رسائی کے لئے روح کے ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ تاریخ میں بکثرت
ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنی مسلسل جدوجہد کے بل بوتے پر انسانیت کے بلند و بالا
درجہ پر جاپہنچے۔

اسلام کی نظر میں ہر کسی کا مقام و منزلت اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ
کس قدر بلند انسانی اقدار سے بہرہ ور ہے۔ اس کے بغیر اس پر انسانیت کے
معنی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسلام تقویٰ اور پرہیزگاری کے سوا کسی دوسرے
ظاہری امتیاز کو عزّت و شرافت کے پیمانے کے بطور پیش نہیں کرتا۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"لا عز اعز من التقوی"

"تقویٰ سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں۔"

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"من اراد ان یکون اعز الناس فلیتق اللہ عزوجل"

"جو شخص لوگوں کے درمیان عزت و مقبولیت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنا شعار بنانا چاہیئے۔"

(بحار الانوار۔ ج ۱۷۔ ص ۴۸)

مومن کے باطن میں جوں ہی نورِ تقویٰ چمکتا ہے وہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اس آگاہی و وسیع النظری کے نتیجہ میں وہ عزت و کمال کو طاقت و قدرت اور نسب و نژاد میں تلاش نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی ذاتی شرافت کا ایمان و اعتقاد کے پیمانے اور اس طاقت سے جو قطعی طور پر اس دنیا میں موثر ہے اور ان فضائل سے جو اس نے اپنے اندر پیدا کئے ہوتے ہیں موازنہ کرتا ہے۔ اُسے تقویٰ سے تہیدست لوگوں کے مقابلے پر اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے اور وہ ذلت میں مبتلا کرنے والی ہر عاجزی و انکساری سے اجتناب برتتا ہے۔ اس لئے خضوع و خشوع اور عاجزی و فروتنی کا اظہار صرف خدا کی بارگاہ میں جائز ہے کیونکہ موجودات اور جہانِ ہستی اسی کے ارادہ سے خلق ہوئے ہیں، انسان اسی کے بندہ ہیں لہٰذا کائنات کے بے مثل خالق کے سامنے اظہارِ عاجزی خود ایک بڑی سربلندی کا سبب ہے۔

یہ برتری و استیلا جو متقی انسان کائنات کے اصلی مبداء سے ارتباط کے ذریعہ

حاصل کرتا ہے، تمام مراحلِ حیات میں اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ تقویٰ و پاکیزگی کی یہ قوت اس قدر ہمہ گیر اور متقی کی نمایاں نشانی بن جاتی ہے کہ دوسرے بھی یہ احساس کرنے لگتے ہیں کہ اس کی روح میں ایک محکم و استوار حقیقت مستقر ہے، یہ کوئی کھوکھلا وجود نہیں کہ معمولی سا جھٹکا بھی اسے اپنی جگہ سے ہٹا دے۔

متقی انسان کے باطن میں پوشیدہ یہ قوت اسے زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرتی ہے اور وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مادیات کے سمندر میں غرق نہیں ہوتا کیونکہ اس کی عقل و روح اسلامی اصولوں سے سیراب ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کے بارے میں خدائی نکتہ نظر کا حامل ہوتا ہے اور اس کے نزدیک کوئی جھوٹی قدر حقیقی اقدار کی برابری نہیں کر سکتی اور یہ ممکن ہی نہیں کہ پست خواہشات اس کی ناقابلِ شکست روح اور ادراکات پر غالب آ جائیں۔

وہ زرق و برق مادیات اور فریبی خواہشات کے مقابل شجاعت سے ڈٹا رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی چیز خواہ کتنی ہی قدر و قیمت پالے اور کسی بھی بلندی پر پہنچ جائے خدا کی عظمت و کبریائی اور گرانبہا احساسات کے مقابل پست و حقیر ہے اور اس کی بڑائی اک دن نابود ہونے والی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ۔

"ولا تمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ ازواجاً منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر وابقی"

"اور خبردار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو جو زندگانی دنیا کی رونق سے مالامال کردیا ہے اس کی طرف آپ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں کہ

یہ ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے۔" (سورہ طٰہٰ ۲۰-آیت ۱۳۱)

اسلام کی نظر میں ایک مسلمان کی اتنی قدر و اہمیت ہے کہ وہ خدا اور رسولِ خدا کی عزّت کے بعد اس کے شرف و فضیلت کا قائل ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

"وللہ العزۃ ولرسولہٖ وللمؤمنین"

"ساری عزّت اللہ، رسول اور صاحبانِ ایمان کے لئے ہے۔"

(سورۂ منافقون ۶۳ - آیت ۸)

ذلّت و پستی سے اجتناب

عزّتِ نفس اور اس کی سماجی و اخلاقی اہمیت کے بارے میں اولیاء اسلام سے بکثرت روایات منقول ہیں اور ان ہستیوں نے لوگوں کو خود عملی طور پر بھی یہ عظیم اخلاقی درس دیا ہے۔ سرورِ آزادگان حضرت امام حسین علیہ السلام سے سوال ہوا کہ۔

انسان کی عزّت کس بات میں ہے؟

آپؑ نے فرمایا کہ۔

"انسان کی عزّت اس میں ہے کہ لوگوں سے بے نیاز رہے۔"

رسولِ مقبولؐ ایک جملہ میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ۔

"لیس الغنی عن کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس"

"بے نیازی مال و دولت کی فراوانی سے حاصل نہیں ہوتی، حقیقی بے نیازی ضمیر و باطن کی بے نیازی ہے۔" (نہج الفصاحہ ص ۵۴)

"لوکرس" کہتا ہے کہ۔

"امیر ترین شخص کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے یہ تصوّر کیجئے کہ وہ بسترِ بیماری پر پڑا ہوا ہے، پھر اس کی حالت کو نظروں میں مجسم کیجئے۔ اس موقع پر آپ اس پر روپیہ پیسے کی بارش کر دیجئے، روئی کے گدے سے اطلس و دیبا کے بستر پر منتقل کر دیجئے۔ اگر یہ مال و دولت اس کی بے چارگی اور ناامیدی کا ازالہ کر سکتا ہے تو دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مال اس کے حال اور اس کی سعادت کے لئے موثر ہے لیکن اگر یہ ثروت اس کے جسم کو آرام نہ پہنچا سکی تو کیسے ممکن ہے کہ روح کو رنج و غم سے بے نیاز کر دے گی اور خوشی و نیک بختی سے اس کی ہمکناری کا موجب ہوگی۔" (تلقین بنفس، ص ۱۹)

ڈاکٹر مارڈن لکھتا ہے کہ۔

"اگر ہماری خوش بختی کی بنیاد مادّی لوازم پر رکھی جائے تو وہ بہت جلد ڈھے جائے گی۔ کیونکہ مادّی دنیا فانی اور متغیّر ہے اور اس کے لوازم بجلی کے کوندے کی طرح جلد گزر جانے والے، بخارات کی مانند ناپائیدار اور بھڑکتی آگ کے شعلوں کی مانند متزلزل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے فانی اور ناپائیدار لوازم کے ساتھ کیونکہ خوش رہا جا سکتا ہے۔ ایسا شخص جو مادّی لوازم سے آسائش و خوشی کا طلبگار ہو اس شخص کی مانند ہے جو سمندر کی طوفانی موجوں کے درمیان برف کے ایک

بڑے ٹکڑے پر بے خبر سو رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ کچھ ہی دیر میں برف پانی میں بدل جائے گا اور یہ غافل سمندر کی لہروں کی نذر ہو جائے گا۔

دولت و ثروت سعادت کا سرمایہ نہیں بلکہ ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہماری خوش بختی کا سرمایہ روح کی آسائش ہے جس پر مادّی لوازم کوئی اثر نہیں ڈالتے۔

یہ گمان نہ کیجئے گا کہ میں مال و دولت کے عیب بیان کر رہا ہوں' مال اگر عقل و اعتدال کے ہمراہ ہو تو سکونِ قلبی کے ذرائع میں سے ایک ہے۔

یہ بات مسلّم ہے کہ مادّی لوازم کی جستجو میں حد سے زیادہ مشغول ہو جانا روحانی اعتدال کو ختم کر دیتا ہے اور حسد' کینہ اور تند خوئی جو مادّہ پرستی کے لوازم میں سے ہیں یکایک ہماری روح کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ خوش بختی کے لئے اعتدال و میانہ روی لازم ہے۔ ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا ضروری ہے تاکہ زندگی کی راہوں میں افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں۔

میں نے مذہبی داستانوں میں پڑھا ہے کہ دوسرے جہان میں گناہگار ایک ایسے راستے کو عبور کرتے ہیں جو آگ سے زیادہ جلا ڈالنے والا' تلوار سے زیادہ تیز دھار اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ زندگی کا راستہ اسی راہ کی مانند ہے۔ کیونکہ بال کی طرح باریک ہے اس لئے اگر ایک لحہ کی بھی غفلت کے مرتکب ہوں تو منحرف ہو جائیں گے' کیونکہ تلوار کی طرح تیز دھار ہے اس لئے اگر احتیاط کو ملحوظ نہ

رکھیں گے تو خود کٹ مریں گے اور کیونکہ آگ کی طرح جلا ڈالنے والا ہے اس لئے ایک لحہ کی غفلت سے اس کے شعلے ہمارے خرمنِ ہستی کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔

اگر خوش بختی کا حصول چاہتے ہو تو آگ کی مانند آزمند و سرکش نہ بنو۔ خوش بختی حرص و طمع سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ طبع حریص طوفانی دریا ہے اور اس شخص سے زیادہ قابلِ رحم کوئی نہیں جو طوفان سے سکون و آسودگی کی تمنا رکھے۔" (اسرار نیک بختی ص۱۰۱-۹۸)

ہر وہ مسلمان جو اپنی عزّتِ نفس کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اپنی روح کو محدودیت سے رہائی دلائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذلّت و خواری سے اجتناب برتے۔ پیشوایانِ اسلام ہمیشہ مسلمانوں کو ان پست اہداف سے دوری کی ترغیب دیتے تھے جو ان کی عزّتِ نفس سے سازگار نہیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"ماقبح بالمؤمن ان یکون لہ رغبۃ تذلہ"

"کس قدر قبیح و ناپسندیدہ بات ہے کہ مومن اس چیز کے بارے میں رغبت کا اظہار کرے جو اس کی ذلّت و پستی کا موجب ہو۔"

(تحف العقول ص۴۸۹)

دورانِ حیات بے قیمت خواہشات پر اتنی توجہ نہیں دینی چاہئے کہ گویا کوئی چیز ان سے بڑھ کر چاہے جانے کے لائق ہی نہیں..... کیونکہ یہ صورتِ حال فکری جمود اور انحطاط کا سبب ہے۔ ان بے وقعت چیزوں سے دل لگانے کے

نتیجے میں انسان کے اندر ایسے احساسات پیدا ہوجاتے ہیں جو ایک لمحہ کے لئے بھی اسے مادّیات سے بلند نہیں کرتے، نیز انسان کی عظمت و حیثیت بھی دو کوڑی کی ہوکے رہ جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"عظموا اقدارکم بالتغافل عن الدنی من الامور"

"پست و معمولی خواہشات سے چشم پوشی کے ذریعہ اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کرو۔" (تحف العقول، ص ۲۲۴)

بعض افراد پر مفاد پرستی کی حس اس قدر غالب آجاتی ہے کہ وہ مادّی منافع کے حصول کے لئے اپنی عزّت و شرافت کو بھی داغدار کرلیتے ہیں اور ہر قسم کی ذلّت و پستی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں۔ اور کیونکہ ہر کسی سے فائدہ اٹھانے کے جداً جداً طریقے ہیں اس لئے یہ لوگ دوسروں سے میل ملاپ کے دوران خاص تیکنک اختیار کرتے ہیں اور زور شور کے ساتھ اس پر عمل کرتے ہیں۔ لوگوں کا بے جا احترام و تعظیم اور ایسی باتیں جو صرف ذلّت و پستی کے اظہار کے معنی رکھتی ہیں ان کی عادت بن جاتی ہیں۔ یہ طرزِ عمل ان کے باطن کی ناآسودگی اور پستی کو ظاہر کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"ساعة ذل لا تفی بعز الدهر"

"ایک لمحہ کے لئے بھی ذلّت قبول کرلینے کی تلافی زمانہ بھر کی عزّت قدموں میں ڈھیر ہوجانے سے بھی نہیں کی جاسکتی۔"

(غرر الحکم ص ۴۳۴)

"ایمرسن" کہتا ہے کہ۔

"جہاندیدہ لوگ ہر ترقی و کامیابی کے لئے ایک خاص قیمت کی ادائیگی بہتر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اکثر اوقات اس سلسلہ میں کنجوسی سے کام لینے کی وجہ سے بڑا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے اور یہ عدم ادائیگی ہمیشہ ایک فرض کی صورت انسان پر سوار رہتی ہے۔

کیا کبھی کوئی ایسا شخص فائدہ میں رہا ہے جسے اس کے ساتھیوں نے سینکڑوں مرتبہ فائدہ پہنچایا ہو لیکن اس نے کبھی ایک مرتبہ بھی انہیں اس کا صلہ نہ دیا ہو؟

کیا کوئی شخص بے غیرتی اور دھوکہ سے اپنے ہمسایہ کے مال کو استعمال کرکے فائدہ میں رہا ہے؟

نعمت ملنے پر ایک طرف تو شکرِ نعمت اور دوسری طرف احسان کا اعتراف ضروری ہے۔ ہمسائے کے ساتھ معاملات برابری کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ ہمیشہ کسی ایک کا ہاتھ اوپر اور دوسرے کا نیچے نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک ہمسائے کا احسان ہمیشہ دوسرے کو یاد رہنا چاہیئے یہاں تک کہ اس احسان کا بدلہ چکادے۔ ایسا شخص جو ہمسائے کی بگھی میں سفر کرتا ہے اگر اپنی خودی کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کی ہڈیوں کا ٹوٹ جانا، مانگنے کی ذلّت سے بہتر ہے کیونکہ دستِ سوال دراز کرنے کی ذلّت بہت بڑی قیمت ہے۔"

(فلسفہ اجتماع ص ۳۸۷)

روحِ بے نیازی

بے نیازی اور عالی ہمتی ان لوگوں کا خاصہ ہے جنہوں نے اپنی انسانی قدرو قیمت کو پہچان لیا ہے۔ ایک ایسا مسلمان جو اسلام کی گرانمایا تعلیمات پر عمل پیرا ہو اگر مالی بحران سے دوچار ہوجائے تو ذلّت و پستی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ ان مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے۔

اسلام میں حلال آمدنی کے حصول کے لئے جدوجہد کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے تاکہ انسان ایک کامیاب زندگی بسر کرسکے۔ لیکن اسی حال میں اسے بے حد و حساب دولت کے حصول کی ایسی خواہش سے باز رکھا گیا ہے جو دولت کی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔ کیونکہ دوسروں کا محتاج ہونا اور مال و دولت کا اسیر ہونا دونوں ہی ذلّتِ نفس اور انسانی عظمت و شرف کے خاتمہ کا سبب ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے مختلف کلمات میں ان دونوں صورتوں میں ذلّت و خواری کا یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

"السؤال یضعف لسان المتکلم و یکسر لب الشجاع البطل و یوقف الحر العزیز موقف العبدالذلیل ویذہب بہاءالوجہ ویمحق الرزق"

"لوگوں سے کسی حاجت کے سلسلہ میں سوال زبان آوروں کی زبان کو بھی لڑکھڑا دیتا ہے، بہادر انسان کی عقل کو زائل کردیتا ہے، آزاد مرد کی حیثیت کو گھٹا کر غلاموں کی سطح پر لے آتا ہے۔ رخساروں کی طراوت کو ختم کردیتا ہے اور رزق کو روک دیتا ہے۔"

(غررالحکم۔ص۹۸)

"رب غنی اذل من فقد"

"ناداری سے زیادہ بدبختی کا موجب ایسی دولت ہے جس کا انسان اسیر ہوجائے۔" (غررالحکم۔ص ۴۱۴)

"کم من فقیر غنی و غنی مفتقر"

"بہت سے نادار ایسے ہوتے ہیں جو حقیقتاً ثروت مند ہیں اور بہت سے صاحبِ ثروت ایسے ہوتے ہیں جو درحقیقت فقرو بدبختی سے دوچار ہیں۔" (غررالحکم۔ص ۵۵۲)

قرآن کریم باشرف تہیدستوں کا ان الفاظ میں تعارف کراتا ہے۔

"یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیمٰہم لایسئلون الناس الحافا"

"ناواقف افراد انہیں ان کی حیا و عفت کی بنا پر مالدار سمجھتے ہیں حالانکہ تم آثار سے ان کی غربت کا اندازہ کرسکتے ہو۔ اگرچہ یہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۲۔آیت ۲۷۳)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"ما احب ان لی بذل نفسی حمر النعم"

"مجھے عزّتِ نفس کھو دینے کے عوض عمدہ عمدہ نعمتوں کا حصول گوارہ نہیں۔" (مستدرک،ج۲ص ۳۶۴)

ضروری مواقع پر قدر شناسی اور شکر گزاری کو اسلام پسندیدہ اور نمایاں خصوصیات میں شمار کرتا ہے لیکن ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شکرگزاری اور قدر شناسی کے پردے میں تملق و چاپلوسی کرے اور دوسروں کی

تمجید و تعریف کے نام پر اپنی شخصیت کو مجروح کرے۔ کسی مسلمان کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ خوشامد و چاپلوسی (جو شرافتِ نفس اور آزادگی کے منافی ہے) کے ذریعہ اپنے آپ کو آلودہ کرے۔

شکر گزاری کی بنیادی شرط شکر گزار فرد کا یہ اطمینان ہے کہ وہ اسی وقت یہ عمل انجام دے رہا ہے جب اس کی واقعی ضرورت ہے۔ لیکن بعض افراد جو ناقص اخلاق اور باطنی ضعف کا شکار ہوتے ہیں وہ تملق آمیز اور ذلّت آور تحسین و تمجید کے ذریعہ اپنی باطنی حقارت و پستی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ بے شک ایسی حالت جو نفسیاتی ضعف کا ردِّ عمل اور زبونی و فرومائیگی کی دلیل ہے کسی قسم کی اخلاقی و معنوی حیثیت نہیں رکھتی۔

امیرالمومنینؑ اپنے ایک جملہ میں تصریح فرماتے ہیں کہ تملق آمیز تعریف دو زیاں بخش اور نامطلوب نتائج کا سبب بنتی ہے۔ ایک طرف تو چاپلوس کی عزّتِ نفس برباد ہوجاتی ہے اور دوسری طرف جس کی چاپلوسی کی جارہی ہوتی ہے وہ نفرت انگیز غرور و تکبّر میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

"کثرۃ الثناء ملق یحدث الزھو ویدنی من العزۃ"

"تحسین و ستائش کی زیادتی چاپلوسی و تملق ہے کہ (جس کی وجہ سے) ایک طرف تو مخاطب کے اندر نخوت و تکبّر پیدا ہوجاتا ہے اور دوسری طرف (خوشامدی کی) عزّتِ نفس ختم ہوجاتی ہے۔"

(غرر الحکم - ص ۵۶۳)

شریف النفس اشخاص خواہ کسی بھی مقام و مرتبہ کو پہنچ جائیں اپنی شخصیت کو گم نہیں کرتے۔ اس کے علی الرغم ایسے لوگ جو شرافتِ نفس سے بہرہ ور

نہیں ہوتے معمولی سا عہدہ و مقام ملنے پر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اس نکتہ کو ایک خوبصورت جملہ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ۔

"ذوالشرف لا تبطرہ منزلۃ نالھا و ان عظمت کالجبل الذی لا تزعزعہ الریاح، والدنی تبطرہ ادنی منزلۃ کالکلاء الذی یحرکہ مر النسیم"

"شریف انسان ترقی و تعالی کے خواہ کسی بھی مرحلہ پر جا پہنچے ناشکری نہیں کرتا۔ ایسا شخص مضبوط جمے ہوئے پہاڑ کی مانند ہے جسے بڑے سے بڑا طوفان بھی متزلزل نہیں کرسکتا لیکن پست انسان معمولی سا مقام پالینے پر بھی ناشکرے پن کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا آدمی اس گھاس کی مانند ہے جسے ہوا کا معمولی جھونکا بھی ہلا دیتا ہے۔"

(غرر الحکم - ص ۴۰۷)

عاقبت اندیشی

ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی کام کی انجام ہی کے ارادہ سے قبل اس کے نتائج و عواقب کا باریک بینی سے جائزہ لے اور اپنی شرافت اور عزّتِ نفس کی حفاظت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کام کا آغاز کرے۔ ایسے لوگ جن کی فکر جامد اور باطن تاریک ہوتا ہے وہ پست ترین مقاصد کے لئے بھی ہر قسم کی غلامی و ذلّت قبول کرلیتے ہیں۔ نیز اس مقصد کے لئے کسی قسم کے عمل کی انجام دہی سے دریغ نہیں کرتے۔ لیکن کیا اس قسم کے مقاصد اور ایسے اعمال کسی

شریف النفس انسان کے لئے مناسب ہیں؟

ایک شخص رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وعظ و نصیحت کی فرمائش کی۔ آنحضرتؐ نے اس کی درخواست کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم اس بات کا وعدہ کرتے ہو کہ میری نصیحت پر خوب اچھی طرح عمل کروگے؟ اس نے کہا ہاں وعدہ کرتا ہوں۔ رسولِ اکرمؐ نے یہ جملہ تین مرتبہ دُہرایا اور اس طرح اس شخص کو اپنے پیشِ نظر موضوع کی اہمیت کا احساس دلانے کے بعد فرمایا:

"جب بھی کسی کام کا ارادہ کرو تو پہلے اس کے نتیجے پر غور کرلو۔ اگر اس کا نتیجہ درست اور صحیح نظر آئے تو اس کام کو نتیجے کے حصول تک انجام دو لیکن اگر تمہیں اس کام کا نتیجہ گمراہی و تباہی محسوس ہو تو اپنے ارادہ سے باز رہو اور کام کی انجام دہی سے پرہیز کرو۔" (وسائل، ج۲ ص۴۵۷)

ایک یورپی دانشور لکھتا ہے کہ۔

"کاموں کی اونچ نیچ کا قبل از وقت جائزہ لے لینا اور ان کی خوبی و بدی پر غور کرلینا ضروری ہے دیکھ لینا چاہئے کہ آیا موردِ نظر مقصد اس قدر فداکاری اور جانفشانی کے لائق ہے بھی کہ نہیں۔ اگرچہ اس بارے میں مختلف افکار و نظریات پائے جاتے ہیں اور ہر ایک اپنے مقصد و ہدف کو دوسروں سے بہتر و اعلیٰ سمجھتا ہے جیسا کہ "مارکوس" کہتا ہے کہ "مکڑی" مکھی کو شکار کرکے اتنی ہی خوش ہوتی ہے جتنا کوئی شکاری ہرن کے شکار کے بعد مسرور ہوتا ہے۔"

بنا بریں ہر ایک کا مقصد مختلف ہوتا ہے۔ شہرت کے لئے ضروری

ہے کہ وہ افتخار کے لئے ہو وگرنہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاریخ سلف میں بعض اشخاص اپنی بدی اور رذالت کے حوالے سے اتنے معروف تھے جیسے سورج روشنی کے لئے اور آگ گرمی کے لئے۔ کیا ان لوگوں کو ایسی شہرت سے لعن و نفرین کے سوا کچھ حاصل ہوا......؟

وہ عظیم لوگ جنہوں نے اپنی حیات کو عدالت و فضیلت کی ترویج اور تہذیب و تمدن کے فروغ کے لئے وقف کیا ہوا تھا' زندہ و جاوید ہیں' وقت کا گزرنا ان کی عظمت کو ذرہ برابر کم نہ کرسکا۔ اس قبیل کے لوگ اپنے کارناموں کی وجہ سے زمان و مکان کی حدود سے بلند ہوجاتے ہیں۔ ہر زمانہ میں ان کا نام لوگوں کے وردِ زبان رہتا ہے' ان کی یاد دلوں میں نقش رہتی ہے اور روز بروز ان کی عظمت کا آوازہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

تاریخ مشاہیر کے جسموں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی بلکہ ان کی خدمات کی وجہ سے ان کی روح کو سراہتی ہے۔ مردانِ عمل پہاڑوں سے زیادہ بلند ہمت اور سمندروں کی وسعت سے زیادہ وسیع روحوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی ہمت ہر چیز کو عبور کرجاتی ہے اور ان کی روح ہر چیز کو اپنے اندر سمولیتی ہے۔ ان کے نزدیک نا امیدی کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہ کسی صورت مغلوبیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی فکر بہت گہری ہوتی ہے۔ وہ فرصت کے مواقع کو خوب پہچانتے ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کیونکہ فرصت جنگلی ہرن کی مانند ہے کہ اگر ہاتھ سے نکل جائے

توپلٹ کر نہیں آتی۔" (در آغوشِ خوش بختی ص ۱۱۵-۱۱۴)

حقیقی آزادی

انسان کائنات کا مترقی ترین اور برترین موجود اور ایسی مثبت، فعال اور خود مختار قوت ہے جو اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ مختلف جہات میں کمال کے مراحل طے کرسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنی سرگرمیوں اور کوششوں کو پست اہداف کے حصول کے لئے صَرف کردے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی ایک نکتہ پر مرکوز کردے تو کیونکروہ اپنی حقیقی انسانی سرشت کو پاسکتا ہے؟

نامناسب مقاصد کا انتخاب اور ان کے پیچھے چل پڑنا رفتہ رفتہ انسان میں موجود صلاحیتوں کو ضائع کردیتا ہے اور یوں اس کے اندر ترقی کے لئے مطلوب قوت باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں نفس اس قدر انحطاط کا شکار ہوتا ہے اور شعور وادراک کے درجہ سے نیچے آجاتا ہے کہ اگر اس کی حقیر خواہشات کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجائے تب بھی وہ پستی کی جانب جانے پر مصر رہتا ہے۔

ترقی کی جانب گامزن نفس جو اپنے مرتبہ انسانی میں اضافہ کررہا ہوتا ہے ایک خاص حرّیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو حقیقی آزادی سے بہرہ مند ہو نہ خود کو ذلیل وپست کرتا ہے اور نہ اپنی انسانی کرامت پر دھبا لگاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی ایک عالی ہدف رکھتی ہے اور یہ ہدف ہرچیز سے زیادہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے حصول کی جدوجہد کی جائے۔ گوناگوں رغبتیں اس آزاد اور صاحبِ اختیار شخص کو اپنی جانب مائل نہیں کرپاتیں بلکہ یہ

رغبتیں اس کی مطیع و فرمانبردار ہوجاتی ہیں نیز اس کے وجود میں زندہ مختلف صلاحیتیں زندگی کے تمام پہلوؤں میں اپنی ذمہ داریاں نہایت درستگی کے ساتھ انجام دیتی رہتی ہیں۔

یہ انمول انسان پاک روح، بلند ہمت اور اعلیٰ مقاصد کا حامل ہوتا ہے۔

ہرکسی کے مقام و منزلت کو اسی پیمانے پر پرکھنا چاہئے کیونکہ بلند ہمت شخص ہی بلند پایہ شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"قدر الرجل علی قدر همته"

"ہر شخص کی قدر و قیمت اس کی ہمت کے مساوی ہوتی ہے۔"

"ینبغی لمن عرف شرف نفسه ان ینزهها عن دنائة الدنیا"

"جس شخص نے اپنی شرافتِ نفس کو پہچان لیا ہے اسے چاہئے کہ خود کو زندگی کی پستیوں اور آلودگیوں سے پاک ومنزہ کرے۔"

(غرر الحکم-ص ۶۶۵-۸۶۰)

ہدف کا انتخاب استعداد کے مطابق ہونا چاہئے

انسان کو مقاصد کا چناؤ کرتے وقت اپنی طاقت وتوانائی اور استعداد کو مدِ نظر رکھنا چاہئے۔ بے جا اور نامعقول بلند پروازیوں سے اجتناب برتنا ضروری ہے کیونکہ ان کا نتیجہ محرومیت اور ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اس نکتہ کی جانب یوں نشاندہی فرماتے ہیں کہ۔

"من سئل فوق قدرہ استحق الحرمان"

"جو شخص اپنے استحقاق سے بڑھ کر کوئی چیز چاہے گا وہ محرومی کا حقدار ہوگا۔" (غرر الحکم ص ۵۳۶)

"من سئل مالا یستحق قوبل بالحرمان

"جو شخص کسی ایسی چیز کی جو اس کی حد و اختیار میں نہیں تمنا کرے وہ ناکامی سے دو چار ہوگا۔" (غرر الحکم ص ۶۶۲)

نفسیات داں ناکامی کے اسباب میں سے ایک سبب اونچے خیالات اور استعداد اور ہدف میں عدم تناسب بیان کرتے ہیں۔

"ناکامی کے اسباب یا تو خود شخص میں پائے جاتے ہیں' یا ماحول اس قسم کا ہوتا ہے یا دونوں ہی چیزیں موثر ہوتی ہیں----لوگ مشکلات سے مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے مختلف قوتیں رکھتے ہیں۔ بکثرت لوگ استعداد کی کمی کے باعث مشکلات پر قابو نہیں پاسکتے۔ خود انسان کے اندر ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ قوت نہ ہونے کے باوجود اپنی تمناؤوں کے پالینے کی توقع رکھتا ہے مثلاً احمد ایک نوجوان صحت مند ایتھلٹ ہے یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے کھیلوں میں حصہ لیتا ہے' اس کی شخصیت ایسی ہے کہ بہت سے لوگوں کو دوست بنا سکتا ہے اور ان کی ہم نشینی سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مغموم و دلگرفتہ رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ لوگ کماحقہ اس کی تحسین و تعریف نہیں کرتے' دوسروں کو جو میڈل ملتے ہیں اسے نہیں ملتے' اخبارات صفحہ اول پر اس کی تصاویر نہیں

چھاپتے وغیرہ وغیرہ۔

احمد کی توقعات بے جا ہیں' وہ جس قسم کی پریشانی میں مبتلا ہے اس کا مشاہدہ اکثر افراد خصوصاً جوانوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ خوب اچھی طرح جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ بہت سے لوگ اپنے حالات سے راضی نہیں ان کی توقعات ان کی استعداد سے زیادہ ہیں۔

جو لوگ دنیا سے زیادہ توقع رکھتے ہیں کسی صورت سعادت مند اور آسودہ نظر نہیں آتے۔ اگر ان میں اپنی تمنائیں پوری کرسکنے کی طاقت ہوتی تو یقیناً اپنی آرزو پالیتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی توقعات ان کی صلاحیتوں سے زیادہ ہیں۔

ہمیں تعلیم دی جاتی ہے کہ انسان جو چاہے حاصل کرسکتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ صلاحیت و توانائی کی موجودگی ہی میں ایسا ممکن ہے۔ البتہ تمام امور میں کوشش ضروری ہے اور شکست کھانے کے بعد کوششوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے' ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مطلوب ہدف تک رسائی کے لئے جدوجہد کرے لیکن ہدف کا انتخاب اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کرنا چاہئے۔"

(روان شناسی برائے زیستن، ص ۳۳۹-۳۳۷)

گناہوں کے نتیجہ میں احساس ندامت

ارتکابِ گناہ بھی ان عوامل میں سے ہے جو انسان کی عزتِ نفس کو شدّت کے ساتھ مجروح کرتے ہیں۔ ایسا شخص جو قانون کی حدود عبور کرجائے اور اس

سے خلافِ شرف و فضیلت اعمال سرزد ہوں اسے اپنے اندر ذلّت و پستی کا احساس ہوتا ہے۔ دائمی شرمندگی جو گناہ کی وجہ سے گناہگار کے دامن گیر ہوجاتی ہے اس کی عزّتِ نفس اور شخصیت کو داغدار بنا ڈالتی ہے۔

ایسے لوگ جو اپنی ہوا و ہوس پر مسلط ہوں' اپنی تمایلات پر حاکم ہوں اور خود کو خطا و معصیت کے گرداب سے محفوظ رکھتے ہوں اور گناہ کے نزدیک بھی نہ جاتے ہوں ایک خاص عزّتِ نفس اور آسودگی کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کسی بھی معاشرہ میں نہایت قلیل تعداد میں ملتے ہیں جب کہ لوگوں کی اکثریت اپنی زندگی میں کم و بیش معصیت کی راہ پر ہوتی ہے اور ان کے قلوب پر گناہ کی تاریکی چھائی رہتی ہے۔

جس طرح جسمانی بیماریوں کا علاج ممکن ہے اسی طرح اگر نفس و روح بھی بیماری میں مبتلا ہوجائیں تو ان کا بھی علاج ہے۔ اسلام نے اس قسم کی بیماریوں کے علاج کی نشاندہی کی ہے نیز فضیلت و سعادت کی جانب بازگشت کے لئے توبہ کی راہ کھولی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ رحمت و فضلِ الٰہی کی نوید دی ہے۔

پیغمبرانِ الٰہی ہمیشہ انحطاط و بدبختی' خطرناک نفسیاتی عوارض اور ضمیر کے جانکاہ دباؤ سے نجات کے لئے گناہگاروں کو خداوندِ عالم کے عفو و درگزر کی امید دلاتے ہیں۔ تاکہ اس طرح یہ لوگ حضرتِ احدیت کی بارگاہ میں اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار کریں' اس سے بخشش و مغفرت کے طالب ہوں اور گناہوں سے پرہیز کا اعلان کریں نیز گزشتہ خطاؤں کے ازالہ کی کوشش کریں۔ اس طرح حتیٰ الامکان ان میں سے جرائم کے آثار زائل ہوجائیں گے جس کے نتیجہ میں وہ ضمیر کی ملامت اور دباؤ سے نجات پاسکیں گے۔ کیونکہ اگر گناہ کا احساس ہمیشگی

اختیار کرلے تو نہایت جانکاہ اور طاقت فرسا ہوتا ہے اور عفو و بخشش اور نفس کی تطہیر سے ناامیدی انسان میں ناقابلِ تلافی مفاسد کے جنم لینے کا سبب بنتی ہے اور اس کے اثرات اس معاشرہ پر بھی رونما ہوتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کررہا ہوتا ہے۔

ایسا انسان جو اپنے لئے سعادت اور شرافتِ نفس پسند کرتا ہے جب کبھی بھی اپنی نادانی اور نفسانی عوامل کے زیرِ اثر گناہ کی طرف کھنچتا ہے یا خداوندِ عالم کے احکام کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے جوں ہی گناہ کا احساس ہوتا ہے بے درنگ خداوندِ عالم سے مغفرت طلب کرتا ہے۔ قرآن اس خصوصیت کو اہلِ تقویٰ کے امتیازات میں شمار کرتا ہے۔

"والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن یغفر الذنوب الا الله و لم یصروا علیٰ ما فعلوا وهم یعلمون۔"

("متقی اور نیکوکار) وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی نمایاں گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں تو معاً خدا کو یاد کرکے اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ اپنے کئے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔"

(سورۂ آل عمران ۳ - آیت ۱۳۵)

لیکن وہ لوگ جنھوں نے گناہ ہی کو اپنی عادت بنالیا ہے۔ گناہوں کی سیاہی میں اس قدر غرق ہوچکے ہیں کہ انہیں ان کی قباحت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ موت کی شدّت میں مبتلا ہونے تک وہ اسی راستے پر چلتے رہتے ہیں اور پروردگارِ

عالم کی عظمت و بزرگی اور اپنی معصیت کاری سے غافل رہتے ہیں۔ یہ لوگ اہلِ تقویٰ کے اس امتیاز سے محروم ہیں اور ان کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نفسانی آلودگیوں اور گناہوں سے پرہیز کو عزت و شرافت کے حصول کے عوامل میں سے قرار دیتے ہیں۔

"من کرمت علیہ نفسہ لم یھنھا بالمعصیۃ"

"جو شخص اپنے نفس کی شرافت و کرامت کا قائل ہو اسے گناہ و رزیلتیں پست و خوار نہیں کرتیں۔" (غرر الحکم ص ۷۵۷)

"اذا طلبت العز فاطلبہ بالطاعۃ"

"اگر عزت و سرفرازی کے متمنی ہو تو اسے خداوندِ عالم کی اطاعت و فرمانبرداری میں تلاش کرو۔" (غرر الحکم ص ۳۱۴)

خداوندِ عالم کی بارگاہ میں اعترافِ گناہ اور اس سے مغفرت چاہنا آدمی کی عزتِ نفس کے دامن سے گناہ کے سیاہ داغ دھوڈالتا ہے اور اسے ضمیر کی خلش سے نجات دیتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"واللہ ماینجو من الذنب الا من اقربہ"

"خدا کی قسم کوئی شخص بھی گناہ اور اس کے ملال سے خلاصی نہیں پاسکتا سوائے اس کے جو اپنے گناہوں کا صریحاً اقرار کرلے۔"

(کافی، ج ۲ ص ۴۲۶)

نفسیات دانوں کے نزدیک گناہ کے جانکاہ احساسِ ندامت سے چھٹکارے کی ایک بنیادی راہ یہی اعترافِ گناہ اور اس کے ازالہ کا عزم ہے۔ کہتے ہیں کہ۔

"جب انسان کسی خلاف کاری کا مرتکب ہوتا ہے تو اپنے اندر گناہ و تقصیر کا احساس کرتا ہے۔ اس موقع پر اضطراب کی مانند ایک دل تنگی سی اس پر مسلط ہوجاتی ہے۔ یہ احساسِ نہایت بجا اور مناسب ہے کیونکہ یہ ہمارے اندر ندامت اور آئندہ اس گناہ سے پرہیز کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جب انسان میں یہ احساسِ ندامت بیدار ہو تو بہتر ہے کہ وہ اس احساس سے نجات کے لئے جو بکثرت مواقع پر انتہائی ناگوار ہوتا ہے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ حسِ گناہ کس قدر بجا ہے کسی جہاندیدہ اور تجربہ کار شخص سے مشورہ کرے۔ اس طریقے سے وہ ناگوار احساس سے بھی نجات پاسکتا ہے اور مشورہ کے ذریعہ رہنمائی بھی حاصل کرسکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس احساسِ گناہ کو اپنے اندر لئے پھرتے ہیں اور یوں خود اپنے لئے آزار کا سبب ہوجاتے ہیں کیونکہ یہ حس خفتہ ضمیر کے لئے سزا کی مانند ہے اور اس کی وجہ سے انسان دائمی عذاب کا شکار رہتا ہے۔ صحیح راستہ یہ نہیں کہ خفتہ ضمیر سزا میں مبتلا رہے بلکہ راہِ صواب یہ ہے کہ اپنی خطا کا اعتراف کرے اور اس کے ازالہ کا طریقہ اختیار کرے۔"

(روان شناسی برائے زیستن - ص ۳۱۱-۳۱۰)

توبہ اور اعترافِ گناہ انسان کے چھنے ہوئے سکون کو لوٹا دیتا ہے اور اسے گزشتہ خطاؤں کے ازالے اور فضیلت و معنوی شخصیت کے حصول کی راہ میں قوت عطا کرتا ہے۔

ایک بڑا نقص

انسان کا ایک بڑا اخلاقی نقص ہر وقت زمانہ کا شکوہ کرتے رہنا اور ہر کس و ناکس کے سامنے اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا رونا رونا ہے' اس خصلت کا حامل شخص اپنی منزلت گرا بیٹھتا ہے اور خود کو معمولی اور بے وقعت بنا کر اپنی عزتِ نفس کو داغدار بنالیتا ہے۔

مفضل بن قیس جو مالی پریشانیوں اور اداء قرض سے عاجزی کی بناء پر سخت مشکل میں تھا۔ ایک روز حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی وضع زندگی کے بارے میں حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہوئے آنحضرتؐ سے کہنے لگا۔

"ایک کثیر رقم کا مقروض ہوں' نہیں معلوم کس طرح اس کی ادائیگی ہو سکے گی۔ روز مرّہ اخراجات کے لئے بھی کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ نہایت پریشان ہوں' تنگدستی نے مجھے مبہوت کرکے رکھ دیا ہے۔ جس در کا رخ کرتا ہوں بند پاتا ہوں۔"

پھر آنحضرتؐ سے درخواست گزار ہوا کہ دعا فرمایئے کہ خداوندِ عالم میری مشکل حل کردے۔

اس کی بات سن کر امامؑ نے اپنے خدمتگار سے فرمایا۔

"پیسوں کی وہ تھیلی جو منصور نے بھیجی ہے اٹھالاؤ۔ خادم گیا اور فوراً ہی تھیلی لئے ہوئے حاضر ہوا۔ پھر آپؑ نے مفضل سے فرمایا۔

اس تھیلی میں سونے کے چار سو دینار ہیں انہیں اپنے اخراجات کے لئے قبول کرو۔

مفضل نے عرض کیا۔

میں نے اپنی مشکلات اس لئے بیان نہ کی تھیں بلکہ میں تو آپؑ سے محض دعا کا طالب تھا۔

امام نے فرمایا!

ہاں ہاں! میں دعا بھی کروں گا لیکن اس بات کو ذہن نشین رکھو کہ کسی بھی صورت میں لوگوں کے سامنے اپنی مشکلات اور پریشانیوں کا تذکرہ نہ کرو کیونکہ اس کا پہلا اثر یہ پڑے گا کہ لوگ تمہیں ایک ناکام و نامراد شخص سمجھیں گے۔ ظاہر ہے اس طرح لوگوں کی نظر میں تمہاری حیثیت گھٹ جائے گی اور تمہاری شخصیت کُلّی طور پر مٹ جائے گی۔"

(بحار الانوار ج ۷ ص ۱۱۴)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"رضی بالذل من کشف ضرہ لغیرہ"

"وہ شخص اپنی ذلّت پر راضی ہوا جس نے دوسروں کے سامنے اپنی مشکلات ظاہر کیں۔" (غرر الحکم ۴۲۲)

"جلٹ برگس" لکھتا ہے کہ۔

"نہ جانے کیوں لوگ جانتے بوجھتے اپنی ناکامیوں اور نقائص کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اس بارے میں ان کا خاموش رہنا کئی دلائل کی بنا پر سودمند ہے۔ بعض لوگ دوسروں کی مدح و ستائش کرنے سے پہلے تمہیدی طور پر اپنے کچھ نقائص کا تذکرہ کرتے ہیں۔

بعض لوگوں میں یہ عادت خود اپنے اوپر غصّہ کی بناء پر ایک قدیم بیماری کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ کہتے ہیں : میں تھک چکا ہوں نہ جانے آخری مہینہ تک گھر کا خرچہ کیسے چلاؤں گا؟

ان لوگوں کا یہ اظہار ان کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کا عکاس ہے۔ اس کے علاوہ کہ نقائص و پریشانیوں کے بیان سے پرہیز فوائد کا حامل ہے، ضبطِ نفس کا عمل خود آپ کے اخلاق کے لئے موثر ہے۔

جس طرح اُبلتے ہوئے پانی کی ایک دیگ سے بھاپ نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو وہ بہت طاقتور ہوجاتی ہے۔ اسی مانند ضبطِ نفس بھی انسان کے طاقتور ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ خود اس کی اپنی نظر میں اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ایسا بچّہ جس کے کسی عضوِ بدن میں نقص پایا جائے لیکن اس کے بارے میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا ہو اور ایسا مرد جو مسکرا کر شکست کا گھونٹ پی جاتا ہو۔ ان سب کی روح ان لوگوں سے کہیں زیادہ قوی ہے جن کو اپنی زبان پر اختیار نہیں ہوتا جو مسلسل شکوہ شکایت میں مشغول رہتے ہیں۔" (کلیدھائی خوش بختی۔ص ۱۰۲-۱۰۱)

دسواں باب

مغرور کا ذہنی اختلال

خود کو برتر سمجھنا

مخفی ضمیر اور باطنی شعور کی فعالیت اور نفوذ ضمیرِ آگاہ سے کہیں زیادہ گہرے، طاقتور اور اسی کے ساتھ ساتھ پیچیدہ تر ہوتے ہیں۔ لاشعور کی نفسیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے باطن کی ایک مبہم سرگرمیوں سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ انسانی وجود میں بہت سے ایسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو اسے ایسی چیزوں کی انجام دہی پر ابھارتے ہیں جن سے اس کا آگاہ شعور مکمل طور پر بے خبر ہوتا ہے اور اکثر اوقات ان اندرونی قوتوں کے حکم سے روگردانی انسان کے لئے محال ہو جاتی ہے۔

اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ انسان کی نفسیات کے مخفی محرکات کبھی اس کی منفعت کے لئے کام کریں اور کبھی زیاں کا باعث ہوں۔ خلاصہ یہ کہ غیر شعوری افکار و محرکات انسان کے رفتار و سلوک میں تعمیری کردار ادا کر کے اس کے اعمال و افعال کو پسندیدہ بھی بنا سکتے ہیں اور مخرّب اور خلل ڈالنے والی قوت کا کردار بھی ادا کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی شخص خاص حالات کی بناء پر ایک آئیڈیل کا تصور اپنے ذہن میں مجسم کر لے لیکن کبھی بھی خود کو ذہن میں موجود اس تصویر کے مطابق نہ بنا

سکے۔ انسان جس قدر اپنی شخصیت کو اس تصویر سے سازگار کر سکے گا اسی تناسب سے یہ بات اس کے انبساط یا تشویش اور نفسیاتی بیماری یا سلامتی پر اثر انداز ہوگی اور مختلف کیفیات کے ساتھ انسان کے اعمال و آثار میں نمایاں ہوگی۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسانی سماج میں بکثرت ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اپنی افراطی اور مبالغہ آمیز تصویر کا شکار ہیں اور نکتۂ افراط کی جانب جھکاؤ رکھتے ہیں۔

جب ذہن اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے تو خود پسندی انسان کی خود اس کے سامنے غیر حقیقی اور نہایت مبالغہ آمیز تصویر پیش کرتی ہے اور بہت آسانی کے ساتھ اسے حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہے۔ ممکن ہے اس قسم کی خود پسندی اس کے بچپنے ہی سے اس میں پیدا ہو جائے۔ بچّہ اس سے قبل کہ شعور و آگاہی کے مرحلہ پر پہنچے، اپنے ارادہ کی قوت کو بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے کام میں لائے، خاندانی اثرات اور اطرافیوں کی تلقین اس کے مستقبل، نفسیات، نوعِ جہاں بینی اور اسی طرح صحیح یا غلط تکامل یا انحراف و خود پسندی پر بہت زیادہ موثر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ بے جا توقع رکھنے والا، معاشرہ سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت سے عاری یا گوشہ نشینی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مختلف سلوک مثبت یا منفی، یا تعمیری و تخریبی طور پر بچّوں کے اوپر ناقابلِ بیان اثر ڈالتے ہیں۔

اکثر ایسے لوگ جو اپنے آپ کو مطمئن و آسودہ ظاہر کرتے ہیں سخت نفسیاتی دباؤ میں مبتلا ہوتے ہیں جو ممکن ہے کسی ایسی معمولی علامت کی صورت میں ان سے ظاہر ہو رہا ہو جو خود ان کے نزدیک یا دوسروں کے نزدیک بے قیمت ہو اور

اسی وجہ سے وہ اس کے ردِ عمل کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ ممکن ہے یہ علامت ایک بڑی روحانی بیماری کا پیش خیمہ ہو۔

کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص سے جس کے بارے میں یہ سوچا بھی نہ جاسکتا تھا ایسے خلافِ توقع کام سرزد ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ ایسے اعمال ان لوگوں میں پائی جانے والی ان قوتوں کی واضح علامت ہیں جو میل و مصلحت کے برخلاف اس شخص کے ارادہ کی عنان تھام کر اس کے رفتار و کردار کو اپنے شدید نفوذ میں لے لیتی ہیں۔

انسان ہر عمل اپنی کسی نہ کسی ایسی عادت کی تسکین کے لئے انجام دیتا ہے جو اس کی طبع و سرشت کا حصّہ ہوتی ہے۔ عام تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ قوی میلان جب شدّت اختیار کرتا ہے تو دوسرے احساسات و میلانات کو پامال کردیتا ہے اور انسان اس موقع پر دوسری تمام پیشِ نظر چیزوں سے چشم پوشی برتنے لگتا ہے۔

مغرور شخص اپنے احساسِ برتری کی تسکین کے واسطے اپنی تمام رفتار و گفتار کے لئے اپنے ذہن میں ایک بے نقص، کامل اور عالی نمونہ و قالب بنالیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے تمام اعمال اور احساسات کو اس مصنوعی قالب کے مطابق بنائے۔ اپنے خصائل کو اس قدر بلند سمجھنے لگتا ہے کہ اسے یقین ہی نہیں آتا کہ اس کے وجود میں بھی کوئی نقص ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بارے میں معمولی سی تنقید سننے کا بھی روادار نہیں ہوتا اور اتفاقاً اگر کوئی نہایت بے غرضی کے ساتھ اور سو فیصد منصفانہ طور پر بھی اس کے کسی نقص کی جانب اشارہ کرے تو یہ دیوانہ وار غصّہ کا اظہار کرنے لگتا ہے اور اس شخص کو مغرض، دشمن

اور کینہ توز و بد خواہ سمجھنے لگتا ہے۔

اس موقع پر مغرور کی روح میں ایک طوفان بپا ہوجاتا ہے اور معترض سے سخت عناد و پرخاش برتتا ہے تاکہ اسے خجل و شرمندہ کرکے اپنے احساسات کو تسکین پہنچائے۔

لاشعوری طور پر ایک مرموز قوت اسے ہمیشہ اپنی برتری کے اثبات اور دوسروں پر فوقیت کے لئے منصوبہ بندی پر ابھارتی رہتی ہے اور اسی بناء پر وہ کسی ایسے اقدام سے نہیں چوکتا جو دوسروں پر بَرتری اور خود نمائی کا موجب ہو۔

اس کے اکثر میل ملاپ، سرگرمیاں، حتیٰ سماجی بہبود کے کام خلوص پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ اسے اہمیت دیں، اسے سراہیں اور اس کے بارے میں اچھے خیالات رکھیں۔ ایسا شخص ہمیشہ اس بات سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں لوگ اس سلسلہ میں اس کے حقیقی مقصد سے آشنا نہ ہوجائیں۔

مغرب کا ایک فلسفی "اسپنوزا" کہتا ہے کہ۔

"غرور اپنے بارے میں انسان کی حد سے زیادہ خوش فہمی کا نام ہے۔

مغرور انسان حتیٰ الامکان اس فکر کو پروان چڑھاتا ہے لہٰذا طفیلیوں اور خوشامدیوں کے جھرمٹ میں بیٹھنے کو پسند کرتا ہے اور ایسے نیک سیرت لوگوں کی صحبت سے گریز کرتا ہے جو اسے اس کی حیثیت کے مطابق مقام دیتے ہیں۔

غرور کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نقائص کے شمار کے لئے بہت سا وقت درکار ہے۔ اس موضوع کے ادراک کے بعد بخوبی علم ہوسکتا ہے کہ مغرور شخص لازماً حاسد بھی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ ان

لوگوں سے متنفر ہوتا ہے جو اپنی فضیلتوں کی باعث موردِ ستائش قرار دیئے جاتے ہیں اور اس کی یہ نفرت مہر و محبت کے ذریعہ آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اسے ایسے ہی لوگوں کے درمیان مسرت ہوتی ہے جو اس کی کمزوریوں کے باوجود چاپلوسی میں مشغول ہوں اور اسے حماقت کے گڑھے سے وادیٔ جنون میں لے جائیں۔"

(فلسفۂ نظری۔ ص ۱۰۶)

اکثر ایسے لوگ جو سماج کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اگر کامیابیاں ان کے قدم چومنے لگیں تو وہ غرور و نخوت کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس طرح خاندانی نقص کی جو حقارت ان کے دامن گیر ہے اس کے ازالہ کی کوشش کرتے ہیں۔

البتہ پُرعظمت روح کے مالک لوگ معمولی زندگی پر راضی نہیں ہوتے۔ جب انسان کا ہدف عالی ہوتا ہے تو اس کی کوشش اور جدوجہد کا دامن بھی اسی قدر وسیع ہوجاتا ہے۔ جب انسان جمود و رکود سے دوچار ہوتا ہے تو وہ آگے بڑھنے سے عاجز رہتا ہے اور اس کی بلند خواہشات توقف کا شکار ہوجاتی ہیں۔ ایسے موقع پر عالی ہمت کے حامل لوگ مسلسل کوشش و جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں تاکہ اپنی عظمت کو انسانیت اور حقیقی انسانی خصائل کی بنیادوں پر استوار کریں اور افتخار کے اونچے مدارج پر جگہ پائیں۔ لیکن انہیں کسی صورت یہ پسند نہیں ہوتا کہ اظہارِ غرور و نخوت کے ذریعہ خود کو عظیم اور جلیل ظاہر کریں۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ غرور کے ذریعہ کسی نے عظمت و امتیاز حاصل نہیں کیا۔ مرد وہ ہے جو خود بخود معروف ہو' ہر کام میں سریع اور برق

رفتار پیش رفت کرے نہ وہ جو چاپلوسوں کے منہ سے اپنی موہوم عظمت کے بارے میں سننے کا متمنی ہو اور دوسروں سے جھوٹی ستائش و تمجید کی توقع میں رہتا ہو۔

غرور پیدا کرنے میں دولت کا کردار

دولت کی فراوانی بھی ان چیزوں میں سے ہے جو انسان کو خودپرستی اور غرور میں مبتلا کردیتی ہے۔ ایسا شخص جو ثروت مندی کی بناء پر "میں" کی قید میں اسیر ہوجاتا ہے اپنی انتہائی نادانی کی وجہ سے بینواؤں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے وجود کو زائد و بے وقعت شمار کرنے لگتا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے غافل رہتا ہے کہ دولت مندی درہم و دینار پاس ہونے اور مال و دولت کا ذخیرہ کرلینے کا نام نہیں۔ بکثرت ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو بے سروسامانی اور مالی تنگدستی کے باوجود معنوی سرمایے کے حامل ہونے اور اپنے روحانی فضائل کی بنا پر بڑے بڑے دولتمندوں کی صف میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے انہی خصائل کی وجہ سے بہت سے ثروتمندوں کی توجہ و احترام کا محور قرار پاتے ہیں۔ یہی حقیقت ملتوں پر بھی مکمل طور پر صادق آتی ہے۔ ایسی قوم کو غنی قرار دیا جاسکتا ہے جس میں دوسری اقوام سے زیادہ عظیم' باسعادت اور دانشمند انسان پائے جائیں۔

مادی اسباب میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ سعادت و آسائش کی سوغات بخش سکیں۔ لوگوں کی اکثر پریشانیاں زیادہ طلبی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ مال و دولت کے انبار پر بیٹھ کر بھی راحت و آسودگی سے تہیدست ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ممکن ہے خود مال و دولت شر و آفت کا سبب بن جائے، مغرور مالدار کے قلب کو سیاہ کردے، اسے آلودگی، رزالت اور گناہ کی راہ پر ڈال دے اور ویران گر سیلاب کی مانند اس کی سعادت کی بنیادوں کو تہس نہس کردے۔

مادّی اسباب آسائشات کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں بذاتِ خود آسائش نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مال ایک ایسی زنجیر ہے جس کی کڑیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ عاقل انسان اس کو کنٹرول کرلیتا ہے لیکن بے خرد اس کا اسیر ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ تصوّر کرتے ہیں کہ بے حساب دولت کے ذریعہ امن و سکون کی منزل پائی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ جتنا انسان مادّیات کے حصول کے لئے آگے بڑھتا ہے خود سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اس پُر پیچ و خم راہ پر اپنے پاک احساسات گُم کر بیٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات جب کوئی انسان مالی اعتبار سے اپنے دوستوں پر سبقت لے جاتا ہے تو غرور و نخوت اسے ان سے قطع تعلق پر مجبور کردیتی ہے۔

"اپیکٹاتوس" کہتا ہے کہ۔

"میرے دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ کیوں خوب مال نہیں بناتے تاکہ ہمیں بھی کچھ فائدہ ہو۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ کاش میں مال و دولت اور تمہاری محبت و وفا کو ایک ساتھ جمع کرسکوں۔ یعنی مالدار بھی ہوجاؤں اور تمہارا وفادار بھی رہوں، تم سے دوستی بھی برقرار رکھوں۔ لیکن افسوس کہ مال و دولت مجھے تمہاری مصاحبت سے محروم کردے گی۔ تمہارے دوست کا تہیدست، باوفا اور مہربان ہونا

اس سے بہتر ہے کہ وہ مالدار لیکن مغرور اور متکبّر ہو۔ پس تم کیوں اپنے مہربان دوست سے ہاتھ دھونا چاہتے ہو اور مجھے خود سے جدا کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔"

غرورِ علمی کے خطرات

بعض انسانوں میں پایا جانے والا غرورِ علمی بھی ان کی ترقی و پیشرفت اور کسبِ کمال کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس عارضہ کا شکار انسان خود کو اس قدر عالم و فاضل سمجھنے لگتا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عالم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غرورِ علمی سے دوچار اور اپنے آپ کو ایک استثنائی وجود سمجھنے والے اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی سطح معلومات انتہائی پست یا متوسط درجہ کی ہوتی ہے۔

جتنا انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اسے اپنی حقارت، جہل اور نادانی کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسا شخص جو اپنے مراتبِ علمی کے ذریعہ مراتبِ نادانی سے آشنا ہوتا ہے بہت زیادہ خود شناس ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقی دانشمند لوگ آسانی کے ساتھ غرور اور باطل تصوّرات کے دام میں نہیں آتے۔

راقم الحروف خود ایک ایسے فرد سے واقف ہے جو دوسروں کی معلومات اور قابلِ تحسین خدمات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یا انہیں شمار میں ہی نہیں لاتا۔ جب کہ اس کی اپنی معلومات اور تعلیم متوسط ہے اور شاید اس کا اپنا وجود انتہائی بے اہمیت ہو۔ جب کبھی کسی محفل میں دوسروں کے علم و فضل یا کارناموں کا تذکرہ آتا ہے اور حاضرین میں سے ہر ایک اس موضوع پر اپنے

خیالات بیان کرتا ہے تو یہ شخص تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان خیالات کی تائید میں گردن ہلانے پر اکتفا کرتا ہے اور جب یہ خود اپنے انتہائی معمولی کارنامے و اقدام کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو اس قدر گھن گرج کے ساتھ بولتا ہے کہ گویا اس سے بڑا کارنامہ کسی نے انجام ہی نہیں دیا ہے!

ایک مغربی دانشمند کہتا ہے کہ۔

"اگر ہم دنیا کو اس سے بہتر پہچانتے یا اپنی معلومات و مجہولات کا تقابل کرسکتے تو ہمارا عقیدہ کچھ اور ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری معلومات ان چیزوں کے مقابلہ میں انتہائی مختصر ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ ہم عناصر میں سے کون سے عنصر کے متعلق اچھی معلومات رکھتے ہیں اور اس کے تمام فوائد اور استعمال سے آشنا ہیں؟ نباتات و حیوانات میں سے کس کی تاریخِ حیات کو اوّل سے آخر تک جانتے ہیں؟

ہم ایسے مختلف عوامل و اشیاء کے درمیان زندگی بسر کررہے ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات صفر ہیں؟ ہماری آنکھوں کے سامنے صدیوں سے پڑے ہوئے پردے اب تک چاک نہیں ہوئے ہیں۔

قدرت کے عظیم مدرسہ میں اب تک ہماری حیثیت ابتدائی جماعت کے طالب علموں کی مانند ہے۔ بہت سی چیزوں کو ہم صرف دیکھتے ہیں ان کے اسرار و رموز سے بے خبر ہیں۔

دنیائے تفکر بے کنار سمندر کی مانند ہے۔ ایسا شخص جو کنارے پر کھڑا ہو کے اسکا نظارہ کررہا ہے اور ایسا شخص جو قدم لڑکھڑانے کی وجہ سے اس میں گر پڑے اور فضول اس میں ہاتھ پیر مار رہا ہو دونوں کسی مقام

پر نہیں پہنچتے۔

انسان کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹادے اور علم و معرفت کی راہ میں قدم بڑھائے لیکن اس راہ میں بڑھنے والا ہر قدم ہماری مشکلات میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔

ہماری معلومات دائرہ کے قطر کی طرح ہوتی ہیں اور مجہولات اس کے محیط کی مانند اگر دائرہ کے قطر کو لمبا کریں تو اس کا محیط اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوجاتا ہے۔ شاید ہماری آئندہ نسلیں ہم سے زیادہ اس راہ پر آگے بڑھیں اور اسرارِ کائنات کے نئے نئے حقائق کشف کریں۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ اپنے تمام تر غرور و خود پرستی کے باوجود زمین پر گھٹنے ٹیک کر اعتراف کریں کہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ دور کیوں جائیں ہم اب تک خود اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکے ہیں اور اس بات سے ناواقف ہیں کہ ہم کون ہیں اور طبیعت سے کیا ربط رکھتے ہیں۔ ہاں! ہم کچھ نہیں جانتے اور مجبور ہیں کہ ہر چیز کے سامنے ایک استفہامی علامت رکھدیں۔"

(در جستجوی خوش بختی۔ ص۵۸ اور ۲۱۹)

حقیقت کی جستجو اور کسی بھی مطلب کو سمجھنے کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان بحث و گفتگو کے دوران جدال و مناقشہ کی راہ اختیار نہ کرے لیکن خود پسندی کے شکار مغرور انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کی باتیں اپنے مفاد میں استعمال کرے۔ اس ناپسندیدہ رَوِش کو اختیار کرتے ہوئے وہ کٹ حجتی اور بحثا بحثی کرتا ہے۔ دراصل ایسے شخص کا مقصد حقیقت سے پردہ اٹھانا نہیں ہوتا

بلکہ وہ اس طریقے کو اختیار کر کے اپنی علمیت اور زبردستی کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔

خود شناسی کے مرتبہ تک رسائی کے لئے اوّلین ضرورت یہ ہے کہ حقائق کو صحیح طریقے سے پہچانیں اور ان کی صحت و درستی پر مکمل ایمان حاصل کریں۔ اس طرح ہم بہتر طور پر کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقائق کا علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہمارا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ایسے امور جن کی کم و کیف سے ہم آگاہ نہیں بلکہ جن کے متعلق ہماری معلومات اجمالی ہیں انہیں بغیر کسی پیچیدگی اور ابہام کے واضح طور پر درک کریں۔

تخریبی سرگرمیاں

غرور کے ضرر رساں آثار زندگی کے بہت سے شعبوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ ان آثار پر توجہ ہمیں روحانی عذاب کا سبب بننے والی اس بیماری کے خلاف سنجیدگی کے ساتھ جنگ پر آمادہ کرتی ہے۔

اگر باہمی بحث و گفتگو کے دوران غرور کی شدید اور مستقیم دخالت کا خاتمہ کردیا جائے تو بہت سے اختلافات اور جھگڑوں کا خود بخود ازالہ ہوجائے۔ کیونکہ لوگوں اور طبقات کے درمیان پائے جانے والے بے وجہ کے تنازعات کا اصل سبب ان کا غرور میں مبتلا ہوجانا ہوتا ہے اور اس طرح وہ خود اپنے اور دوسروں کے فائدہ کے بجائے نقصان کا سبب بن جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ باہمی افہام و تفہیم، صحیح منطق اور بے غرضی کے ساتھ مشکلات کا حل نکالنے سے عاجز رہتے ہیں۔

مغرور شخص کے دوسری ناپسندیدہ صفات مثلاً حسد، بخل اور بدبینی وغیرہ

میں مبتلا ہوجانے کا امکان رہتا ہے۔ ایسا شخص دوسروں کی ناکامی و نامرادی کا آرزو مند رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی کسی کام میں اپنے سے بہتر و لائق تر نظر آتا ہے تو اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حتیٰ ایسے موقع پر بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے جب کامران شخص اور اس کے میدانِ کار میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ احساس اس کے لئے اس قدر ناقابلِ برداشت اور دردناک ہوجاتا ہے کہ بتدریج اس پر دشمنی اور خصومت کے جذبات مسلّط کردیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تمام تر کوششوں کا محور اپنے رقیب پر کامیابی بن کے رہ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ زندگی میں اس کی تمام سرگرمیوں کا کوئی بامعنی ہدف نہیں رہتا بلکہ اس کا انتہائی نصب العین اپنے رقیب کی شکست ہوتا ہے۔

اس رویّہ کی بنا پر کیونکہ اس کے اکثر اعمال تخریبی ہوجاتے ہیں اس لئے اس کی جسمانی اور ذہنی توانائیاں فضول کاموں میں ضائع ہونے لگتی ہیں۔ جب بھی اور جس جگہ بھی اسے موقع ملتا ہے وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کی کوشش کرتا ہے۔

ایسا شخص دوسروں کے مقابل انکساری و فروتنی کے اظہار سے گریزاں رہتا ہے۔ حتیٰ اس کے اس افراط آمیز رویّہ کی بناء پر اس کے انتہائی اہم روابط اور محکم رشتے تک منقطع ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ لوگوں کے جذبات سے بے اعتنائی اور ان سے توہین آمیز و پُر تحقیر سلوک ان میں ردِّ عمل ایجاد کرتا ہے اور اس رویّہ کا حامل شخص خود لوگوں کی طرف سے تحقیر و اہانت کا مورد بن جاتا ہے۔ ہر انسان کے دل میں ایسے مغرور اور اوچھے لوگوں سے تنفر کا پایا جانا قدرتی بات ہے۔

مغرور دوسرے لوگوں کی حیثیت کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے محض اپنی خواہشات و تمایلات سے غرض رکھتا ہے۔ یہی یک طرفہ تمایل ایک طرف تو مغرور کی خواہشات کے درمیان شدید تضاد اور دوسری جانب اوروں کی طرف سے اس کے خلاف اہانت آمیز اور ناقابلِ برداشت بے اعتنائی کے برتاؤ پر منتہی ہوتی ہے اور وہ مجبور ہوتا ہے کہ شکست خوردہ روح اور پُرہیجان قلب کے ساتھ خلافِ توقع حوادث اور بے اعتنائیوں کو برداشت کرے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ۔

"میں نہیں کہتا کہ آپ اپنے مقام اور اہمیت کو جتلانے کے واسطے جھنڈے بلند کیجئے اور نقارے بجایئے تاکہ سب آپ کی طرف متوجہ ہوجائیں لیکن اگر آپ اس قدر انکساری اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں کہ اپنی راہوں میں پھول نچھاور نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم ایسے نہ ہوئیے کہ لوگ آپ پر پتھر برسائیں۔ آپ کیوں لوگوں کو اپنے نقائص کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔؟ لوگوں کے ساتھ دل پذیر سلوک و رفتار جو بے شک انسان کے باطن اور اس کے اچھے اخلاق سے وابستہ ہے نہ صرف خود اس کی اپنی زندگی میں مطلوب تاثیر کے حامل ہیں بلکہ لوگوں کے دلوں پر بھی گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ جو حقیقتاً نمایاں خصوصیات اور اخلاقی فضائل کے مالک ہوں وہ ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمہ کی مانند اپنے اقرباء کو سیراب کرتے ہیں۔ حقیقی ادب اور انکساری اس وقت صادر ہوتے ہیں جب انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مصنوعی طرزِ

عمل اختیار کرے گا تو گویا وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔ ہر شخص کا طرزِ تفکر اور باطن اس کے کردار و عمل سے جھلکتا ہے اور کسی بھی ذریعہ سے اسے چھپایا نہیں جاسکتا۔"

نفس کی سلامتی

زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ کبھی تو اس تلاش و کوشش کے نتیجہ میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوتی ہے اور کبھی نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگ جنہیں زندگی میں کامیابی نصیب ہوتی ہے ممکن ہے غرور و نخوت کا شکار ہوجائیں اور وہ افراد جنہیں بعض میدانوں میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑے اپنی شکست کو بدقسمتی، دوسروں کی کینہ توزی اور ان کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کردینے کا نتیجہ قرار دیں اور رنج و ناامیدی کا شکار ہوجائیں۔

ہر چند ناکامی و شکست تلخ و ناگوار ہے اور کامیابی دلنشین و خوبصورت لیکن کامیابی کے نتیجہ میں اپنی مہارت، عقل اور کاردانی پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اسی طرح ناکامی پر روح کو بے پایاں یاس و حسرت میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔

اگر ہم ہدف کے حصول کے موقع پر اور اسی مانند ناکامی کے وقت واقع بینی اور متانت کو اپنا شعار قرار دیں تو مذکورہ بالا دونوں قطب افراط و تفریط کی حدِّ وسط (یعنی سلامتیٔ نفس) حاصل کرلیں گے البتہ یاد رہے کہ اس حدِّ اعتدال کا حصول نفس کے خلاف نہایت سخت جہاد کا متقاضی ہے۔

کائنات کی دوسری تمام چیزوں کی مانند انسان کی نفسیاتی حیات کے تار و پود کی تشکیل بھی اس طرح ہوئی ہے کہ ان میں تحمل کی طاقت محدود ہوتی ہے۔

ممکن ہے محرومیوں اور ناکامیوں کے صدمات کا ردِ عمل عصیان و تخریب کی صورت میں ظاہر ہو۔

اپنی نفسیاتی ضروریات سے ناآگاہی اور خود اپنی شناخت کے سلسلہ میں دشواری ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ درحالانکہ کوتاہ فکر لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ خود کو پہچانتے ہیں اور اپنے تفکرات کے علل و اسباب' اپنے محرکات' اپنے اعمال اور بالآخر اپنے باطن سے آگاہ ہیں۔

غلط تشخیص' ظالمانہ فیصلوں اور سوء تفاہم کا سبب خودشناسی کے سلسلہ کے یہی نقائص ہیں۔

بالکل اسی طرح جیسے انسان سے متعلق فلسفہ کی قدیم تعلیمات میں خود شناسی کی تاکید کی گئی ہے عصرِ حاضر میں بھی کہ جو انسانی فطرت اور نفسیات کے بارے میں گہری اور دلچسپ تحقیقات کا دور ہے خودشناسی کے ابتدائی اصولوں کا سیکھنا نفسیاتی سلامتی کی اہم ترین بنیادوں میں شمار ہوتا ہے۔

انسانی نفس میں اچھی خصلتوں کی پرورش کے لئے لازم ہے کہ انسان نفسیاتی احتیاجات' اس نظام کے کام کرنے کے طریقہء کار اور نامطلوب احساسات سے آگاہ ہو جن میں سے ہر ایک کسی ردِ عمل کا نتیجہ اور باطنی اثرات میں سے ہے اور حتیٰ الامکان ایسے ہیجانات کے بارے میں مطلع ہو جو پیچیدہ منابع سے سرچشمہ لیتے ہیں تاکہ اس طریقہ سے گمراہ کرنے والی خواہشاتِ نفس اور حقیقی تمناؤں کے درمیان فرق کرسکے اور ان متواتر و مسلسل حملوں سے اپنا دفاع کرسکے جو اس کے نفس کی سلامتی کے لئے خطرہ ہیں۔ نیز اس بات سے محتاط رہے کہ ہر لحظہ موہوم سعادت و خوشبختی کی خاطر زندگی کی لگام فریب دینے

والے تخیلات کے سپرد نہ کرے۔

ایسے تمام لوگ جو نفسیاتی کمپلیکس میں مبتلا ہوتے ہیں یا ہمیشہ یاس و ناامیدی کی وحشتوں کے اسیر رہتے ہیں درحقیقت وہ لوگ ہیں جو اپنی اندرونی استعداد اور باطنی توانائیوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی شخصیت کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ ہمہ جانبہ کوششیں بروئے کار لائیں تاکہ ان کے ذریعہ اپنے نقائص کا ازالہ کرسکیں۔

بنیادی طور پر انسان اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے تقاضوں کی بنا پر ہر اس چیز سے آزردہ رہتا ہے جو اس کی خواہشات اور تمناؤں کے حصول کی راہ میں مانع ہو۔ نیز ہر ایسی معنوی و مادّی رکاوٹ کو جو اس کی آرزوؤں کی تکمیل میں حائل ہو یا اس کی خود مختاری میں مانع ہو سخت معیوب سمجھتا ہے۔ یہی رکاوٹیں تجاوز اور کینہ کا سبب بنتی ہیں۔

وقتی اور جلد گزر جانے والے میلانات اور شرربار خواہشات انتہائی آسانی کے ساتھ انسان کے سامنے چیزوں کو مشتبہ کرسکتے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ ہوا و ہوس کی پیروی سے اجتناب کریں۔

"ایاکم والھوی فان الھوی یعمی ویصم"

"ہوا و ہوس سے پرہیز کرو کیونکہ ہوس انسان کو اندھا و بہرہ بنا دیتی ہے۔" (نہج الفصاحہ - ص ۲۰۱)

اپنی کوتاہیوں پر عدم توجہ

اکثر اوقات غرور اور گھمنڈ کی بناء پر انسان اپنی کوتاہیوں' نقائص اور

محدودیتوں سے غافل اور اپنی توانائیوں سے ناواقف رہتا ہے۔ یہی بے اطلاعی اس کی شخصیت کے استقلال اور اس کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ نیز یہی ناواقفیت اس بات کا موجب ہے کہ انسان اپنے ان نقائص کی تلافی کی جانب متوجہ نہیں ہوتا حالانکہ ان میں سے بہت سے معمولی اصلاح کے محتاج ہوتے ہیں جو بہت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"الراضی عن نفسه مستور عنه عیبه ولو عرف فضل غیره کساه مابه من النقص والخسران"

"خودپسند انسان اپنے نقائص سے بے خبر رہتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کی برتری کا قائل ہوتا تو اپنے نقائص و معائب کی تلافی کرتا۔"

(غررالحکم۔ص ۹۵)

امیرالمومنینؑ خودپسند لوگوں کے غرور کا سبب ان میں عقل کا فقدان قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"رضاء العبد عن نفسه برهان سخافة عقله"

"کسی شخص کا غرور اور خودپسندی اس کے ضعفِ عقل کی دلیل ہے۔" (غررالحکم ص ۴۲۴)

"العجب یفسد العقل"

"خودپسندی عقل و خرد کو تباہ کردیتی ہے۔" (غررالحکم ص ۲۶)

معروف مغربی فلسفی "اسپنوزا" کہتا ہے کہ

"جو شخص خود اپنے بارے میں جہل کا شکار ہے وہ تمام فضائل کی بنیاد

سے بے خبر ہونے کی بنا پر کسی ایک بھی فضیلت سے آگاہ نہیں۔ فضیلت کے مطابق عمل دراصل عقل کے مطابق عمل ہے۔ جو شخص بھی عقل و خرد کی رہنمائی میں عمل انجام دیتا ہے اسے لازماً اس بات سے آگاہ ہونا چاہئے کہ اس نے عقل کو اپنا رہنما قرار دیا ہے۔

پس ایسا شخص جو خود اپنے بارے میں جاہل ہے اور اس کے نتیجہ میں جیساکہ ہم نے پہلے کہا کُلّی طور پر تمام فضائل سے بے خبر ہے کسی صورت فضیلت کے مطابق عمل انجام نہیں دے سکتا۔ یعنی مکمل طور پر کم عقلی کا شکار ہے۔ بنابرایں کہا جاسکتا ہے کہ غرور ضعفِ عقل کا بلند ترین درجہ ہے۔" (فلسفہ نظری، ص ۱۰۶)

ممکن ہے کہ بعض چیزیں جو ہمیں حقیقت نظر آتی ہوں واقعاً حقیقت نہ ہوں۔ عقل و خرد کی کسوٹی پر رکھ کر (کسی چیز کی) حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔

ایسے لوگ جن کی بینائی کمزور ہو وہ اس کی تلافی کے لئے عینک استعمال کرتے ہیں لیکن ایسا شخص جو ضعفِ عقل کا شکار ہو وہ اس کا ازالہ عینک کے ذریعہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس کے لئے اسے اپنے باطن پر توجہ دینا ہوگی، اپنے نفس کا تجزیہ و تحلیل کرنا ہوگا اور نہایت غور و احتیاط کے ساتھ اپنی حقیقی استعداد اور صلاحیتوں کو مضر خواہشات اور ہواء نفس سے جدا تمیز دینا ہوگا۔

بکثرت ایسے لوگ ہیں جو اپنی روحانی قوتوں کو اپنی ذاتی یا اجتماعی بہبود کے لئے کام میں لانے کی بجائے انہیں بے کار تلف کردیتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اندر پنہاں حیرت انگیز قوتوں اور اپنے باطن کی توانائی کے متعلق معمولی اور سطحی علم بھی نہیں رکھتے۔

اگر کوئی شخص اپنے نواقص و معائب سے آگاہ ہوجانے کے بعد بھی انہیں اہمیت نہ دے یا انہیں قابلِ اغماض و چشم پوشی شمار کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے ان نقائص کو اپنے وجود کالازمہ سمجھ لیا ہے۔

باطنی احوال کے بارے میں آگاہی وقت اور وقت کی متقاضی ہے۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کم وقت میں اپنی نفسیاتی خصوصیات، کمزوریوں اور نقائص سے واقفیت حاصل کرلے گا تو اس کا یہ تصوّر غلط ہے۔ اس لئے کہ خود شناسی اور بعض وحشتناک باطنی امور کا تابِ نظارہ روشن بینی اور نہایت شجاعت کا طالب ہے اور یہ حاصل نہیں ہوسکتی مگر بتدریج حوصلہ اور لازمی احتیاط کے ذریعہ لیکن باایں ہمہ انسان رذیلتوں کے خلاف ارادہ اور فکر کی قوت اور پیہم جدوجہد کے ذریعہ نمایاں کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من طلب عیباً وجده"

"جو شخص اپنے عیوب و نقائص تلاش کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔"

(غررالحکم۔ص ۲۱۴)

خودی اور خود پرستی

اسلام نے بشریت کو اس کی روحانی احتیاجات کی تسکین کے قابلِ اطمینان ترین طریقے عطا کئے ہیں اور انسانی فطرت کی تہذیب و اصلاح کے لئے جامع و ہمہ پہلو دساتیرِ عمل فراہم کئے ہیں۔ انسانی خواہشات کو حدِّ اعتدال میں رکھنے کے واسطے اسلام کے پیش کردہ ضوابط روح اور عقل کو جلا بخشتے ہیں اور انسان

کو حقیقتِ واقعی تک پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ اگر خواہشات و احساسات بے لگام ہوجائیں تو نہ صرف دوسروں کو نقصان پہنچانے کا موجب ہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ہیجان و طوفان بپا کردیتے ہیں اور یہ باطنی کشمکش آدمی کے سقوط و انحطاط پر منتہی ہوتی ہے۔

خودی کا شمار ان عوامل میں ہوتا ہے جو انسانی زندگی میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

خودی اور خود پرستی میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ خودی روح کی عظمت اور شخصیت کی وسعت کی علامت ہے اور آدمی کو انکساری و فداکاری پر آمادہ کرتی ہے جب کہ خود پرستی دائرہ فکر کو محدود اور انسانی طبع کو رذالت و پستی میں مبتلا کردیتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"اکبر الناس ضعة من تعاظم فی نفسه"

"جو شخص اپنے نفس کی عظمت و بزرگی کا قائل ہو اس کی عاجزی و انکساری سب سے زیادہ ہوتی ہے۔"

(غررالحکم۔ص ۱۹۵)

"جیگو" کہتا ہے کہ۔

"خود پرستی دوسروں کو اپنے ذاتی مقاصد و مفادات کے حصول کے لئے قربان کردینے کا نام ہے۔ جب کہ خودی ایک ایسی روحانی کیفیت کا نام ہے جو شخصیت کی تعمیر اور اسے پروان چڑھانے کے ارادہ سے پہچانی جاسکتی ہے۔ خود پرستی اپنے ہمراہ ہمیشہ ایک ضعف لئے ہوتی

ہے جب کہ خودی غیر معمولی قوّت ہوتی ہے۔ اگر آپ اس بات کا عزمِ صمیم کئے ہوئے ہیں کہ دوسروں کے ارادے کو خود پر مسلّط نہ ہونے دیں گے اور دوسروں کا یہ تسلّط آپ کی تندرستی، قوّت، کامیابی اور نفوذ کے خلاف ہے تو آپ "خودی" کے حامل انسان کہلائیں گے۔

لیکن اس گفتگو سے یہ نتیجہ نہیں لینا چاہئے کہ آپ دوسروں کی زبونی وسیاہ بختی کو دیکھ کر کوئی تاثر ظاہر نہ کیجئے۔ بلکہ ہماری نصیحت صرف یہ ہے کہ اپنی قوتوں کو ہزارہا مختلف جہتوں میں صرف کرنے کی بجائے انہیں موافق مواقع کے لئے ذخیرہ رکھئے۔

"خودی" ایثار و فداکاری کے خاتمہ کا سبب نہیں ہوتی بلکہ اسے ایک معیّن قاعدہ کے تحت کردیتی ہے اور انسان نہایت میل و رغبت کے ساتھ اپنے کسی دوست کو خوش کرنے یا کسی محتاج کی دستگیری کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔

اخلاقی نکتہ نظر سے اگر کوئی مشکلات کے دوران اعصابی سکون کھودیتا ہو تو ایسے شخص کو ناتوانوں سے علیحدہ ہوکر طاقتوروں کے گروہ میں آجانا چاہیئے۔ وگرنہ اسے بہت جلد اپنے اندر ضعف و ناتوانی کا احساس ہونے لگے گا اور یہیں سے انسان میں کم ہمتی اور سستی کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسروں کی احتیاجات کو رفع کرنا ہرایک کے فرائض میں شامل ہے۔

دوسری طرف خودی اور خودگزشتگی کو ماپنے کا سادہ ترین طریقہ یہ ہے

کہ دیکھا جائے کہ انسان اپنے اور دوسروں کے لئے کس قدر جدوجہد کرتا ہے۔

بے شک اگر ایک ملّت کے افراد اپنی شخصیت کو پروان چڑھانا چاہیں تو بہت جلد انتہائی درجہ اعتدال کو پالیں گے۔ بنابرایں روح کی تربیت سے بڑھ کر کوئی بات معقول نہیں۔ خودی خود گزشتگی کو انتہائی عروج پر پہنچانے کا موجب ہے۔ درحقیقت اخلاقی دیانت روحانی اعتدال کا نتیجہ ہے۔" (قدرتِ ارادہ، ص۷۱-۷۰)

اسلام اس قوی اور محکم بنیادوں پر استوار محرّک کی مصلحت و تقاضوں کی خاطر انسان کے لئے تمام راستے کھولتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ خودی کی جانب میلان و رغبت کا اہتمام کرتا ہے۔

اسلام کی نظر میں مطلوب و پسندیدہ حبِ نفس و خود خواہی وہ ہے جو راہِ مستقیم پر قائم اور ہر قسم کے انحراف و کج روی سے دور ہو۔ ایسی راہ پر گامزن ہو جس کی منزل خوش بختی اور سعادتِ جاویدانی ہو۔ ایسا مسلمان جس نے کھلے ذہن اور روشن بینی کے ذریعہ حقیقت کو پہچان لیا ہو کسی صورت ہیشگی اور جاویدانی کی منزل ترک کرکے جلد فنا ہوجانے والی لذّتوں کے انتخاب پر راضی نہ ہوگا۔

اسے اپنے آپ سے محبت و دوستی نہیں کہا جاسکتا کہ انسان پست اور مخرّب خواہشات اور ذلّت و خواری کے سامنے سرِتسلیم خم کردے اور خود کو ابدی عذاب اور دردناک عقاب میں مبتلا کرلے۔ اس قسم کی خودخواہی کا حامل شخص بشریّت کے اعلیٰ مدارج کا سزاوار نہیں۔

حقیقی و جاویدان عشق

اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنی حیات کے دوران عشق و محبت کے مختلف درجات طے کرے اور ان مراتب کو حاصل کرکے اپنی لیاقت و شائستگی کا ثبوت دے۔

سب سے پہلے اسلام انسانی روح کو عشق و محبتِ الٰہی سے سرشار کرتا ہے اور انسانوں کو سبق دیتا ہے کہ خداوندِ عالم سے عشق کو ہر دوسری محبت پر ترجیح دیں۔ وہ خدا جس نے اسے زندگی کی تمام نعمات، صلاحیتیں اور امتیازات عطا کئے ہیں، اگر ان الطاف و اکرام کو ملحوظ رکھا جائے تو ذاتِ احدیت کے سوا کوئی اس بات کا سزاوار نہیں کہ اس کے سامنے خلوص و محبت کا اظہار کیا جائے۔

پھر اسلام معاشرہ کے تمام افراد کو باہمی میل و محبت کی تاکید کرتا ہے۔ نصیحت کرتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں خداوندِ عالم نے ایک ہستی سے پیدا کیا ہے ان پر لازم ہے کہ ایک دوسرے سے محبت و الفت کا سلوک کریں، ایک دوسرے پر لطف و مہر کے پاکیزہ جذبات نچھاور کریں۔ کیونکہ سب انسان خلقت اور مشترک مصالح کی بنیاد پر آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس حقِ برادری کی دلپذیر انداز میں تاکید کرکے ان کے باطن و ضمیر میں جنبش و حرکت ایجاد کرتا ہے۔ اس طرح انسان کے اندر ایک ہم آہنگ اور متوازن حبِ ذات پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد انسان کسی صورت اس بارے میں افراط کا شکار نہیں ہوتا۔

بزرگی و کبریائی خداوندِ عالم کی ذات سے مخصوص ہے جو بے نیاز ہے اور

تمام موجودات ہر جہت سے اس کی نیازمند ہیں۔

"یا ایھاالناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھوالغنی الحمید"

"انسانوں تم سب اللہ کی بارگاہ کے فقیر ہو اور اللہ صاحبِ دولت اور قابلِ حمد و ثناء ہے۔" (سورۂ فاطر ۳۵ آیت ۱۵)

آسمانی تعلیمات سے انحراف اور روگردانی کے نتیجہ میں انسان غرور و نخوت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرانِ کریم اپنے ایک خطاب میں مغرور کو اس کی حقارت اور پستی کی جانب متوجہ کرتا ہے اور اس کی پُرنخوت روح کو بے بنیاد خیالات کی بلندیوں سے نیچے اتارتا ہے۔

"ولا تمش فی الارض مرحاً انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا"

"اور روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کہ نہ تو تم زمین کو شق کر سکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچ سکتے ہو۔"

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۷)

جس شخص کے دل میں خدا سمایا ہوا ہو اس پر نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود غرور مسلط نہیں ہوتا کیونکہ اسلام انکساری اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے اور متکبرانہ طرزِ عمل کو ناپسند کرتا ہے۔

"ولا تصعر خدک للناس ولا تمش فی الارض مرحاً ان اللہ لا یحب کل مختال فخور"

"اور خبردار لوگوں کے سامنے اکڑ کر منہ نہ پھلا لینا اور زمین پر غرور

کے ساتھ نہ چلنا کہ خدا اکڑنے والے اور مغرور کو پسند نہیں کرتا۔" (سورۂ لقمان ۳۱-آیت ۱۸)

بَرتری کا ایک خاص احساس

ایک سچّا مسلمان دنیوی کامیابیوں اور خوشی و آسائش میسّر ہونے پر احساسِ برتری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ بلکہ جس لمحہ ایمان اس کے قلب میں گھر کرتا ہے وہ لمحہ اس کے لئے فخر و ناز کا باعث ہوتا ہے۔ انسانوں کی بنائی ہوئی جھوٹی اقدار اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کرپاتیں۔ اسے زندگی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے۔ آزاد روح اور روشن عقل اس کے اندر ایک ایسا توازن قائم کردیتی ہے جس کی بدولت وہ پست مادّی سطح سے بلند ہوجاتا ہے اور عالمِ مادّہ سے استفادہ کی خاطر دنیوی لذّتوں میں غرق نہیں ہوتا۔

یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک بندۂ مومن کی روح و ادراک پر مادیات غالب آجائیں۔ وہ کسی غیر کے آستانے پر سر نہیں ٹیکتا۔ ہر ایسی ذلّت و پستی سے جو اس کی شخصیت کے تنزل اور زوال کا باعث ہو اجتناب برتتا ہے۔ وہ صرف بارگاہِ الٰہی میں خضوع و خشوع کا اظہار کرتا ہے۔

خداوندِ عالم صاحبانِ ایمان کو نصیحت کرتا ہے کہ تمام مراحل حیات میں اپنی اس صفت کی حفاظت کریں۔

"وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین"

"اگر تم صاحبانِ ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔"

(سورہ آل عمران ۳- آیت ۱۳۹)

"ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثله و تلک الایام نداولها بین الناس"

"اگر تمہیں کوئی تکلیف چھولیتی ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسی ہی تکلیف ہوچکی ہے اور ہم تو زمانے کو لوگوں کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔" (سورۂ آلِ عمران ۳-آیت ۱۴۰)

قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو اس بَرتری کی جانب اس وقت متوجہ کیا جب انہیں جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور دشمن کامیاب ہوا تھا۔ کیونکہ اہلِ ایمان کو بَرتری خداوندِ عالم پر ایمان رکھنے کی بناء پر حاصل ہے دشمن پر فتح و کامیابی اس بَرتری کا پیمانہ نہیں لہٰذا شکست کے موقع پر بھی یہ بَرتری ہاتھ سے نہیں جاتی۔

مسلمانوں کو اس بناء پر دوسروں سے فوقیت حاصل ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایمان ہی بشریّت کا اعلیٰ ترین سرمایہ ہے۔ اور اسی جوشِ ایمانی کی بناء پر مردِ مسلمان خود کو تمام مادّی زنجیروں سے آزاد تصوّر کرتا ہے۔ یہ معرفت صرف اور صرف قرآنِ کریم اور سنّتِ پیغمبرؐ کی رہنمائی کا نتیجہ ہے۔

غرور و خودپسندی ترقی و تکامل کے لئے سدِّ راہ اور مانع ہے۔ مغرور کو اپنے عمل سے حاصل ہونے والا سکون اسی طرح اس کی عقب ماندگی اور رکود کا سبب بن جاتا ہے جس طرح اپنی کارکردگی پر عدمِ اطمینان ترقی و روز افزوں کمال کی جانب سفر کا پیش خیمہ ہے۔

امیرالمومنینؑ اس دلچسپ نکتہ کو دو مختصر جملوں میں یوں بیان فرماتے ہیں کہ۔

”الاعجاب یمنع الازدیاد“

”غرور و نخوت ترقی و تکامل میں مانع ہے۔“

(نہج البلاغہ فیض۔ص ۱۱۵۷)

”من انف من عمله اضطره ذلک الی عمل خیر منه“

”جو شخص اپنے عمل کو پسند کرتا ہے تو یہ بات اس کے لئے مزید بہتر کاموں کی جانب اقدام کا محرک بنتی ہے۔“(غرر الحکم ص ۲۶۸)

نیز فرماتے ہیں کہ۔

”من اعجب بحسن حالته قصر عن حسن حلیته“

”جو کوئی بھی اپنی (موجودہ) حالت کے بارے میں غرور و نخوت کا شکار ہو جائے ہرگز اپنی اصلاح میں کامیاب نہ ہو گا۔“(غرر الحکم ص ۶۸۷)

معروف محقق ”ولیم جان ریلی“ لکھتا ہے کہ۔

”میں نے دریافت کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے ذہن میں پائے جانے والے بعض مزاحم و مضر افکار و خیالات‘ ایسے ایسے افکار و خیالات جو میری بے اطمینانی اور غم و اندوہ کا سبب ہیں اور دوسرے بہت سے خیالات سے بڑھ کر میرے لئے باعثِ عذاب ہیں وہ ان خیالات میں سے ہیں جو میں خود اپنے بارے میں رکھتا ہوں۔

ہم اس بات کو کس طرح درک کرسکتے ہیں؟—— مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی آواز کے بارے میں اپنے خیالات بیان کروں۔

کیونکہ اکثر لوگوں کو اپنی آوز پسند ہوتی ہے۔ میں بھی محض اپنی

دلنشین آواز سے مطمئن و مسرور تھا۔ میں نے مجمع عام میں بکثرت مواقع پر تقریریں کی ہیں حتیٰ اسی میدان میں اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے سونے کا ایک میڈل بھی حاصل کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری آواز خوبصورت اور متوازن ہے۔

ایک روز میں نے اپنی تقریر کا ایک کیسٹ حاصل کیا جو میں نے کسی موضوع پر ریڈیو کے لئے ریکارڈ کروائی تھی تاکہ دوسروں کی طرح میں بھی اسے سن کر دیکھوں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایک سامع کی حیثیت سے اپنی تقریر سن رہا تھا۔ خدا برا دن نہ دکھائے‘ میں اپنی آواز سن کے دنگ رہ گیا‘ مبہوت ہو گیا‘ میری آواز میری توقع سے کہیں زیادہ غیر معیاری تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں ہلکے ہلکے رو رہا ہوں۔ میں نہایت غیر متوازن‘ بے رنگ اور گوش خراش آواز میں بول رہا تھا۔

جس وقت میں یہ کیسٹ سن رہا تھا تو کئی اور افراد بھی میرے ساتھ موجود تھے‘ مجھے بہت خجالت محسوس ہوئی اور اس کو مٹانے کے واسطے میں ان کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے لگا کہ دراصل یہ تقریر ریکارڈ کراتے وقت میری طبیعت ناساز تھی اور اس وقت میں صدا بندی کے فن سے بھی واقف نہ تھا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے میرا دھیان اس طرف نہ گیا کہ دوسرے کیسٹوں میں بھی تو میری یہی آواز موجود ہے (اگر ان لوگوں نے وہ کیسٹ سن لئے تو کیا کہیں گے؟؟؟)

اس کے بعد میں نے اپنی تمام تقاریر کے کیسٹ سنے اور بالآخر مجھے

اس بات کو قبول کرنا پڑا کہ برسوں سے اپنی آواز کے متعلق قائم میرا عقیدہ خوش فہمی پر مبنی تھا۔ پھر میں نے پہلی مرتبہ اپنی خود پسندی کو ایک طرف رکھا اور اپنی آواز کو متوازن بنانے کی خاطر محنت شروع کردی۔ اس دوران جب بھی مجھ پر مایوسی طاری ہوتی فوراً "موستن" کا خیال ذہن میں لے آتا کہ اس نے کیا کیا تھا؟ اب تک میری یہ مشق جاری ہے۔

اپنی آواز کے تجربہ کے اس مسئلہ نے مجھے ایک سبق دیا اور وہ یہ کہ مجھے اپنی اصلاح کے لئے وسیع پیمانے پر کوشش کرنی چاہئے اور جب تک میں اس نقص کی خفت قبول کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کرلوں اپنی اصلاح، ترقی اور پیشرفت کا آغاز نہیں کرسکتا۔

غرور اور خود پسندی کا خاتمہ انسان کو واقع بینی اور حقیقت تک پہنچاتا ہے اور اس کی ترقی و پیش رفت کا باعث ہوتا ہے۔ صرف اس وقت اصلاح اور ترقی کا یہ عمل انجام پاسکتا ہے جب ہم حقائق کی جانب متوجہ ہوں اور اپنے بارے میں بے بنیاد افکار و خیالات سے چھٹکارا حاصل کریں ورگرنہ جہل اور تاریکی میں پڑے رہ جائیں گے اور اپنی ذات کی اصلاح و ترقی سے عاجز رہیں گے۔" (تفکرِ صحیح، ص ۵۰-۵۳)

مغرور اپنے ذہنی اختلال کی وجہ سے بسا اوقات ایسی خوبیوں کو خود سے منسوب کرتا ہے جو درحقیقت اس میں موجود ہی نہیں ہوتیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من اعجب بنفسه و فعله فقد ضل عن نهج

الرشد وادعی مالیس فیہ"

"جو شخص اپنی ذات اور کارکردگی کے مسئلہ میں غرور کا شکار ہوجائے وہ ترقی و کمال کی راہ سے بھٹک جائے گا اور ایسی چیز کا دعویٰ کرے گا جو اس میں موجود نہیں۔" (سفینۃ البحار، ج ۲ ص ۱۶۱)

خود پرست مغرور ابریشم کے کیڑے کی مانند ایسے تاروں کے درمیان محصور ہوتا ہے جو اس نے توہّم کی قوت سے اپنے گرد لپیٹ لئے ہیں اور "من" کے نشے میں اس قدر سرشار ہے کہ اپنے وجود کو کائنات کا محور سمجھتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"سکر الغفلة والغرورا بعد افاقة من سکر الخمور"

"غرور و غفلت کے نشے میں مست لوگ شراب کے نشے میں چور لوگوں سے بھی زیادہ دیر میں ہوش میں آتے ہیں۔"

(غررالحکم۔ ص ۴۴۰)

گیارھواں باب

قوّتِ ارادی کے کرشمے

مردانِ تاریخ کے کارنامے

نابغہ روزگار ہستیوں نے انسانی تاریخ کے تاریک ایام کو اپنے نور سے منوّر کیا۔ ستاروں کی مانند درخشاں ان ہستیوں کے کارنامے آج بھی تاریخ کے سنہری اوراق پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان مردانِ تاریخ نے اپنی روحانی صفات اور نمایاں خصوصیات کی بدولت تاریخِ انسانی میں عظیم تغیّرات رونما کئے اپنے کارناموں کی جُلائی ہوئی مشعلوں سے دنیا کو روشن کردیا۔

کبھی کبھی تو ان شخصیات کے بپا کردہ انقلاب کی روشنی نے پورے عالمِ انسانیت کو منوّر کردیا اور انسانی فکر میں ایک عظیم تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

درحقیقت یہی درخشاں چہرے ہیں جنہوں نے دنیا کی صورت بدل کر رکھ دی یہاں تک کہ ناتواں وضعیف لوگوں کو بھی قوّت و حوصلہ عطا کیا۔

ان حضرات کے برعکس دنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جن کی سرگرمیاں اور فعالیت نہایت محدود و مختصر رہتی ہے۔ جو اپنی پوری زندگی گمنامی میں گزار کربالآخر موت سے ہم آغوش ہوجاتے ہیں۔

ان دونوں طرح کی شخصیات کے درمیان تفاوت کی بنیاد ان کے باطن میں

تلاش کرنی چاہیے۔ کیونکہ شخصیتوں کے درمیان فرق کا تعلق روح کی وسعت یا محدودیت اور انسان کی باطنی قوتوں کے پیمانے سے ہے۔

آیئے جائزہ لیں کہ دنیا میں رونما ہونے والے حوادث و واقعات اور شخصیات کے درمیان کیا ارتباط پایا جاتا ہے۔ کیا حوادث و انقلابات شخصیتوں کو جنم دیتے ہیں، یا ممتاز شخصیات انقلاب آفریں ہوتی ہیں؟

تجربہ سے ثابت ہے کہ معاشرہ فرد پر اور فرد معاشرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ باعبارت دیگر ماحول انسان کے لئے اور انسان ماحول کے واسطے موثر ہے۔ معاشرہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے فرد کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ فرد ہی ہوتا ہے جو ماحول میں تغیّر لاتا ہے اور سماج کا چہرہ بدل کے رکھ دیتا ہے۔

سماجی و سیاسی انقلابات کا بنیادی عامل "ارادہ" ہے۔ خواہ یہ ارادہ فرد کا ہو یا اجتماع کا۔ لیکن فرد کی اہمیت اجتماع سے زیادہ ہے۔ کیونکہ فرد کی رہنمائی ہی میں اقوام سعادت بخش اور مطلوب ہدف کی جانب سفر کرتی ہیں اور سماج ایک تابندہ مستقبل سے ہمکنار ہوتا ہے۔

دستِ قدرت نے عقل کے فیصلوں کو جامہ عمل پہنانے کی خاطر ہمارے اندر "ارادہ" کی قوّت رکھی ہے۔ انسانی ارادہ وہ نقطہ ہے جسے ایک طرف سے لذائذ وخواہشات اپنی جانب جذب کرتے ہوئے اور دوسری طرف سے عقل و خرد اپنی کشش کے زور پر حدِّ اعتدال میں رکھتے ہیں۔ ضعفِ "ارادہ" ان دونوں کششوں کے عدمِ توازن کا نتیجہ ہے۔

ارادہ کی ناتوانی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان مکمل طور پر عزم و ارادہ کی قوّت سے عاری ہے بلکہ وہ اس بات پر مختار ہونے کے باوجود کہ حسبِ منشا کام

کرے اپنے ارادوں کو جامۂ عمل پہنانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی باطنی قوتوں میں کوئی نقص نہیں۔ نیز بہت وسیع امکانات بھی رکھتے ہیں لیکن بیش بہا مواقع اور استعداد رکھنے کے باوجود ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کرپاتے۔ گو زندگی کے اعلیٰ مقاصد پر ان کی نگاہیں ہوتی ہیں لیکن ترقی کا زینہ طے کرنے کے لئے لازمی قوتِ ارادی سے محروم ہوتے ہیں۔ گویا اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ سخت و پُر مشقت کام ان کے لئے کوئی اور انجام دے جو ارتقاء و بلندی پر پہنچنے کے وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے خود ہاتھ پاؤں نہ ماریں گے، خود فداکاری کا مظاہرہ نہ کریں گے تو پھر وہ آخر کس طرح اپنی آرزوؤں کی تکمیل چاہتے ہیں؟

کتنے ہی لوگ ہیں جو بے عیب اور مفید منصوبے بناتے ہیں لیکن انہیں اس کا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا، ذہن میں کیسے کیسے عظیم اور عملی پروگرام ترتیب دیتے ہیں لیکن ان کے اجراء سے قاصر رہتے ہیں۔

ارادے کی کمزوری ناکامی کا سبب ہے

ارادہ کی سستی زندگی کے مختلف میدانوں میں انسان کی یقینی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔ استعداد اور نبوغ دونوں میں سے کوئی بھی چیز محکم ارادہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اگر انسان استعداد کا حامل بھی ہو اور وسائل و ذرائع بھی رکھتا ہو لیکن انہیں ہدفِ مطلوب کی راہ میں استعمال نہ کرے تو ان چیزوں کی موجودگی کا کیا فائدہ؟

علم و دانش اس وقت تک کسی کام کے نہیں جب تک انسان اس سرمایہ کو ارادہ کی مدد کے ذریعہ ہدف کے حصول کی راہ میں کام میں نہ لائے۔ غور کیجئے اگر نوعِ انسانی عزم و ارادہ کی دولت سے تہیدست ہوتی تو اس کا کیا حال ہوتا؟ کرۂ ارض کی کیا شکل ہوتی؟ ترقی و تکامل کے قانون کا کیا بنتا؟

تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح و روشن ہے کہ انسان کے تمام انکشافات و ایجادات ایسے افراد کی قوتِ ارادی کے مرہونِ منت ہیں جنہوں نے انتھک جدوجہد اور عزمِ راسخ کے ساتھ موانع و مشکلات کو اپنے قدموں تلے روند کر نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

جب "نپولین" نے خطرناک اور دشوار گزار پہاڑ "سن برنارڈ" عبور کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں اپنے فوجی ماہرین سے مشورہ طلب کیا تو گہری سوچ بچار کے بعد سب ہی نے گھاٹی عبور کرنے کے نہایت ضعیف امکان کا اظہار کیا۔ ان کے اس خیال کے باوجود نپولین ایک عزمِ راسخ کے ساتھ اٹھا اور اپنی فوج کو وقت ضائع کئے بغیر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

جب انگلستان اور آسٹریلیا والوں کو فرانسیسی سپہ سالار کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے اسے ایک جنونی اور بے سوچے سمجھے اقدام سے تعبیر کیا۔ کیونکہ انہیں فوجی ساز و سامان، ساٹھ ہزار سپاہیوں اور بھاری توپخانہ کے ساتھ ان سر بفلک چوٹیوں کو عبور کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ جب یہ کٹھن اور نہایت خطرناک مہم کامیابی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچی اور "نپولین" اپنے لشکر کے ساتھ ان بلند چوٹیوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ایک گروہ نے اظہارِ خیال کیا کہ یہ کام کوئی خاص دشوار نہ تھا، بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ اگر

اس سے پہلے ہمیں موقع ملتا تو بے شک ہم بھی کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔

یقیناً اور دوسرے سپاہ سالار بھی نپولین کی مانند اس حیرت انگیز کارنامے کو انجام دینے کی قوت و استعداد رکھتے تھے لیکن ان میں "قوتِ ارادی" کا فقدان تھا۔ خوف و ہراس اور تذبذب کی بنا پر وہ مناسب موقع سے استفادہ نہ کرسکے اور بجائے آگے بڑھنے کے عقب نشینی پر مجبور ہوگئے۔ عزم بالجزم اور سریع اقدامات کی وجہ سے نپولین عظیم الشان کارنامے انجام دینے میں کامیاب ہوا۔

"نپولین" کے واقف کار لوگ اس کے روز مرّہ کاموں کا حجم دیکھ کر مبہوت رہ جاتے تھے۔ اس میں تھکے ماندے بے حال سپاہیوں میں جوشِ عمل اور ولولہ تازہ پیدا کردینے کی صلاحیت تھی، بزدل ترین افراد میں روحِ شجاعت دوڑا دیتا تھا۔ بسا اوقات تو رات رات بھر جاگ کر موصولہ رپورٹوں کا جائزہ لیتا اور خطوط کے جوابات تحریر کرتا۔

کامیابی کسی لگے بندھے فارمولے پر عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ معیّن ہدف کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ایسے ہی لوگ صفِ اوّل میں قدم رکھ پاتے ہیں اور موانع و مشکلات کو عبور کرتے ہیں جن کی "قوتِ ارادی" مضبوط ہو اور تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبراتے ہوں بلکہ اسے اونچی اڑان کے لئے وسیلہ سمجھتے ہوں۔ ایسے لوگوں پر کیسی ہی مصیبتیں آپڑیں یہ اپنے ارادوں سے باز نہیں رہتے، ان کی نظر میں شکست کامیابی کے ایک زینہ کی حیثیت رکھتی ہے، مشکلات و شدائد میں ان کی روح پروان چڑھتی ہے، ایسے ہی لوگ عمر کے خواہ کسی بھی مرحلہ میں ہوں عالم میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کرسکتے ہیں۔

مشکلات بیدار کرتی ہیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افراد جب تک دشواریوں اور کٹھن حالات سے دوچار نہ ہوں ان میں خفتہ صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ ایسا پودہ جو سخت پتھروں کے درمیان پروان چڑھا ہو اور جس نے نامساعد حالات سے سخت مقابلہ کے بعد مضبوط درخت کا روپ دھارا ہو وہ تباہ کن طوفانوں کے سامنے بھی ایستادہ رہتا ہے۔

ایک ماہرِ نفسیات کے بقول۔

"جوانوں کو یہ سبق دینا چاہئے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے صاف ستھرے اور ہموار راستہ کی توقع نہ رکھیں۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو مایوس کردینے والی مشکلات جھیلے بغیر کسی مقام پر پہنچے ہوں۔ جب بھی ہم صحیح طریقے سے مشکلات کا مقابلہ کریں گے تو نہ صرف یہ کہ مشکلات ختم ہوجائیں گی بلکہ ہماری ترقی و پیشرفت میں ممدو معاون ثابت ہوں گی۔ کوئی مشق مشکلات پر قابو پانے کی کوششوں سے بڑھ کر مفید نہیں۔"

نفسیات دانوں نے ثابت کیا ہے کہ محض پینتیس فی صد افراد اپنی عمر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ ایسے لوگ جن کی سرگرمیاں قابلِ دید ہیں اور جو معاشرہ میں قابلِ توجہ مقام حاصل کرپاتے ہیں انہوں نے بھی اپنی زندگی کے صرف پچاس فیصد حصّے سے استفادہ کیا ہوتا ہے۔

بعض افراد کی زندگی میں ترقی کے ایک خاص درجہ پر پہنچ کر ٹھہراؤ آجاتا

ہے۔ وہ اپنی سرگرمیوں میں مزید وسعت دینے سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسے لوگ انسانی قدر و قیمت کے اضافہ میں بنیادی کردار ادا کرنے والی خصوصیات سے بہت کم بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ ترقی و پیشرفت کے سلسلہ میں ان کی لیاقت محدود ہوتی ہے۔

تعالی و ترقی کے لئے انسان کا سب سے گرانمایا سرمایہ قوتِ ارادی ہے‘ انسان چاہے تو اس سرمائے سے ہاتھ دھولے اور چاہے تو اس میں مزید اضافہ کرلے۔

انسان کا ہر اقدام اس کے افکار و خیالات اور عزم و ارادہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر افکار و ارادہ بے اہمیت اور سبک ہوں تو حاصلِ کار بھی ناقابلِ توجہ اور بے قیمت ہوگا۔

ارادہ کی سستی کا شکار لوگ اپنے عزم و ارادہ کے سلسلے میں اس قدر متذبذب ہوتے ہیں کہ دوسروں کی جانب سے معمولی سی نکتہ چینی سنتے ہی اپنا ارادہ بدل ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ہمیشہ اپنے خیالات کے بارے میں شک و تردید اور دودلی میں مبتلا رہتے ہیں اپنی ذات کے آپ مالک نہیں ہوتے‘ ہر حال میں دوسروں کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں اور سوکھے پتوں کی مانند ہوا کے دوش پر سوار رہتے ہیں۔ قوّتِ ارادی میں ضعف اور شک و شبہ شکست و ناکامی کے مترادف ہے۔

ایسے لوگ جو اپنے وقت کو جزئیات اور بے اہمیت موضوعات کی موشگافیوں میں تلف کردیتے ہیں نیز کوئی اقدام کئے بغیر محض اپنی مشکلات کے تجزیہ و تحلیل میں مصروف رہتے ہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی

صلاحیتوں کو زنگ لگنے لگتا ہے اور کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوپاتے۔

کتنا ہی قیمتی وقت اور گرانبہا صلاحیتیں ان بہانے بازیوں اور تذبذب کی بناء پر نابود ہوجاتی ہیں اور ایک کامیاب زندگی کو ناکام و نامراد زندگی میں بدل ڈالتی ہیں۔

جب انسان ایسی بے ہودہ اور فضول چیزوں کے زیرِ تسلط آجائے تو وہ کیونکر زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرسکتا ہے؟

اب ذرا مذکورہ بالا صورتِ حال کے برعکس ذہن میں لائیے۔ ایسا شخص جسکے خیالات پختہ ہوں اور جو محکم عزم و ارادہ کا مالک ہو وہ کبھی موافق اور سازگار حالات کے انتظار میں اپنا وقت نہیں گنواتا۔ بلکہ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے نکتہ چینی کرنے والوں کے اعتراضات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مسلسل اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی جاری رکھتا ہے اور کوئی عامل اسے اپنی سوچی سمجھی راہ سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ایسا شخص اپنے ذہن میں آنے والے ہر مخالف خیال کو دوٗر جھٹک پھینکتا ہے۔ اسے دیکھ کر باآسانی کہا جاسکتا ہے کہ یہ آہنی ارادے کا مالک شخص ہے۔

مختصر یہ کہ عزم بالجزم کے بغیر کامیابی کا حصول ممکن نہیں کیونکہ کامیابی کا یقین کامیابی پالینے کے مترادف ہے اور کامیابی انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو اس کے حصول کے متمنی ہوں۔

بہت سے ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو عزم و ارادہ کی کمی کے باعث کاموں کو ادھورا چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں کسی کام میں فائدہ نظر آئے تو ایک مدّت تک ذوق و شوق سے اس کام میں مشغول رہتے ہیں لیکن

جوں ہی انہیں اس کام میں دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے ان کا سارا ذوق و شوق جاتا رہتا ہے۔ سرد مہری طاری ہوجاتی ہے اور پھر فوراً کسی ایسے کام میں کود پڑتے ہیں جس میں اس وقت انہیں دوسرے لوگ کامیاب نظر آرہے ہوں۔

اس طرح یہ لوگ ساری عمر تردد و تزلزل میں گزار دیتے ہیں، کبھی یکسوئی کے ساتھ ایک کام انجام نہیں دیتے بلکہ ہمیشہ اپنا کام اور پیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ پیشہ کے انتخاب کے موقع پر عقل و خرد اور قوتِ فیصلہ کو کام میں نہیں لاتے۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان پر دوسروں کی کامیابی کا راز منکشف ہوگا اور وہ زندگی میں اپنے کئے ہوئے کاموں کے نتائج کا جائزہ لے سکیں گے۔ جب ان کی عمر ڈھلنے لگتی ہے تو یک بیک انہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی پیشہ اختیار کرنے اور اسے ترک کرنے میں گزار دی ہے۔

ارادہ کی سستی کے حامل شخص کی ایک مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہوا و ہوس کی دستبرد کا شکار رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ صحیح راہ کی تشخیص میں کامیابی کے باوجود کجی اور منحرف راہ اختیار کرلے۔ جوں ہی ہوس اسے اپنی اختیار کردہ راہ ترک کرنے پر اکساتی ہے وہ فوراً اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ناگہانی طور پر پیش آنے والا کوئی معمولی سا واقعہ بھی اس بات کے لئے کافی ہوتا ہے کہ اسے عاجز و ناتواں کردے اور وہ راستے ہی میں تھک کر بیٹھ جائے۔

ہوس اور قبیح خواہشات سے مقابلہ کے لئے بھی قوتِ ارادی کی ضرورت واضح ہے۔ ارادہ سے صحیح اور پسندیدہ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ارادہ عقل کے تابع ہو۔ ایک ایسا ارادہ جس کی بنیاد عقل و وجدان ہو ایسے ارادہ سے یکسر مختلف ہوتا ہے جو نخوت اور خود پرستی کا نتیجہ ہو۔ ان میں

سے اوّل الذکر انسان کی سعادت و خوش بختی کا موجب ہے اور ثانی الذکر بدبختی اور سقوط کا۔

ایسا شخص جو اپنی حسِ خود پرستی کی تسکین کے لئے اپنے ارادہ کو ہر قسم کے قبیح اور خلافِ انسانیت اعمال کے ارتکاب کے سلسلہ میں کام میں لاتا ہے درحقیقت مردانگی سے محروم اور ہوائے نفس کی قید کا اسیر ہے۔ تاریخِ بشریت میں ایسے بے لگام ارادہ کے ذریعہ رونما ہونے والے شرمناک حادثات کے بدنما داغ بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔

ایسا شخص جو معمولی مشکلات آپڑنے پر خودکشی کی راہ اختیار کرتا ہے ضعفِ عقل کا شکار اور شجاعت و مردانگی کی روح سے عاری ہے۔ کیونکہ اس نے زندگی میں درپیش مشکلات کے انبوہِ کثیر میں سے صرف ایک مشکل کے سامنے ضعف و ناتوانی کے گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنے اس عمل سے اپنی حقارت اور پستی کی سند پر مُہرِ تصدیق ثبت کردی۔

انسانی صلاحیتوں کی وسعت

اس کائنات کے ہر وجود پر لازم ہے کہ وہ اپنی نشوونما کے لئے متعیّن شدہ راستے پر حرکت کرتے ہوئے کمال کے مراحل کو طے کرے تاکہ قابلیت و استعداد کے بلند ترین مقام پر پہنچ سکے۔ انسان بھی اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

نوعِ بشر کو درپیش بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ انسان آدمیت کے اوجِ کمال تک رسائی اور بلند ترین درجات کے حصول کے لئے

اپنے گوہرِ وجود کی کس طرح پرورش کرے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے
تو اسے اپنے وجود میں رکھی گئی استعدادوں اور وسیع امکانات سے آگہی حاصل
کرنا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ وہ ان عظیم نعمتوں کی ملکیت کا سب سے زیادہ
حقدار ہے جنہیں خداوندِ عالم نے بغیر کسی جدوجہد کے یوں ہی اسے عطا کردیا
ہے۔ اس طرح اس میں اپنی ذات پر اعتماد قوی ہوگا اور اس کے وجود میں پوشیدہ
صلاحیتیں بیدار اور روبہ عمل آئیں گی۔ یہی وہ صلاحیتیں ہیں جن میں اس کی
تعالی و نمو کی کافی استعداد پائی جاتی ہے۔

اکثر افراد اس وجہ سے اپنی ذات پر عدم اعتماد کا شکار نہیں ہوتے کہ ان کے
پاس امکانات کا فقدان ہے بلکہ اس عدم اعتماد کی اصل وجہ ان کا خود اپنے آپ
کو نہ پہچاننا ہے۔ بارہا یہ اتفاق ہوتا ہے کہ بعض افراد کے ذہنوں میں گراں قدر
علمی آراء و نظریات جنم لیتے ہیں لیکن وہ اپنی ذات اور استعداد پر عدم اعتماد کی
وجہ سے ان کا اظہار نہیں کرپاتے۔

تردد و تذبذب اور شکست کا خوف کمزوری کی علامت ہے۔ اسی بے
اعتمادی نے نہ جانے کتنے تخلیقی و زرخیز اذہان اور کتنے ہی نادر افکار و تخیّلات کو
خاکستر کردیا ہوگا۔

جب انسان اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ ہر کوشش و فعالیت کے نتیجہ
میں اس کے ہاتھ ایک ایسی نئی طاقت آتی ہے جو اس سے قبل اس کے تصوّر
میں بھی نہ تھی اور اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ ایک ایسے عظیم سرمایہ کا مالک
ہے۔ تو یہ تجلی اس کی ترقی کی راہوں کے مزید ہموار ہونے کا سبب بنتی ہے اور
انسان مزید صلاحیتوں کے حصول پر کمربستہ ہوجاتا ہے۔

پس جو شخص اس بات کا متمنی ہے کہ اپنی زندگی سے زیادہ سے زیادہ
ستفادہ کرے اور ہر موقع سے فائدہ اٹھائے اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے
پنے اندر خود اعتمادی اور قوتِ ارادی پیدا کرے اور پھر ان کی تقویت و نشوونما
ا سامان کرے۔

پروفیسر کارل کہتا ہے کہ۔

"زندگی کی سلامتی کے لئے محض اس کی حفاظت ہی کافی نہیں۔ بلکہ
(اس مقصد کے لئے) زندگی کو وسیع، عمیق، فعال اور باقدر و قیمت
بنانے کی ضرورت ہے۔ یعنی جسمانی اور روحانی شدّت، کیفیت اور
کمیت میں اضافہ کرنا چاہئے۔ صرف اور صرف قوت و قدرت کے
ذریعہ بلند رتبہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں جس قوت کی ضرورت
ہے وہ کسی کھلاڑی جیسی جسمانی طاقت، زاہدِ مرتاض جیسی روحانی
قوت اور ایک فلسفی و دانشور جیسی فکری صلاحیت کی مانند نہیں۔

ہم جس قوت کے متمنی ہیں وہ ہماری روحانی اور جسمانی مقاومت و ہم
آہنگی ہے۔ مثلاً تھکاوٹ، بھوک، بے خوابی، رنج و غم برداشت
کرنے کی صلاحیت اور ارادہ، امید، عمل، ناقابلِ شکست جسمانی اور
روحانی استحکام اور ایسی خوشی جو ہمارے پورے وجود پر چھا جائے۔

اس قوت کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اس کا صرف ایک ہی
ذریعہ ہے اور وہ ہے روزانہ متواتر اور متوازن کوشش۔ یعنی پورے
جسمانی نظام کی غیر ارادی کوشش اور ہوش و شعور کی ارادی سعی۔

ہمیں روزانہ ریاضت کرتے ہوئے رفتہ رفتہ سیکھنا چاہئے کہ زندگی

میں کیونکر نظم و ضبط برقرار کیا جاسکتا ہے کس طرح اصولوں کی پیروی
کی جاسکتی ہے اور اپنے نفس کا مالک ہوا جاسکتا ہے۔

اسی طرح مسلسل مشق و ریاضت کے ذریعہ جذبات، غصہ، بے
رغبتی، غرور اور سکوتِ ہستی پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ مشق تمام
باشعور لوگوں کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے یہاں رائج تعلیم و
تربیت کی بڑی خرابی اس تربیت کو فراموش کردینا ہے۔ ارادہ کی
دخالت کے بغیر قوت و استعداد میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔"

(راہ و رسم زندگی۔ ص ۸۷)

بعض لوگ ایک درخشاں زندگی کی صحیح قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ اس
کے حصول کے لئے ہمیشہ ایک سادہ اور سریع وسیلہ کی تلاش میں رہتے ہیں ہر
چند انہیں اس کے نتائج و محصولات ناچیز اور کم قیمت ہی کیوں نہ حاصل ہوں۔

یہ لوگ ایسی جدوجہد سے اعراض کرتے ہیں جو ان کی زندگی کو پُر افتخار اور
درخشاں بنا سکتی ہے۔ ایسی ذمہ داریوں سے سخت گریز کرتے ہیں جو ان کی
تہذیبِ نفس اور روح کی پاکیزگی کے سلسلہ میں بنیادی کردار رکھتی ہیں، ان کی
فکر و سوچ میں وسعت کا سبب ہوتی ہیں اور ان کی توفیقات کا میدان ہموار کرتی
ہیں۔

لیکن ایسا شخص جس نے خود کو گوناگوں ذمہ داریوں کے لئے تیار کیا ہو بے
شک نہایت زیرک ہوجاتا ہے کیونکہ وہ وسیع فضا میں پرواز کا اہل ہوتا ہے اور
اعلیٰ مدارج کو یکے بعد دیگرے طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا مقام و
مرتبہ ان لوگوں سے بہتر و بلند ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا محور معمولی اور

چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں کو قرار دیا ہو۔ انسان جس قدر بلند پروازی کا اہل ہوگا
اسی قدر اس میں ہدف حاصل کرنے کی صلاحیت ہوگی اور یہ امر مقصد پر اس
کے ایمان اور اس کے حصول کے لئے اس کی جہد و کوشش سے وابستہ ہے۔

کامیابی اور خوش بختی تک پہنچنے کے لئے صرف خوب و بد کا ادراک اور
حسنات و سیئات کی تشخیص ہی کافی نہیں۔ بلکہ جو چیز انتہائی اہمیت کی حامل ہے وہ
زندگی میں قوتِ عمل کا پایا جانا ہے۔

ممکن ہے ایک فرد مکمل طور پر خوبی و بدی کو پہچانتا ہو اور خود کو ان
وظائف و ذمہ داریوں کے سلسلہ میں مسئول سمجھتا ہو جنہوں نے اسے گھیرا ہوا
ہے۔ نیز ان کو انجام دینے کی پابندی کا گہرا احساس بھی رکھتا ہو لیکن ان وظائف
اور اپنی خواہشات کی انجام دہی کی قدرت و ارادہ کا مالک نہ ہو۔

ہر فرد کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ مسلسل اور ہمیشہ اپنی اعمال پر نظر رکھے
اپنے وجود میں ثمر بخش صلاحیتوں کو تقویت پہنچائے اور عظیم و مثبت قوتوں کو
نابود کردینے والے عوامل سے پرہیز کرے تاکہ بوقتِ ضرورت اپنی قوتِ ارادی
پر بھروسہ اس کی ثانوی عادت بن جائے۔ کیونکہ یہ قوتِ ارادی ہی ہے جو
زندگی میں درپیش حساس لمحات میں فیصلہ کے موقع پر (کہ جب ممکن ہے معمولی
سی سستی بھی ہولناک خطرات و نقصانات کا موجب ہو) ہمارے قدموں کو محکم
رکھتی ہے اور لغزش و سقوط سے بچاتی ہے۔

اس کے علاوہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کاموں کے آغاز سے
قبل ان کے نتائج اور مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے۔ اگر اس نے اس کے
برخلاف کیا تو اس کی حالت اس شخص کی سی ہوجائے گی جو بغیر قطب نما کے

سمندر میں کشتی رانی کر رہا ہو۔ زندگی کی کشتی کو بغیر قطب نما کے اقیانوسِ حیات میں اتارنا بہت بڑی حماقت ہے۔ انسان کو جاننا چاہئے کہ وہ کس منزل کی جانب گامزن ہے اور اس کے عمل و اقدام کا حاصل کیا ہے۔

اسلام کی نظر میں مسئولیت کی بنیاد

اسلام میں وظائف و ذمہ داریوں کی بنیاد اور تمام امورِ بشر کا محور "ارادہ" کو قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی وہ حد ہے جو انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے۔ انسان اسی ارادہ کے بل بوتے پر خواہشاتِ نفسانی کی تند موجوں کا مقابلہ کرتا ہے، ناگوار حوادث کے مقابل ڈٹ جاتا ہے اور اپنی قوتوں کو مصلحتوں کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہی انسان آزاد کہلانے کا مستحق ہے جو اپنے نفس پر مسلط اور کمالِ واقعی کا حامل ہو۔

اسلام کی طرف سے عطا کردہ انسان اور حیوان کے درمیان تمیز کا یہ معیار عین حقیقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ بے ارادہ انسان تو اصولاً انسان کہلائے جانے کا مستحق ہی نہیں۔

اسلام انسانی فطرت، اس کی متنوع صلاحیتوں اور اس کے وجود کے مرکبات سے لاعلم نہیں۔ دین اسان کو حیوانی سطح سے بلند ہو کر اوجِ انسانی کے حصول کی دعوت دیتا ہے اور اس سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق ممکنہ حدِ کمال تک رسائی حاصل کرے۔

ایسا شخص جو انسانی امتیاز کے بنیادی معیار کو کھو بیٹھے اور اپنے آپ کو مخرّب باطنی خواہشت کے سپرد کردے اس کی باطنی قوتیں پاش پاش اور اس کی

فکر صدمات میں مبتلا ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں وہ زندگی کے واقعی ہدف کے حصول میں ناکام رہے گا۔

نفس کی ریاضت آغاز میں ایک مشکل کام نظر آتی ہے لیکن تھوڑی تھوڑی مشق کے بعد رفتہ رفتہ یہ مشکل ختم ہو جاتی ہے اور انسان کے لئے گوناگوں فرائض انجام دینے کی راہ کھل جاتی ہے۔

"ارادہ" جو زندگی میں ترقی کا ضامن اور ارتقاء و پیشرفت کا وسیلہ ہے جب ایثار و فداکاری اور اخلاص کی راہ میں ہر لطیف احساس اور مہذب سلوک سے استفادہ کرتا ہے تو انسان کی عظمت میں شمار ہونے لگتا ہے اور اس روح کے ساتھ انسان جس کسی میدان میں بھی قدم رکھتا ہے حیرت انگیز کامیابیاں اس کی منتظر ہوتی ہیں۔

اسلام کے تہذیبی دستور العمل سے بہرہ ور ہونے والے افراد اپنے اندرونی محرّکات سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ باطنی محرّکات انہیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ارادہ کو کام میں لانے پر ابھارتے ہیں۔ نفسیات کی رو سے بھی "ارادہ" اس محرّک کا نتیجہ ہے جس کی کشش مثبت اور بہت قوی ہے۔

"مان" لکھتا ہے کہ۔

"عام طور پر جس چیز کو "قوتِ ارادی" کہا جاتا ہے وہ نفسیات دانوں کی نظر میں محرّکات کی نسبی قوت ہے۔ کسی بھی مسئلہ میں عزم و ارادہ اسی محرّک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم ہر مسئلہ کا وہ حل منتخب کرتے ہیں جو ہمارے فطری میلانات اور سابقہ تجربات کے لحاظ

سے ہمارے محرّکات کی زیادہ تشفّی کا باعث ہو۔

مثال کے طور پر ایک جاپانی سپاہی کو کسی جنگ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دشمن کی فوج سے مقابلہ اسے فضول محسوس ہوا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راہیں تھیں۔ ایک یہ کہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی جان بچالے لیکن بچپن ہی سے اسے یہ بتایا گیا تھا کہ کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا مطلب خود اپنی، دوسروں کی اور اپنے اجداد (جو اس کے عقیدہ کے مطابق اسے دیکھ رہے ہیں) کی نظروں میں اپنی شخصیت کھودینے کے مترادف ہے۔ اس کے پاس دوسری راہ یہ تھی کہ خود اپنے آپ کو ختم کرلے اور اس کے نتیجہ میں جس حیاتِ بعد از موت کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اس میں عظمت و بزرگی سے ہمکنار ہوجائے۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بناء پر وہ خودکشی کو ترجیح دیتا ہے۔

کیونکہ ہماری تربیت اس جاپانی سے مختلف انداز میں ہوئی ہے اس لئے ہم اس کے طرزِ تفکر سے صحیح طریقہ پر واقف نہیں ہوسکتے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر ایسا شخص جو ان عوامل کے تابع ہو وہی کام کرے گا جو اس جاپانی سپاہی نے کیا۔" (اصولِ روان شناسی۔ ص ۱۴۵)

ارادہ کی تکیہ گاہ

خود "قوّتِ ارادی" بھی ایک محکم و استوار تکیہ گاہ کی محتاج ہے۔ "ارادہ" کی یہ مضبوط تکیہ گاہ "ایمان" ہے۔ "ایمان" و "ارادہ" ایک دوسرے

کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر انسان حاملِ ایمان ہو لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ارادہ سے مدد نہ لے اور حرکت و فعالیت کا مظاہرہ نہ کرے تو ہرگز اپنا ہدفِ مطلوب حاصل نہ کرسکے گا۔ کیونکہ ہر کسی کی کامیابی کا دارومدار سعی و کاوش پر ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ۔

"وان لیس للانسان الا ما سعیٰ"

"اور انسان کے لئے اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے۔"

(سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۳۹)

دوسری طرف اگر انسان قوّتِ ارادی کا تو مالک ہو لیکن قوّتِ ایمانی نہ رکھتا ہو تو اس وقت تک تو کوششوں میں مصروف رہے گا جب تک اسے کوئی ایک راستہ بھی کھلا ہوا نظر آرہا ہو۔ لیکن جب اسے اپنے سامنے فطری عوامل و اسباب کی راہیں مسدود نظر آئیں گی اور ناقابلِ حل موانع و مشکلات کا سامنا ہوگا تو اسکے باطن میں روشن امید و آرزو کی شمع گل ہوجائے گی۔

ایسے حالات میں ایک قدرتِ لایزال پر ایمان کے سوا کوئی دوسرا عامل اسے اضطراب و پریشانی سے نجات نہیں دلاسکتا۔ مردِ باایمان زندگی کے سخت ترین لمحات اور کٹھن حالات میں خداوندِ عالم پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کی روح میں روشن امید کی شمع کسی صورت خاموش نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی مشکلات کے حل کے لئے خداوندِ عالم کے بے پایاں الطاف و عنایات کا طلبگار رہتا ہے۔

خداوندِ عالم پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو حکم دیتا ہے کہ کسی کام کا پختہ عزم کرلینے کے بعد خداوندِ عالم کی لازوال قدرت پر

بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لئے جان توڑ کوشش کیجئے۔

"فاذاعزمت فتوکل علی اللہ"

"اور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔"

(سورہ آلِ عمران ۳ - آیت ۱۵۹)

اگر آپ کسی کام میں منہمک شخص کے ارادہ کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تو اس کام کے بارے میں اس کے ایمان کو متزلزل کردینا کافی ہے۔

اگر انسان اس حقیقت کو پالے اور یہ عقیدہ رکھے کہ وہ جو سعی و کاوش بھی کرتا ہے وہ کائنات کے حاکمِ مطلق خداوندِ مقتدر کی طرف سے تقویت پاتی ہے اور مسلسل جدوجہد کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی جانب گامزن رہے تو اس طرح گویا کامیابی کا بنیادی منبع اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس عقیدہ کے ساتھ اپنے منتخب کردہ میدانِ عمل میں ان تمام موانع و مشکلات پر غلبہ حاصل کرلے گا جو دوسروں کی راہ کا پتھر ثابت ہوتے ہیں۔

ہم نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت دریافت کی ہے کہ وہ لوگ جو عزمِ استوار اور بلند ہمتی کے ذریعہ بشریّت کی ترقی و سعادت میں معاون ثابت ہوئے ہیں اور جنھوں نے قوموں کی ترقی و پیشرفت کے لئے کسی قسم کی کوششوں اور مجاہدت سے دریغ نہیں کیا بلکہ سختیوں اور ظلم کے سیلابِ بلاخیز میں اپنا راستہ بنایا ہے ان میں سرِفہرست انبیاء الٰہی اور خداوندِ عالم کے برگزیدہ بندے تھے۔

انسانیت کی نجات اور مقدس مقصد کے واسطے اس گروہ کی شہامت و شجاعت، پیہم جدوجہد اور محکم ارادہ عموماً پوری نوعِ بشر اور خصوصاً خود ان

مردانِ حق کے پیروکاروں کے لئے منارۂ ہدایت ہے۔

حضرت علیؑ جو خود ناقابلِ شکست شخصیتوں کا ایک کامل نمونہ ہیں اپنے ایک گرانبہا قول میں فرماتے ہیں کہ۔

"واللہ لو تظاہرت العرب علی قتالی ماولیت عنہا"

"خدا کی قسم اگر تمام عرب بھی میرے خلاف جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تب بھی میں میدانِ جہاد سے منہ نہ موڑوں گا۔"

(بحار الانوار - ج۱۵ - ص ۹۴)

خطبہ ہمام میں فرماتے ہیں کہ۔

"یا ھمام المؤمن نفسہ اصلب من الصلد"

"اے ہمام! مومن کا نفس سخت پتھر سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۹۱)

جنگِ جمل میں جب عہد توڑنے والی فوجوں سے آمنا سامنا ہوا تو حضرت علی علیہ السلام نے اپنے لشکر کا علَم اپنے فرزند محمد حنیفہ کے سپرد کیا اور چند جملات کے ذریعہ ان کی ہمت بلند کی اور انھیں ان الفاظ میں پامردی کا درس دیا کہ۔

"تزول الجبال ولا تزل، عز علی ناجزک اعر اللہ جمجمتک تدفی الارض قدمک ارم ببصرک اقصی القوم و غض بصرک و اعلم ان النصر من عنداللہ سبحانہ"

"پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں مگر تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا' اپنے دانتوں کو بھینچ لینا۔ اپنا کاسہء سر اللہ کو عاریت دے دینا۔ اپنے قدم زمین میں گاڑ دینا۔ لشکر کی آخری صفوں پر اپنی نظر رکھنا اور (دشمن کی کثرت و طاقت سے) آنکھوں کو بند کرلینا اور یقین رکھنا کہ مدد خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر۱۱)

عزم بالجزم ہی کامیابی کا راز ہے

مشکل حالات میں ممکن ہے صرف کسی ایک فرد کا عزمِ صمیم حالات کے رخ کو بدل ڈالے اور لوگوں کی حیرت انگیز جنبش و حرکت کا سبب بن جائے۔ ہدف کی راہ میں ایسے ہی لوگوں کی پامردی مشکلات کے کوہِ گراں کو پاش پاش کرڈالتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی بے باکی اور سُرعتِ عمل خطرناک بحرانوں سے نجات کا موجب ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ اس کے برعکس کسی کا معمولی سا تزلزل اور تھوڑی سی تاخیر خود اس کی اپنی اور اس سے وابستہ دوسرے افراد کی تباہی و نابودی کا سبب بن سکتی ہے۔

افریقہ کے لئے اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف "موسیٰ بن نصیر" نے اپنے ایک غلام "طارق بن زیاد" کو اس ہدایت کے ساتھ اسپانیہ کی سمت روانہ کیا کہ وہاں دشمن کی طاقت کا جائزہ لے کر اسے مطلع کرے۔

"طارق بن زیاد" ایک چھوٹے سے لشکر کے ہمراہ مقررہ مقام پر پہنچا۔ جب اس نے وہاں پہنچ کر دشمن کا جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر فوراً حملہ کردیا جائے تو دشمن کو باآسانی زیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اس صورتِ حال کی

رپورٹ سپہ سالار کو بھیجی اور اس کے فرمان کا انتظار کیا تو اتنی تاخیر ہوسکتی ہے کہ دشمن ہوشیار ہوجائے گا۔۔۔۔۔۔ یہی فیصلہ کا لمحہ ہے!!!

اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جن کشتیوں پر سوار ہو کر ہم یہاں پہنچے ہیں انہیں جلا ڈالو۔ کچھ ہی دیر میں تمام کشتیاں جل کے خاکستر ہوگئیں۔ اب طارق کی سپاہ کے پاس واپسی کی کوئی راہ نہیں رہی۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگوں نے طارق کے اس اقدام پر نکتہ چینی شروع کردی۔ جب اسے یہ اطلاع ملی تو اس نے کہا۔

"مردِ مسلمان ایک پرندہ کی مانند کسی خاص گھونسلے میں محدود نہیں رہتا۔"

پھر طارق اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے لشکر کے روبرو ایک پُرجوش خطاب کیا۔ اس نے کہا۔

"اے لوگو! تمہاری پشت پر سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ہیں اور سامنے طاقتور دشمن' ایسا دشمن جس کے پاس سامانِ حرب اور روز مرّہ استعمال کی اشیاء کی کوئی کمی نہیں۔ اس کے برعکس تم خالی ہاتھ ہو۔ تمہارے پاس آہنی عزم و ارادے اور کمر میں لٹکی ہوئی ان تلواروں کے سوا کچھ نہیں۔۔۔۔۔ آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔"

طارق بن زیاد کے ان پُرجوش کلمات اور آتشیں خطاب نے مسلمان فوجوں کو ایک عزمِ راسخ اور ولولہء تازہ عطا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس جوانمردی سے جنگ کی کہ مکمل کامیابی کے حصول تک چین سے نہ بیٹھے۔

تلقین بہ نفس

ہدف کے حصول کی راہ میں ارادہ کو تقویت پہنچانے کا ایک ذریعہ اپنے نفس کو تلقین کرتے رہنا ہے۔ عالی اور بلند آرزوؤں اور زندگی کے روشن افق پر نگاہیں گاڑے رکھنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان ان اہداف تک رسائی کے لئے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"تنافسوا فی الاخلاق الرغیبة والا حلام العظیمة والاخطار الجلیلة یعظم لکم الجزاء"

"شائستہ صفات و خصائل، اچھے کاموں اور بڑے کارناموں کی آرزو کرو کیونکہ اس طرح تمہیں ان کی عظیم پاداش اور حیرت انگیز نتائج حاصل ہوں گے۔" (غرر الحکم ص ۳۵۵)

"جیگو" کہتا ہے کہ۔

"جب تک آپ کے ذہن میں یہ خیال رہے گا کہ یہ کام نہیں کر سکتا، مجھ میں صلاحیت نہیں اس وقت تک آپ کی کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔ ایسی صورت میں اگر آپ بہترین صلاحیتوں کے مالک بھی ہوں گے تو وہ بھی ضائع چلی جائیں گی۔ اس کے بَرخلاف ایک ایسا شخص جس کی صلاحیتیں متوسط درجے کی ہوں لیکن اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو تو وہ کامیاب رہے گا۔ کیونکہ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر کی جانے والی مسلسل جدوجہد کے ضمن میں وہ صفات اپنے اندر پیدا

کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جو کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔

وہ شخص اس بناء پر کامیاب رہے گا کیونکہ اسے اپنی ترقی و پیش رفت پر اطمینان ہے۔ دوسروں کی ناکامی اس کے قدموں میں لغزش پیدا نہ کر سکے گی۔ وہ اپنے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے کام کا آغاز کرے گا۔ یقین جانئے وہ دوسروں کے تصوّر سے کہیں زیادہ جلد اور بہتر انداز میں ترقی کے مدارج طے کرے گا۔

اپنے اندر جرات پیدا کرنے کی خاطر تذبذب کو خود سے دور کیجئے۔ ممکن ہے کچھ لوگ احتیاطاً یا آپ کی خیرخواہی میں آپ کی توانائیوں کے سلسلہ میں شک و تردد کا اظہار کریں۔

کیا آپ خود ان لوگوں کی پیش گوئیوں کے بارے میں شک و شبہ کا شکار نہیں؟

کیا آپ ہر کس و ناکس کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ جو چاہے آپ کو نصیحت کرے؟

دوسروں کی گفتگو گوشِ ہوش سے سنئے اور اپنی جرات و استقامت میں اضافہ جاری رکھئے۔ جو لوگ اس انمول صفت کے مالک ہیں۔ ان کو دیکھئے ان کا جائزہ لیجئے۔

جب کبھی آزمائشوں کا سامنا ہو تو اس نصیحت کو ذہن میں دُہرائیے کہ "میں چاہتا ہوں اور میں کر سکتا ہوں۔"

اگر کسی ایسے اہم اور بڑے کام کا ارادہ ہے جس کی انجام دہی کے دوران آنے والی مشکلات سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں تو

اپنے ذہن میں یہ خیال لائیے کہ میں اپنی استعداد میں اس قدر اضافہ کرسکتا ہوں کہ یہ کام میرے لئے معمولی ہوجائے گا۔"

(تلقین بہ نفس۔ ص ۱۱۳-۱۱۲)

جس طرح بُرے فال نکالنا انسان کو رنجیدہ و پریشان کردیتا ہے اسی طرح نیک فال ہمت بلند کرنے اور ارادہ کو قوی کردینے والی چیز ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"تفال بالخیر تنجح"

"نیک فال نکالو تاکہ رفع مشکلات کی راہ کھل جائے۔"

(غرر الحکم۔ ص ۳۶۷)

بارھواں باب

دوستوں کے انتخاب میں احتیاط

دوستی اور نفسیاتی سکون

انسانی شخصیت پر سماجی ماحول کی تاثیر و نفوذ کا مسئلہ تربیت کے بنیادی مباحث میں سے ہے اور ہمیشہ علماء اخلاق کی خاص توجہ کا مرکز رہا ہے۔ انسان عام طور پر اپنے ہم نوعوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے اور اس کی روحانی و نفسیاتی حیات کے تار و پود معاشرہ سے مل کر تشکیل پاتے ہیں۔ بنا برایں اس کی شخصیت اور اخلاق کی تعمیر میں معاشرہ کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اپنے ہم نوعوں سے ربط و تعلق قطع کرکے گوشہ عزلت اختیار کرنے سے عاجز ہے کیونکہ تنہائی کی وحشت اس کی زندگی کو غم ناک و بے مزہ کردیتی ہے اور اس کی روح گھٹن محسوس کرنے لگتی ہے۔

اگر کسی سے ہمارا رشتہ مودت برقرار نہ ہو اور ہم یہ محسوس کریں کہ کوئی دل ہمارے لئے نہیں دھڑکتا تو ہم آشفتگی اور اضطراب میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ہمارے وجود کا آسمان تیرہ و تار ہوجاتا ہے۔

جس طرح ہمارا بدن کھانے پینے کی مختلف اشیاء سے غذائیت حاصل کرتا ہے اور اپنی قوت و طاقت میں اضافہ کرتا ہے بالکل اسی طرح روح بھی دوستوں کی ہم نشینی سے کبھی تو کسب فضائل کرتی ہے اور کبھی مختلف برائیوں سے آلودہ

ہو جاتی ہے۔

ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے لئے اپنی اختیار کردہ راہ و رَوِش دل و جان سے عزیز ہوتی ہے۔ نیز اس کی تمنا ہوتی ہے کہ جس قدر ہوسکے دوسروں کو بھی یہی راہ اپنانے پر آمادہ کرے اور ایک ایسا ماحول ایجاد کرے جس میں سب اسی طُرق و رَوِش پر گامزن ہوں، حتیٰ وہ کائنات کے بارے میں نظریات تراش کر اپنے طرزِ تفکر کو عالمی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی اختیار کردہ رَوِش اور طرزِ تفکر کی صحت و ثبوت کے لئے دلائل وضع کرے۔ اپنے نظریات سے شدید وابستگی ان کی مخالفت کو اس کے لئے ناگوار اور ناقابلِ برداشت بنادیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحبت اختیار کرنے اور اپنے ہم نشین چننے کا مسئلہ اور اس کے حدود کی شناخت ہماری سعادت و کامیابی سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

بعض دانشور اس بات کے معتقد ہیں کہ "تقلید" کی حس انسانی فطرت کا حصّہ ہے اور یہ اتنا غیر محسوس امر ہے کہ کوئی اس کی گہری اور تعجب انگیز تاثیر سے با آسانی آگاہ نہیں ہوسکتا۔ مختلف تقلیدی کیفیتوں کا وجود اس بات کا مظہر ہے کہ انسان اپنے اعمال، احساسات، ارادوں اور حتیٰ مختلف مسائل کے بارے میں اظہارِ نظر اور فیصلہ کرتے وقت بھی دوسروں کے تحتِ تاثیر ہوتا ہے اور اپنے ہم نشینوں اعزّہ و اقربا یا اپنے ماحول کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق خود کو ڈھالتا ہے۔ نیز دوسرے لوگ اپنی قدرت اور تسلّط کے لحاظ سے اس کی تربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جتنا جتنا انسان اس معاشرہ میں نشوونما پاتا ہے اتنا ہی لوگوں کے انبوہِ کثیر کے درمیان اس کا استقلال ختم ہوتا جاتا ہے اور اکثریت کی

نفسیات کے زیرِ اثر اور ان کے عقیدہ کا تابع ہوجاتا ہے۔ البتہ ایسے لوگ جو روحانی ضعف کے حامل ہوں اور ان کی فکر محدود ہو ان میں دوسروں کے اثرات قبول کرنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

نفسیات دانوں کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ انسان اسی وقت تقلید کرتا ہے جب اس بات سے اس کا دل مطمئن ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ دوسرے اس عمل کی تائید کریں گے یا یہی کام دوسروں کی کامیابی کا سبب بنا ہے۔

مثلاً بڑے لوگوں کے اقدامات کی تقلید کرنے یا بچّوں کی طرف سے اپنے بزرگوں اور اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کی تقلید کرنے کی یہی وجہ ہے۔ حتیٰ یہ چیز خاص حالات میں حیوانوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے اور وہ بھی ایسی بات کی تقلید کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے وہ کسی چیز پر دسترس حاصل کرسکیں۔

"براؤن" کہتا ہے۔

"لوگ ان کاموں کی تقلید کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے حصول کا ذریعہ ہوں' دوسرے الفاظ میں کوئی پوشیدہ قوّت اس تقلید کا سبب ہوتی ہے نہ کہ "تقلید" کے نام سے موجود کسی قوّت نے انہیں اس کام پر اُکسایا ہوتا ہے۔

جب ایک سیل گرل "گریو" کی مانند اپنے بالوں کی آرائش کرتی ہے تو یہ اس بناء پر نہیں ہوتا کہ تقلید کے نام کی کسی قوّت نے اسے اس کام پر لگایا ہوتا ہے بلکہ اس وجہ سے اس عمل کو انجام دیتی ہے کہ "گریو" یا کسی اور مقبول و معروف عورت کی مانند زندگی گزارنا چاہتی ہے اور "گریو" کو اس کا ترجمان سمجھتی ہے۔" (روان شناسی اجتماعی۔ص ۴۹۴)

ہر چند زندگی کے تمام مراحل میں دوستوں کے انتخاب اور ہم نشینوں کے چناؤ کے مسئلہ پر خاص توجہ کی ضرورت ہے لیکن یہ موضوع نوجوانوں کے لئے جنہوں نے ابھی بچپنے کی حدود سے باہر قدم رکھا ہے اور زندگی کے ایک حساس مرحلہ و میدانِ عمل میں وارد ہوئے ہیں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ نوجوان بجائے اس کے کہ اپنی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے والوں کی روحانی و اخلاقی حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ان کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے' وہ ان کے طرزِ تفکّر اور کارکردگی سے آگاہی کے بغیر محض جذباتی عوامل اور ناپائیدار محرّکات کی بناء پر ان کے سامنے اپنی دوستی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ بے توجہی اسے زندگی کے حقیقی راستہ سے دور کرکے فساد اور تباہی کی وادی میں دھکیل دے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اپنے ہم عمروں سے اِس (جوان) کی دوستی و ہم نشینی کی فطری کشش اور جذابیت سے صرفِ نظر نہ کیا جائے اور اس کی منطقی متدل اور خیر خواہی پر مبنی رہنمائی سے دریغ نہ برتا جائے تاکہ وہ تباہکار' غیر صالح اور ناپسندیدہ عناصر کے اثر و نفوذ سے محفوظ رہے اور بے عیب اس کی پرورش ہوسکے۔

اس بات کو ذہن نشین رکھ کر کہ دورانِ جوانی دورانِ ہیجان و کشش ہے اور نوجوان کا قلب ہر نقش کو قبول کرنے کی صلاحیت و آمادگی رکھتا ہے ہم بخوبی دریافت کرسکتے ہیں کہ اس حساس مرحلہ پر ماحول انسان کے روحانی اور جذباتی قوتوں کی پرورش کے سلسلہ میں کس قدر عظیم کردار رکھتا ہے۔ لہٰذا متعدد

انحرافات، شکست اور ناکامیوں سے محفوظ رہنے کے لئے لازم ہے کہ ہم نشینی کے سود مند اور صحیح اصولوں سے آشنائی حاصل کی جائے۔

ہم نشینی کا حقیقی معیار

دوست کے انتخاب کے موقع پر جذبات کو پسِ پشت ڈال کر آزادی کے ساتھ حسِ شناخت کو کام میں لانا چاہئے۔ اس کی باطنی صفات سے آگہی کی کوشش کرنی چاہئے، اس کے نقائص و معائب اور کمزوریوں سے آشنا ہونا چاہئے۔ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کس طرزِ تفکّر کا مالک ہے اور کونسی چیزیں اسے رنجیدۂ خاطر کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کی روح میں پوشیدہ انسانی امتیازات اور پسندید صفات کو جانچنا چاہئے تاکہ یہ خصوصیات اور فضائل آپ کو بھی حاصل ہو سکیں۔

بہت سے لوگوں میں ایسی اعلیٰ اخلاقی صفات پوشیدہ ہوتی ہیں جو ان کی ظاہری شخصیت سے کسی صورت عیاں نہیں ہوتیں۔ پاک طینت اور بافضیلت شخصیات سے مسلسل میل جول انسانوں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس کے برخلاف ہم نشین کے انتخاب کے موقع پر غور و فکر سے کام نہ لینا ایک ایسی بڑی لغزش ہے جس کا مرتکب انسان اپنی سعادت اور خوش بختی پر کاری ضرب لگالیتا ہے۔

معروف انگریز دانشور "آویبری" کہتا ہے کہ۔

"حقیقتاً کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ جب ہم کوئی گھوڑا خریدنا چاہتے

ہیں تو اس کی اصالتِ نسل اور طرزِ تربیت کے بارے میں خوب اچھی طرح تحقیق کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم اپنے ایک دوست کے انتخاب کے موقع پر اتنی باریک بینی برتتے ہیں----؟ کیا ہمارے دوست ایک گھوڑے سے بھی زیادہ ہماری زندگی پر اثرانداز نہیں ہوتے----؟"

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور ایک بار پھر کہوں گا کہ اپنے دوستوں کا انتخاب کرتے وقت توجہ سے کام لیجئے۔ ہماری اکثر مصیبتیں غیر مناسب دوستوں کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ انسان جب گہوارہ سے میدانِ حیات میں قدم رکھتا ہے، عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مختلف لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ اسی اثناء میں حادثاتی طور پر کچھ لوگوں سے اس کی دوستی ہوجاتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سفلہ و نالائق لوگوں سے ہم نشینی کی بناء پر وہ رذالتوں اور بُرائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے اس کے یہ دوست اس کے بدخواہ نہ ہوں لیکن اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت بچھو کی طرح اسے ڈنک ماریں اور اپنے زہر آلود اخلاق کو اس کی روح میں اتاردیں۔"

(در آغوشِ خوش بختی۔ ص ۶۶-۶۷)

حسّاسیت اور تنگ مزاجی

سماجی زندگی کا ایک بنیادی مسئلہ لوگوں کا ایک دوسرے سے موافق و ہم آہنگ ہونا ہے۔ کوئی دو افراد بھی ایسے نہیں پائے جاتے جو عقائد، افکار

احساسات اور عادات و اطوار میں مکمل طور پر یکساں ہوں۔ لوگوں کے مابین زندگی کے انتہائی معمولی معمولی مسائل میں بھی بہت کم اتفاق پایا جاتا ہے۔ ہمیں اس مبرہن حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہئے اور حتیٰ الامکان اپنے آپ کو گوناگوں طبائع و شخصیات کے حامل لوگوں کے ساتھ رہن سہن کا عادی بنانا چاہئے تاکہ حسنِ معاشرت ہماری شناخت بن جائے۔

بعض لوگ بلوغِ اجتماعی کے فقدان اور اجتماعی رہن سہن کے آداب سے ناواقفیت کی بناء پر اس قدر حساس، تنگ مزاج، سخت گیر اور دوستی میں بہت کم عفو و اغماض برتنے والے ہوتے ہیں کہ اپنی توقع اور مزاج کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرپاتے اور اپنے دوستوں کی کسی معمولی غفلت ہی سے اتنے برہم ہوجاتے ہیں کہ ان سے ہر قسم کے تفاہم کی امید کھو بیٹھتے ہیں اور مہرو محبت کا رشتہ ختم کردیتے ہیں۔ حالانکہ زندگی میں روشنی و تاریکی، خار و گل، خوبصورتی و بدصورتی ---- ہمیشہ ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ خلافِ توقع اور خلافِ مزاج باتیں برداشت کرنا معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ زندگی گزارنے کا بہترین ہنر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی توقعات اور مزاج میں لچک پیدا کی جائے درگزر اور صرفِ نظر سے کام لیا جائے۔ اکثر ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جنہیں برداشت کئے بغیر دوسروں کے ساتھ نبھاؤ ممکن نہیں ہوتا، باہمی ربط و ضبط قائم نہیں رہ سکتا اور مہرو محبت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔

دوسروں کے مزاج اور ان کی ضرورتوں کو پہچاننا چاہئے۔ یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ جیسا ہم چاہتے ہیں وہ ویسے بن جائیں اور یہ بات بلند اخلاق، جذبات کی لطافت اور انسان کے اندر جذبہ تفاہم سے وابستہ ہے۔

تمام باتوں کو محض اپنے رجحانات کی کسوٹی پر پرکھنا درست طرزِ فکر نہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں کے احساسات شدید یک جانبہ ہوتے ہیں اور ان کے اندر خود خواہی اور خود پرستی کی حس اس قدر قوی ہوتی ہے کہ وہ حقیقت بینی سے مکمل طور پر ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور ان کا قلب بھی رنج و عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ جب کہ واقعہ بینی کے حامل ہونے اور معقول توقعات رکھنے سے روحانی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔

نفسیات کا ایک ڈاکٹر اپنی بے جا توقعات کے بارے میں نقل کرتا ہے کہ۔

"دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں مجھے ایک دور دراز شہر کا سفر درپیش ہوا۔ میں نے ٹکٹ کے سلسلہ میں ایئر لائن کے دفتر سے رجوع کیا تو انہوں نے ٹکٹ دینے سے صاف انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آج کل ہم فوجیوں کی نقل و حمل کو ترجیح دے رہے ہیں اس لئے آپ کو ٹکٹ نہیں دے سکتے۔ جب انتہائی اصرار کے باوجود بھی مجھے ہوائی ٹکٹ نہ ملا تو مجبوراً مجھے ریل میں سفر کرنا پڑا لیکن شومیٔ قسمت کہ وہاں بھی تیسرے درجہ کا ٹکٹ مل پایا۔

ڈاکٹر کہتا ہے کہ سیٹ پر بیٹھنے کے چند لمحہ بعد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ اس سخت اور غیر آرام دہ سیٹ پر سفر میرے لئے عذابِ جاں سے کم نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے میں سخت غصّہ میں تھا۔

یکایک میں نے اپنی اس ناگواری کا تجزیہ شروع کیا اور سوچنے لگا کہ میرے غصّہ کی حقیقی وجہ سیٹ کا خراب ہونا ہے یا اپنی شخصیت کی بے قدری اصل سبب ہے کہ میں جو نفسیات کا ایک اتنا بڑا ڈاکٹر ہوں

کیوں مجھے ہوائی جہاز کے ٹکٹ میں استثناء کا بھی حق نہیں تاکہ یوں میرا قیمتی وقت تلف نہ ہو۔

اس کے بعد میں نے خود اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا جنگ کے موقع پر اس استثناء کی توقع رکھنا میرے لئے مناسب ہے؟ یا یہ کہ میری یہ توقع احمقانہ اور خود خواہی پر مبنی ہے؟

میں فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ میری یہ توقع بے جا ہے۔ کیونکہ اس وقت جب میرے ہم وطن دشمن کے گولوں کی زد پر ہیں' ان کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہونی چاہئے۔

یہ بات ذہن میں واضح ہونے کے بعد نا صرف یہ کہ پورے راستہ مجھے سخت سیٹ کا عذاب محسوس نہ ہوا بلکہ میں نے اپنا پورا سفر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یا دوسرے مسافروں سے گفتگو کرتے ہوئے بخوشی پورا کیا۔ حالانکہ نہ ہی میری سیٹ نرم و آرام دہ ہوگئی تھی اور نہ سفر کی مدّت ہی کم ہوئی تھی۔"

کبھی کبھی غیر حقیقت بین اور خود پرست لوگ دوستی اور میل ملاپ میں بھی خاص مقاصد نظر میں رکھتے ہیں اور صرف ایسے ہی لوگوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں جو ان کی ضروریات و مقاصد پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور ہمیشہ ایسے دوستوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو انہیں کوئی نفع پہنچا سکیں۔ ہرگز کسی ایسے شخص سے دوستی کا رشتہ استوار نہیں کرتے جو صرف پاک احساسات اور اخلاص کا حامل ہو لیکن اس کی دوستی سے انہیں مادّی فوائد

حاصل ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی بناء پر ایسے لوگوں کی دوستیاں اسی وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک انہیں ان کے ذریعہ سے منفعت کی امید ہو۔

لیکن جب وہ اس طریقہ سے حسبِ دلخواہ نتائج حاصل نہیں کرپاتے اور انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ دوستی کا پہیہ اب ان کے ہدف کے محور پر نہیں گھوم رہا' تو ان میں ایک طرح کی سرد مہری جنم لینے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی کے گرم اور پُرجوش روابط پر چھا جاتی ہے اور ان کا ریاکارانہ تعلق کم ہونے لگتا ہے۔

ظاہر ہے جب کسی شخص کے اجتماعی روابط پر عدم ثبات اور تلوّن حاکم ہوجائے تو لوگوں پر بتدریج اس کی حقیقت ظاہر ہونے لگتی ہے اور دوسرے لوگ بھی اس شخص کی حقیقت سے آشنا ہوکر اس سے بِن بُلائے مہمان کی مانند سرد اور تحقیر آمیز رویہ اختیار کرلیتے ہیں۔

"ایمرسن" کہتا ہے کہ۔

"ہماری حقیقت پہچان لی جاتی ہے۔ ہماری نیتوں سے زیادہ ہماری عادات و اطوار لوگوں کے لئے سبق آموز ہوتے ہیں۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اپنے فضائل یا رذائل کو صرف اپنے ظاہری اعمال سے برملا کیا جاسکتا ہے لیکن اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ فضائل و رذائل ہماری سانسوں کی مانند ہر لحظہ خود کو نمایاں کرتے ہیں۔

لوگوں کے اعمال کے درمیان ہمیشہ ایک طرح کی ہم آہنگی موجود رہتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر ایک اپنے وقت پر بے ریا اور طبیعی نظر آتا

ہے۔ ایسے اعمال جو ایک ہی نیت سے انجام دیئے گئے ہوں ان میں
فرق ہوتا ہے ہرچند وہ ایک ہی جیسے نظر آتے ہوں۔
اگر سمندر میں چلنے والی کشتی کو دور سے دیکھا جائے تو یوں محسوس
ہوتا ہے کہ وہ بالکل سیدھی راہ پر چل رہی ہے۔ جب کہ درحقیقت
اس کی راہ میں بے شمار چھوٹے چھوٹے پیچ و خم آتے ہیں۔ ہمارا ہر
عمل خود کو بھی واضح کرتا ہے اور ہمارے دوسرے اعمال کا بھی عکاس
ہوتا ہے۔" (فلسفہ اجتماعی' ص ۳۱۳)
یہ ایک ایسی دردناک نفسیاتی کیفیت ہے جس کا بہت زیادہ مشاہدہ ہم اکثر
لوگوں میں کرسکتے ہیں۔

بدکرداروں کی صحبت سے بچیے

کلّی طور پر انسان کے پاس دو امکانات ہیں ایک یہ کہ خود کو مکمل طور پر
طبیعی اور جسمانی قوتوں کے حوالے کردے اور روح کو غرائز و شہوات کی
اسارتِ مطلق میں دے دے یا یہ کہ روح کی آسمانی صدا اور خواہشات کا مثبت
جواب دے۔
انسان فضائل اور رذائل کے دو مخالف و متضاد قطب کے درمیان ہمیشہ
کشمکش کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس باطنی
چپقلش کے درمیان اپنے عظیم فریضہ کی ادائیگی سے غافل نہ ہو اور اپنے لئے
اس چیز کا انتخاب کرے جو اس کی انسانیت کے لئے شائستہ ہے اور ایسی راہ چنے
جو مقصد تک رسائی اور ہدف تک پہنچنے کا مطمئن ترین وسیلہ ہو۔

یہ انتخاب کبھی نہ ختم ہونے والا پے درپے اور مداوم امر ہے اور اسے
تادمِ مرگ انجام دیتے رہنا چاہئے۔ تاکہ انسان کا ہر اُٹھنے والا قدم اس کے پچھلے
قدم سے بہتر ہو اور وہ تکرار یا سقوط کا شکار نہ ہو۔ انسان کو بہت تھوڑے عرصے
کے لئے اس جہان میں بھیجا گیا ہے اس کوتاہیٔ عمر کے پیشِ نظر اہم بات یہ ہے
کہ وہ اس چھوٹی مدّت میں جہانِ ابدی کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کس طرح
حاصل کرے۔ بے شک مخرّب شہوات کو شکست دے کر اور منحرف خواہشات
کا ڈٹ کر مقابلہ کرکے ہی یہ قیمتی سرمایہ جمع کیا جاسکتا ہے۔
اسلام چاہتا ہے کہ انسان ہم نشین کا انتخاب کرتے ہوئے غور و فکر سے
کام لے' اپنی فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ تاکہ اس کے اندر اپنے امور
کے سلسلہ میں نظم و ضبط کی عادت پڑ جائے۔ نیز دوسری طرف وہ چاہتا ہے کہ
اس راہ سے حقیقی انسانی فضیلتوں کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائے تاکہ وہ
دل کی گہرائیوں سے ان کا معتقد ہوجائے اور اس طرح حقیقت کے عالی ترین
مراحل اس کے سامنے واضح رہیں تاکہ وہ انسانیت کے اوجِ کمال تک جا پہنچے'
ایسا کمال جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا موازنہ مادّی معیارات کے ذریعے کیا
ہی نہیں جاسکتا۔
اسلام انسان کے اندرونی اور بیرونی ہر دو میدانوں میں ارتقاء و پیشرفت کی
نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ خود انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ طرزِ تفکّر'
طریقِ عمل اور رَوِش کے انتخاب میں اس سے استفادہ کرے۔
اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھنے والے پاکیزہ اور صالح لوگوں کی مصاحبت روحانی
غذا کی فراہمی کا بہترین وسیلہ ہے۔ ان ہستیوں کے بلند افکار کے سائے میں

انسان کی فکر وسعت پاتی ہے اور نیکی و پاکیزگی سے اس کی رغبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان ان لوگوں سے ملاقات کے ذریعہ اپنے روحانی نقائص سے بیش از بیش آگاہی حاصل کرتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا ان سے موازنہ کرکے انہیں بڑھانے کی فکر کرتا ہے۔

اس موازنہ اور تقابل کے ذریعہ ممکن ہے انسان رفتہ رفتہ سیئات اور ناپسندیدہ صفات سے چھٹکارا حاصل کرلے اور اس کی روح کے مخفی ترین گوشے منور ہوجائیں۔

انسان کے دوست احباب کی خصوصیات اور عادات پر توجہ جدید نفسیات کا دریافت کردہ مسئلہ نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے اخلاق و کردار سے شناسائی کی ضرورت پر اصرار جنہیں انسان اپنا دوست بنانا چاہتا ہے اور جن سے رشتۂ محبت استوار کرنے کا خواہش مند ہے صدیوں قبل کے مذہبی آثار و روایات میں بھی متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ جدید نفسیات نے بھی انہی احکامات کو اہمیت دی ہے اور اس بارے میں اسی مفید اور پُرثمر رہنمائی کو دُہرایا ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا خوبصورت اور بلیغ بیان ہے کہ۔

"المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل"

"انسان عملاً اپنے دوست کی سیرت و رَوش کی پیروی کرتا ہے۔ پس تم میں سے ہر ایک کو نہایت دیکھ بھال کر دوست بنانے چاہئیں۔"

(مستدرک-ج۲-ص۶۲)

حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک کلام میں لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنے کی خاطر بد قماشوں سے میل جول سے احتراز کریں۔

"لاتصحب الشریر، فان طبعک یسرق من طبعه شرأ وانت لاتعلم"

"شریر لوگوں سے ربط و ضبط سے پرہیز کرو کیونکہ تمہیں خبر بھی نہیں ہوگی اور تمہاری طبیعت ان کا انحراف و ناپاکی قبول کرلے گی۔"

(نہج البلاغہ ابن ابی الحدید-ج۲۰-ص۲۷۲)

مشہور فرانسیسی دانشور "ڈاکٹر کارل" کہتا ہے کہ۔

"ہر فرد سے ظاہر ہونے والی حرکات و سکنات کی کیفیت اور شدّت کا تعلق بڑی حد تک اس کی باطنی حالت سے ہوتا ہے۔ اگر انسان اندرونی طور پر خالی ہوگا تو اس میں اخلاق اور شعور پروان نہ چڑھیں گے۔ اور اگر باطن بُرا ہوگا تو اس کی سرگرمیاں معیوب ہوں گی۔

ہم لوگ اپنے ماحول میں بالکل اسی مانند غوطہ ور ہوتے ہیں جس طرح ہمارے بدن کے اندر موجود خلئے بدن کا حصّہ ہوتے ہیں۔ ان خلیوں کی مانند ہم بھی ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ انسان کا جسم اپنی حفاظت بہتر طور سے کرسکتا ہے اس کے برخلاف روحانی دنیا میں اس کے شعور کا خود کو محفوظ رکھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا جسم ماحول کے طبیعیاتی اور کیمیائی عوامل کے مضر اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے واسطے جِلد اور دوسری رکاوٹوں

سے لیس ہے اس کے برعکس شعور کی سرحدیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں
اور انسان کی روح معاشرہ میں پائے جانے والے فکری و معنوی
عوامل کے حملوں کی زد پر رہتی ہے۔ لہٰذا یہ کبھی تو ان حملوں کا مقابلہ
کرکے سالم رہتی ہے اور کبھی ان کے آگے سپرانداختہ ہوکر خود کو
عیب دار بنالیتی ہے۔

مزید یہ کہ فکر کی پرورش سہل کام ہے لیکن اخلاقی اور مذہبی
سرگرمیاں ایسی نہیں۔ ان پر سماج کے اثرات زیادہ اور گہرے ہوتے
ہیں۔

انسان کا ایسے نفسیاتی ماحول سے اپنا دفاع کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سب
ہی لوگ اپنے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کے اثرات قبول کرتے
ہیں۔ اگر کسی بچّے کی پرورش اور نشوونما نادان اور جرائم پیشہ لوگوں
کے درمیان ہوئی ہو تو مستقبل میں وہ خود بھی نادان یا مجرم نکلے
گا۔" (انسان موجودِ ناشناختہ، ص ۱۶۴۔ ۱۶۲۔ ۱۶۱)

نفسیات کے ماہرین نے تقلید کے بارے میں جو تجربات کئے ہیں ان کے
نتائج حیرت انگیز ہیں۔

"۱۹۵۳ء کے موسمِ بہار میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات نے
ایک آزمائش کا اہتمام کیا اس سلسلہ میں انہوں نے سو افراد کو تین
روز تک اپنے زیرِ آزمائش رکھا۔

تیسرے اور آخری روز ان کا ایک باریک اور دقیق ٹیسٹ لیا گیا۔ ان
سو افراد کو پچاس پچاس افراد کے دو گروہوں میں تقسیم کردیا گیا۔

ایک گروہ کو گروہِ آزمائش اور دوسرے کو گروہِ شاہد کا نام دیا گیا۔

ترتیب یوں قائم کی گئی کہ گروہِ آزمائش کو پانچ پانچ افراد کے دس
دستوں میں تقسیم کیا گیا ان میں سے ہر فرد کی ڈسک پر ایک ایسا بٹن تھا
جس کے ذریعہ وہ اپنے دستہ سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کے
جواب سے آگاہ ہوسکتا تھا۔ لیکن اس آزمائش کا راز اسی نکتہ میں
پنہاں تھا اور وہ یہ کہ اس بٹن کو دبانے سے اسکرین پر جو جواب آتا تھا
وہ آزمائش کرنے والوں کا اپنا وضع کردہ جواب تھا اس دستہ کے افراد
کی اکثریت کا نہیں۔ درحقیقت آزمائش کرنے والوں نے ہر مسئلہ پر
ایک مصنوعی جواب ایجاد کرکے آزمائش ہونے والوں میں سے ہر
ایک کی رائے کو فریب دیا اور یہ لوگ اس راز سے بے خبری کی بناء
پر جس جواب کو اسکرین پر دیکھتے اسے اکثریت کی رائے سمجھتے اور اکثر
افراد نے اندھا دھند اسی رائے کا اظہار کیا۔

ریاضی کے ایک سوال کا غلط جواب ۸۹ فیصد افراد نے مصنوعی
اکثریت کے فریب میں آکر بے سوچے سمجھے دیا۔"

(رازِ کرشمہ ہا۔ ص ۳۹)

بدکاروں کی آزمائش

یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر بدکردار لوگوں سے میل جول اور ربط و
تعلق کا مقصد ان کی ہدایت اور انہیں گناہوں کی دلدل سے نکالنا ہو تو یہ ایک
لائقِ ستائش اور پسندیدہ بات ہے۔ اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایسے

لوگوں سے جو اخلاق و فضیلت کی سرحدیں عبور کرچکے ہیں میل ملاپ اور رشتہ دوستی قائم کرکے ان کی اصلاح و رہنمائی کا سامان کیا جائے۔

البتہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ خوب اچھی طرح دیکھ بھال کے درست راہ چنی جائے کیونکہ اس عمل کو بے توجہی سے انجام دینے کی صورت میں خاطر خواہ نتائج کا حصول ناممکن ہے۔

اکثر مقامات پر یہ رَوِش انتہائی مفید ثابت ہوئی ہے اور بسا اوقات نہایت مثبت اور حیران کن نتائج سامنے آئے ہیں اور انسان اس عمل کے ذریعہ اپنی دوستی کا بہترین حق ادا کرسکا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ۔

"من رای اخاه علی امر یکرهه فلم یرده عنه وهو یقدر علیه فقد خانه"

"جو شخص اپنے برادرِ مومن کو بُرے کام کی طرف جاتے دیکھے اور روک سکنے کے باوجود اسے اس کام سے نہ روکے تو گویا اس نے اس کے حق میں خیانت کی۔" (بحار الانوار ج۱۵۔ کتاب العشرہ ص ۵۲)

قدیم زمانہ سے کہا جاتا ہے کہ "نصیحت تلخ ہوتی ہے" یہ صرف مقولہ ہی نہیں ایک حقیقت بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو ناصحانہ گفتگو ناگوار گزرتی ہے۔ لہٰذا مشفق و خیر خواہ ناصح پر لازم ہے کہ وہ نرم اور ملائم لہجہ میں نصیحت کرے اور اپنے مخاطب کی کمزوریوں اور اخلاقی نقائص کی جانب اس طرح اشارہ کرے کہ اسے ناگوار نہ گزرے۔ دوستانہ انداز میں اسے آگاہ کرے اور اسے سمجھائے کہ جس راہ کا اس نے انتخاب کیا ہے اس کا انجام نابودی و شقاوت کے

سوا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا اعتماد بھی حاصل رکھے اور محتاط رہے کہ صرف تنہائی میں اور دوسروں کی نگاہوں سے دُور اسے پند و نصیحت کرے۔

ممکن ہے کوئی نادان شخص اپنے دوست کو اس انداز میں نصیحت کرے جس کا نتیجہ معکوس برآمد ہو۔ لیکن ایک عاقل شخص ہرچند وہ خود بُرائیوں کا مرتکب ہوتا ہے، اس قدر مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ نصیحت کرتا ہے کہ وہ بار آور ثابت ہوتی ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ان نکات کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ۔

"نصحک بین الملاء تقریع"

"لوگوں کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا نصیحت نہیں ملامت کرنا ہے۔" (غرر الحکم ص ۷۷۵)

"لربما خان النصیح المؤتمن و نصح المستخان"

"بسا اوقات امین پندگو خیانت کرجاتا ہے اور کسی خائن کی نصیحت موثر اور ثمر بخش ثابت ہوتی ہے۔" (غرر الحکم ص ۵۸۷)

"ڈیل کارنیگی" کہتا ہے کہ۔

"اگر آپ کسی پر کوئی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ایسی مہارت سے کام لیجئے کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو کہ آپ کا مقصد کیا ہے۔ ایسے مواقع کے لئے اس شاعر کی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیجئے جو کہتا ہے کہ "ایسے سکھائیے کہ آپ کو سکھانے والا نہ سمجھا جائے۔" ایسے لوگ جن کی قوتِ فیصلہ مکمل طور پر سالم اور روشن ہو بہت کم پائے جاتے

ہیں۔"

"ہم میں سے اکثر لوگ معترض اور ضدی ہوتے ہیں۔ حسد' بدگمانی' خوف' لالچ اور غرور ہماری عقل کو اندھا کردیتے ہیں۔ اب اپنے اخلاق کا جائزہ لیجئے۔ اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ آپ کا زیادہ رجحان اس طرف ہے کہ اپنی خطاؤں کو دوسروں سے منسوب کردیں تو اس کا چارہ کیجئے۔"

"ہم جب کوئی خطا کرتے ہیں تو بہت آسانی کے ساتھ دل ہی دل میں اس کا اعتراف کرلیتے ہیں۔ دوسرے اگر صلاحیت و مہارت کے مالک ہوں تو شیریں زبانی اور لطف و محبت کے ذریعہ ہمیں اپنی خطاؤں کے اقرار پر آمادہ کرسکتے ہیں۔

حتیٰ ایسے مواقع پر ہم خود اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہوئے احساسِ فخر سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ زور و زبردستی کے ساتھ ہمیں اس اقرار پر مجبور کرے تو وہ کسی صورت کامیاب نہ ہوگا۔" (آئینِ دوست یابی ص ۱۶۱-۱۵۹-۱۵۶)

امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من وعظ اخاہ سراً فقد زانه ومن وعظه علانیه فقدشانه"

"جو شخص اپنے برادرِ مومن کو تنہائی میں نصیحت کرے گا تو درحقیقت اس نے اسے زینت بخشی اور جو علانیہ سب کے سامنے نصیحت کرے گا تو اس نے اسے رسوا کیا۔" (تحف العقول ص ۴۸۹)

دوسری طرف اگر کوئی انحراف و کج روی کا شکار ہو اور چاہتا ہو کہ کوئی عاقبت اندیش دوست اسے اس گردابِ گناہ سے نجات دلائے تو اس پر لازم ہے کہ اس انیسِ خیرخواہ کی نصائح کو دل و جاں سے قبول کرے اور اپنی اصلاح و تعمیر کے لئے انہیں بروئے کار لائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"مناصحک شفیق علیک محسن الیک' ناظر فی عواقبک ستدرک قوارطک ففی طاعته رشادک' وفی مخالفته فسادک"

"تمہیں نصیحت کرنے والا تمہارا محسن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ نیکی کرے۔ تمہاری عاقبت بہتر بنانا چاہتا ہے۔ جو کچھ تم دنیا میں کھوچکے ہو اس کی تلافی کا خواستگار ہے۔ بنابریں تمہاری کامیابی اور نیک بختی اس کی نصیحت قبول کرنے میں ہے' جب کہ اس کی رہنمائی سے روگردانی و بے اعتنائی تمہاری تباہی و بربادی کا موجب ہوگی۔"

(غررالحکم۔ص ۶۴۱)

انسان اپنی خرابیاں جاننے کے بعد فوراً ان کی تلافی کی کوشش کرے تو یہ اس کے لئے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں معمولی سا تساہل بھی ندامت و پشیمانی کا سبب بن جاتا ہے۔ حتیٰ ایسا انسان اپنی عزّت و آبرو تک کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من لم یدع وھو محمود یدع وھو مذموم"

"جو شخص اپنی برائی اس وقت ترک نہیں کرتا جب وہ قابلِ تعریف

سمجھا جاتا تھا تو اسے وہ بُرائی اُس وقت ترک کرنا پڑتی ہے جب وہ قابلِ مذمّت شمار ہوتا ہے۔" (غرر الحکم ص ۶۴۱)

نہ صرف دوستوں کی طرف سے کی جانے والی تلقین و فہمائش بلکہ دشمنوں کی جانب سے کی جانے والی تنقید و نکتہ چینی بھی کمزوریوں کے علاج اور ان کی اصلاح کے سلسلہ میں موثر و ثمر بخش ثابت ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"عدو الرجل قد یکون خیراً من صدیقہ لانہ یھدیہ الی عیوبہ فتجنبھا"

"بسا اوقات انسان کا دشمن اس کے دوست سے زیادہ سود مند ثابت ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ دشمن اس کے عیوب اور نقائص کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بنا پر وہ ان کی اصلاح کرلیتا ہے۔"

(غرر الحکم۔ص ۷۶۵)

ایک امریکی فلسفی کہتا ہے کہ۔

"انسان مسندِ عزّت پر متمکن ہونے کے بعد غافل ہوجاتا ہے اور جب اسے اذیت پہنچتی ہے تو بیدار ہوتا ہے۔ شکست اس کے لئے عبرت کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب وہ گھر میں بیٹھ کر اپنا جائزہ لیتا ہے تو اسے حقائق کا علم ہوتا ہے، اپنے جہل سے آشنا ہوتا ہے، خود پسندی کے جنوں سے نجات پاتا ہے، یوں بالآخر اعتدال کی راہ اپنا کر اپنا حقیقی ہنر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

عقل مند آدمی اپنے مخالفوں کو بھی اپنا ہمراز بنالیتا ہے کیونکہ اس کی

کمزوریوں سے آگاہ ہونا ان لوگوں سے زیادہ خود اس کے اپنے لئے مفید ہوتا ہے کیونکہ یہ سانپ کی کینچلی کی مانند اپنی جِلد بدل کے ان کے لگائے ہوئے زخموں کو بے اثر کردیتا ہے اور جب تک اس کے مخالف کامیابی کی منزل تک پہنچتے ہیں وہ اسے سلامتی کے ساتھ عبور کرچکا ہوتا ہے۔

سرزنش ستائش سے کہیں بہتر ہے۔ اسی بناء پر میں اپنی ہاں میں ہاں ملانے والے اخبارات سے بیزار رہتا ہوں۔ جب تک میرے بارے میں بے لاگ تبصرے اور نکتہ چینی ہوتی ہے مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔ لیکن جب میرے بارے میں خوبصورت جملے کہے جاتے ہیں تو میں خود کو دشمنوں کے سامنے غیر محفوظ محسوس کرتا ہوں۔

اصولی طور پر ہر شر اس وقت تک ہمارے لئے خیر ہے جب تک وہ ہمیں بدحال نہ کردے۔

جس طرح جزیرہ سنڈویچ پر بسنے والے اپنے دشمن کو قتل کرتے ہوئے یہ گمان کرتے تھے کہ اس قتل ہونے والے کی شجاعت و بہادری اس کے قاتل میں حلول کر جائے گی اسی طرح ہمیں بھی یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مخالفوں کی قوت آخر کار ہماری طاقت میں اضافہ کاموجب ہوگی۔" (فلسفہ اجتماعی۔ص ۳۹۱)

بعض دوستیاں انتہائی مضر اور نقصان دہ ہوتی ہیں انہی ضرر رساں دوستیوں میں سے ایک نادان اور بے وقوف لوگوں کی دوستی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان پسماندہ رہ جاتا ہے اور بسا اوقات یہ اس کی بدبختی پر منتج ہوتی

ہیں۔ بسا اوقات نادان دوست سے پہنچنے والا بُرا اور دردناک انجام دشمن کے خطرہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے دوست کی طرف سے اعتماد کے پیشِ نظر آپ اس جانب سے اپنے دفاع پر توجہ نہ دیں اور اُس وقت آپ کو ہوش آئے جب واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے ہوں۔ جب کہ دشمن کی طرف سے آپ ہمیشہ ہوشیار و چوکنّا رہتے ہیں۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ نادان دوست نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت کوئی مشورہ دے لیکن یہ مشورہ معقول نہ ہونے کی بنا پر آپ کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔

ایک قدیم داستان ہے کہ اتفاقاً ایک عاقل و دانا شخص کو اپنے ایک نادان و احمق دوست کے ساتھ سفر کرنا پڑا۔ اثناءِ سفر میں دونوں دوست ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے منزل کی طرف دو راستے جاتے تھے ان میں سے ایک راستہ صاف ستھرا اور ہموار تھا جب کہ دوسرا راستہ ناہموار اور دشوار گزار۔

احمق دوست اڑ گیا کہ صاف راستہ پر سفر کیا جائے لیکن عاقل دوست جو جانتا تھا کہ ناہموار راستہ مختصر اور محفوظ ہے لہٰذا اس نے رائے دی کہ اسی راہ کا انتخاب کیا جائے۔ نادان دوست اپنی بات پر مصر رہا اور بالآخر اس کے انتہائی اصرار اور دباؤ کی وجہ سے مجبور ہو کر عاقل کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور دونوں دوست ہموار راستے پر چل پڑے۔

ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک ڈاکوؤں نے ان کا راستہ روک لیا، انہیں اسیر کیا اور ایک سمت لے کر جانے لگے۔ دیر نہ گزری تھی کہ حکومت کے سپاہیوں سے ڈاکوؤں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ سپاہیوں نے سب کو قیدی بنا

لیا اور ان کا مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا۔

دانا شخص نے قاضی کے سامنے پورا قصّہ بیان کیا اور اپنے نادان دوست کو قصوروار ٹھہرایا۔ اور کہا کہ یہی مجھے گمراہ کر کے اس خطرناک راستے پر لایا تھا۔

نادان نے بھی اپنا دفاع کیا اور کہا کہ درست ہے کہ میں احمق ہوں، میرے پاس نام کو عقل نہیں لیکن میرا یہ دوست جسے اپنے عقلمند ہونے پر ناز ہے آخر اس نے مجھے نادان جانتے ہوئے بھی میری تجویز کیوں قبول کی اور اپنی عاقلانہ تجویز سے کیوں دستبردار ہو گیا۔

الغرض سماعت کے بعد قاضی نے دونوں کو برابر برابر سزا تجویز کی۔

لہٰذا محض اخلاص اور وفاداری کی بنا ہی پر کسی کو دوست نہیں بنا لینا چاہئے بلکہ دوست کا انتخاب کرتے وقت سب سے پہلے اس کی عقل و فہم کا جائزہ لینا چاہئے۔ جو لوگ نادانوں کی دوستی سے پرہیز کرتے ہیں انہیں باتدبیر عقل مند شمار کرنا چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"لا تصحبن من لا عقل له"

"کسی صورت بے وقوفوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔" (غرر الحکم ص ۸۰۰)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایسے عناصر کو جو دوستی کے لائق نہیں اس طرح متعارف کراتے ہیں اور اس قسم کی نامناسب دوستیوں کے زیانبار نتائج کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"لا تقارن ولا تواخ اربعة، الاحمق والبخیل والجبان والکذاب اما الاحمق فانه یرید ان

"ینفعک فیظرک، و اما البخیل فانه یاخذ منک و
لا یعطیک و اما الجبان فانه یهرب عنک و عن
والدیه و اما الکذاب فانه یصدق و لا یصدق"

"چار قسم کے لوگوں کے ساتھ نہ میل جول رکھو اور نہ ہی ان سے رشتہ داری قائم کرو۔ احمق سے، کنجوس سے، بزدل سے اور جھوٹے سے۔ کیونکہ احمق تم کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوگا تب بھی ناسمجھی میں نقصان پہنچا بیٹھے گا۔ کنجوس تم سے لے گا تو سہی لیکن دے گا کچھ نہیں۔ بزدل معمولی مشکل کے وقت بھی نا صرف تمہیں بلکہ اپنے والدین تک کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا اور جھوٹا اگر سچ بھی بولے گا تب بھی اس کی بات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔"

(بحار الانوار۔ج ۱۵۔ کتاب العشرہ۔ص ۵۲)

نادانی اور انجامِ کار پر توجہ نہ دینا انسان کو آلودگی اور بالآخر بدبختی سے دوچار کردیتا ہے۔ متعدد مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے نادان دوستوں کے کہنے میں آکر برباد ہوگئے۔ یا گناہوں میں آلودہ ہوکر اپنی سعادت کا دامن داغدار کربیٹھے۔

ممکن ہے ایسے لوگ پہلے ہی سے واقف ہوں کہ انہیں خطرناک اور قبیح راہ پر لگایا جارہا ہے۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں انہیں ڈرپوک نہ کہا جائے اپنے دوستوں کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور آخرکار خجالت و شرمندگی کا سامنا کرتے ہیں اور پستی و اخلاقی فساد کے گڑھے میں جاپڑتے ہیں۔ اور ایک روز انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی ان ناقابلِ تلافی لغزشوں کا سبب اپنی عقل کو

کام میں نہ لانا اور دوراندیشی کو ایک طرف رکھ کر صرف اپنے دوستوں کی تقلید اختیار کرلینا ہے۔

لیکن افسوس یہ بیداری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ زندگی کا ایک بڑا حصّہ گزار چکے ہوتے ہیں اور ایک طویل دور سیاہ کاریوں کی نذر ہوچکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ غفلت اور خفتگی زندگی بھر طاری رہے اور اس حسرت و ندامت پر منتہی ہو جس کو قرآنِ کریم روزِ قیامت حسرت زدہ، تباہ کار اور گمراہ گروہ کے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ۔

"یٰویلتٰی لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا"

"ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔"

(سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۲۸)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ایسے لوگوں کا جو میل جول کے لائق نہیں اور جن کی صحبت سے اجتناب و احتراز برتنا چاہئے ان الفاظ میں تعارف کراتے ہیں۔

"لا تصحبن ابناء الدنیا فانک ان اقللت استقلوک
وان اکثرت حسدوک"

"دنیا پرست لوگوں سے دوستی نہ کرو کیونکہ اگر تمہارے مال و دولت میں کمی واقع ہوگی تو وہ تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اگر اس میں فراوانی ہوگی تو وہ رشک و حسد میں مبتلا ہوجائیں گے۔"

(غررالحکم۔ص ۷۰۷)

"لا تصحب من یحفظ مساویک و ینسی

فضائلک و معالیک"

"ہرگز ایسے شخص کی ہم نشینی اختیار نہ کرو جو تمہاری لغزشوں کو یاد رکھے اور تمہاری خوبیوں کو بھول جائے۔" (غرر الحکم ص ۸۱۱)

"لا تواخ من یستر مناقبک وینشر مثالبک"

"ایسے شخص سے رشتہ اخوت نہ جوڑو جو تمہاری قابلِ تعریف صفات و کمالات کو تو چھپائے اور تمہارے نقائص و معائب کا چرچا کرے۔"

(غرر الحکم۔ ص ۸۲۷)

"لا تصحب المالق فیز بن لک فعله ویود انک مثله"

"خوشامدی و چاپلوس کو اپنا دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنے ناپسندیدہ اعمال کو اچھا بنا کے پیش کرے گا اور اسکی خواہش ہوگی کہ تمہارا کردار بھی ایسا ہی ہو جائے۔" (غرر الحکم ص ۸۲۷)

"من لم یصحبک معیناً علی نفسک فصحبته وبال علیک ان علمت"

"وہ دوست جو کسبِ کمال اور اچھے اخلاق کے حصول میں تمہارا مددگار نہ ہو اگر سمجھو تو اس کی دوستی تمہارے لئے وبال ہے۔"

(غرر الحکم۔ ص ۸۱۲)

دوستی کرتے ہوئے احتیاط و ہوشیاری

خردمندی اور عاقبت اندیشی کا تقاضا ہے کہ رفاقت کے معیار اور اس کے

حدود پیشِ نظر رکھے جائیں۔ ممکن ہے دوستوں کے انتخاب کے موقع پر افراط و تفریط کا شکار ہو جانا اور اعتدال کی راہ چھوڑ بیٹھنا حسرت انگیز نتائج اور ندامت و شرمساری کا سبب بن جائے۔ کیونکہ دوستی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، اس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ شاید کبھی دوستوں کے درمیان کوئی تنازع پیدا ہو جائے یا ایسی بات ہو جائے جس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو کر دوستی اور اخلاص کے پُرنور آسمان کو تیرہ و تار کردیں۔ ایسی صورت میں اگر یہ دوست ایک دوسرے کے پوشیدہ معاملات اور رازوں سے آگاہ ہوں گے تو ان معلومات کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرسکتے ہیں۔

لیکن دوستی کے دوران عاقلانہ اور مبنی بر اعتدال رویّہ اپنانے سے نہ صرف خطرات کا تدارک کیا جاسکتا ہے بلکہ دوستی بھی ثابت و دائم رہتی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر امام جعفر صادقؑ دوستی کے مراتب میں افراط و زیادہ روی اور مخصوص اسرار کو افشاء کرنے کی شدّت کے ساتھ ممانعت فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

"لا یطلع صدیقک من سرک الا علی مالو اطلع علیه عدوک لم یضرک فان الصدیق ربما کان عدوا"

"اپنے دوست کو اپنی زندگی کے اسرار سے ہرگز آگاہ نہ کرو۔ سوائے انؔ اسرار کے کہ اگر وہ تمہارے دشمنوں کے علم میں بھی ہوں تو تمہارے لئے کسی حرج کا باعث نہ ہوں گے اور وہ اس کے ذریعہ تمہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ ممکن ہے جو آج

تمہارا دوست ہے اُسے زندگی کے نشیب و فراز کل تمہارا دشمن بنا دیں۔" (وسائل-احکامِ معاشرت باب ۱۰۱)

اسی بارے میں ایک مغربی دانشور یوں کہتا ہے کہ۔

"۔۔۔۔اب اس کے بعد دوستوں سے طرزِ معاشرت کی بات آتی ہے۔ بہت سے ایسے لوگ جو اپنے پوشیدہ ترین اسرار کو بھی دوستوں کے درمیان رکھ دیتے ہیں، ہمیشہ مضطرب و آشفتہ خاطر رہتے ہیں۔ کیونکہ جب رشتہ اخوت ٹوٹ کر دشمنی میں بدل جاتا ہے اور کل تک ہم پیالا و ہم نوالا رہنے والے دوست ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہوجاتے ہیں تو کل جو حربے وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے چکے تھے وہ آج ایک دوسرے کی تباہی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

ایسی ہی صورتِ حال میں ایک بڑے سردار نے میدانِ جنگ کا رخ کرتے ہوئے "لوئی چہاردہم" سے کہا تھا کہ۔

"مجھے میرے دوستوں کے شر سے محفوظ رکھنا دشمنوں سے مجھے کوئی خوف نہیں۔"

بعض لوگ ایک اور غلط راہ اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آتے ہیں اور اس سلسلہ میں کسی دقیقہ فروگزاشت سے کام نہیں لیتے اور جب کدورت کا غبار بیٹھتا ہے اور دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے تو اپنی اس شدّت پسندانہ روش پر شرمسار ہوتے ہیں اور آتشِ ندامت میں جھلستے رہتے ہیں۔

اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام کی حکمت سے لبریز ایک نصیحت

پیشِ خدمت ہے۔

"احبب حبیبک ھوناً ما عسیٰ ان یکون بغیضک یوماً ما و ابغض بغیضک ھوناً ما فعسیٰ ان یکون حبیبک یوماً ما"

"دوستی اور دشمنی میں اعتدال کی راہ پر چلو۔ کیونکہ ممکن ہے کسی روز حالات بدل جائیں اور تمہارا دوست دشمن ہوجائے اور دشمن دوست بن جائے۔" (وسائل-احکامِ معاشرت باب ۱۰۱)

تظاہر و ریاکاری

شاید آپ نے اپنے ارد گرد ایسے لوگ دیکھے ہوں جو ہر کسی کے ساتھ گرمجوشی سے پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ سب سے بنا کے رکھیں اور بالالفاظ دیگر معاشرہ میں اپنے قد میں اضافہ کریں۔ حالانکہ اس میل جوّل اور خیر سگالی کے اظہار کے وقت ان کا دل خلوص اور مہر و محبت کے جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ لیکن سامنے والے سے ملتے ہوئے سراپا انکساری اور محبت بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کو خوش کرنے اور انہیں راضی رکھنے کے لئے تملق و چاپلوسی اور مصنوعی حسنِ خلق کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ یہ بات فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دوسروں کے خیالات اپنے حق میں کرنے سے کہیں زیادہ بہتر و افضل کردار کی بلندی ہے اور ان (دونوں) کے مرتبہ کے درمیان کوئی موازنہ اور تقابل کیا ہی نہیں جاسکتا۔

ان سے ربط و ضبط رکھنے والے لوگ جلد ہی بھانپ لیتے ہیں کہ ان کی تمام کوششوں کا محور اپنے ضمیر و وجدان کی صدا پر لبیک کہنے کے بجائے صرف اور صرف اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین ہے اور وہ خوب اچھی طرح پہچان لیتے ہیں کہ یہ لوگ کس حد تک خود نمائی میں مبتلا ہیں۔

دوسروں کی آراء و نظریات اتنے اہم نہیں ہوتے کہ وہ کسی کی خوش بختی اور سعادت میں موثر ثابت ہوں۔ لوگوں کے احساسات اور نظریات کی اہمیت کا صرف ایک حد تک قائل ہونا چاہئے اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ خوش بختی کے حصول کے وسائل خود انسان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ بصورتِ دیگر انسان دوسروں کے نظریات کا اسیر اور غلام ہو کے رہ جاتا ہے اور اپنی ذات کا استقلال اور حریّت گنوا بیٹھتا ہے۔

بیشتر مواقع پر ایک دوسرے کے بارے میں لوگوں کی آراء شخصی منافع کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں۔ اور اکثر غلط ہوتی ہیں اور حالات و تقاضے انہیں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ ان نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس خصوصیت کے حامل افراد کی آراء کے معیار کو بخوبی پرکھ سکتے ہیں۔

بنابرایں اگر انسان زندگی میں ایسی صحیح راہ منتخب کرے جس سے دوسرے خوش و راضی نہ ہوں اور اسے یہ اصولی راہ منتخب کرنے پر تنقید و اعتراض کا نشانہ بنائیں تو ایسے شخص کو ان لوگوں کی فضول باتوں پر کان نہیں دھرنا چاہئیں اور رنجیدۂ خاطر ہوئے بغیر اپنی راہ پر گامزن رہنا چاہئے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"لایسوئنک مایقول الناس فیک فانہ ان کان کما

یقولون کان ذنباً عجلت عقوبۃ وان کان علی خلاف ماقالوا کانت حسنۃ لم تعملھا"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان باتوں سے رنجیدہ ہو جاؤ جو لوگ تمہارے بارے میں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر ان کی نکتہ چینی بجا ہے (اور تم بدکردار ہو) تو تم بہت جلد اپنی بدکرداری کا انجام دیکھ لوگے اور اگر ان لوگوں کی باتیں خلافِ واقع ہیں تو تمہیں بغیر کسی زحمت و کوشش کے اجر و ثواب مل رہا ہے۔" (غرر الحکم ص ۸۲۰)

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے۔

"دوسروں کے خیالات کا ڈر، خوف کی دیگر اقسام ہی کی مانند شاق و ظالمانہ اور ترقی و تکامل میں مانع ہوتا ہے۔ جب تک یہ خوف باقی ہے ہر قسم کی سماجی عظمت و لیاقت کا حصول دشوار ہے۔ اور اس حالت میں فکر و روح کی آزادی کا حصول (کہ حقیقی خوش بختی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے) محال ہے۔ کیونکہ سعادت کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ ہم نے زندگی کے لئے جس راہ و رسم کا انتخاب کیا ہے وہ خود ہمارے وجود میں پائے جانے والے افکار و اندیشوں پر مبنی ہو۔ دوسروں کے رجحانات اور سلیقوں سے وابستہ نہیں۔"

(شاہراہِ خوش بختی۔ ص۱۵۹)

ایک امریکی محقق "ولیم جان ریلی" اس بارے میں لکھتا ہے کہ۔

"کوئی شخص خود پسند متردّد لوگوں سے کہ جو نہ گرم ہیں نہ سرد، نہ خشک ہیں نہ تر زیادہ بے وقعت نہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس فکر میں

رہتے ہیں کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہمیشہ ایسے کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو دوسروں کو بھلے معلوم دیں۔

ایسے لوگ درحقیقت اپنی شخصیت و ارادہ کو دوسروں کی تمایلات پر فدا کردیتے ہیں۔ اگر آپ حد سے زیادہ دوسروں کے زیرِ اثر جائیں گے تو آپ کسی بھی وقت کوئی کام کرنے کی جرات پیدا نہ کرسکیں گے اور کامیابی حاصل نہ کرپائیں گے۔

البتہ اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ انسان دوسروں کی خیر خواہانہ اور سود مند تجاویز کو درخورِ اعتنا نہ جانے اور ان سے استفادہ نہ کرے۔

بلکہ ہم جس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ صرف ان تجاویز کو قبول کیجئے اور ان پر عملدرآمد کیجئے جنہیں آپ خود سود مند اور وزنی محسوس کرتے ہیں۔

اگر آپ لوگوں کی مغرضانہ خواہشات اور مخصوص تمناؤں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو مشکلات اور بے اطمینانی کا شکار ہوجائیں گے۔ آپ اپنے ان افکار پر جن کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ یہ درست اور مفید ہیں پامردی سے ڈٹ جایئے، آسودہ، مطمئن، مستقل ہوجایئے۔

دوسروں کی بے ہودہ اغراض آپ کے گرانقدر قلبی میلانات اور عمدہ افکار میں تغیر پیدا کرکے آپ کی آزادی، استقلال اور شخصیت و ارادہ کو آپ سے چھین لیتی ہیں۔ اگر آپ نے آزادی، فکر کو کھو دیا تو

گویا آپ نے سب کچھ تلف کردیا۔

لوگوں کے افکار و آراء، خیالات و عقائد متفاوت و متضاد ہوتے ہیں۔

جس قدر آپ لوگوں کی رضاجوئی کی فکر کریں گے اتنا ہی ان سے دور ہوتے چلے جائیں گے اور جس قدر آپ ان پر کم توجہ دیں گے اور ان کی باتیں کم قبول کریں گے وہ اتنا ہی آپ کی طرف مائل ہوں گے۔

دنیا فطرتاً ایسے لوگوں کو سراہتی اور پسند کرتی ہے جو اپنے عزم و ارادہ میں جری و بے باک ہوں اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہوں۔"

(تفکرِ صحیح۔ ص ۱۲۲)

گوشہ نشینی

عزلت نشینی اور معاشرہ سے کٹ کے رہنے کا ایک سبب انسان میں بدبینی کی حس کا پیدا ہوجانا ہے۔ اس حس کی وجہ سے انسان کی جذباتی و اجتماعی ترقی رک جاتی ہے اور مِل جُل کے رہنے کا خواب یاس و ناامیدی میں بدل کر لوگوں سے میل ملاپ سے زندگی بسر کرنے سے عاجزی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من لم یحسن ظنہ استوحش من کل احد"

"جو شخص بدبینی میں مبتلا ہو اسے ہر ایک سے میل جول سے وحشت محسوس ہوگی۔" (غرر الحکم ص ۱۲/۷)

معروف نفسیات دان "شاختر" لکھتا ہے کہ۔

"ہر کوئی دوسروں سے گھلنا ملنا چاہتا ہے اور اس کی آرزو ہوتی کہ لوگوں کا مرکزِ نگاہ اور ان کا محبوب ہو۔ لیکن جب یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ لوگوں سے موافقت پیدا کرنے کی بجائے ان سے دوری کو ترجیح دیتا ہے جب کہ اس کا یہ رویّہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور معاشرہ سے دور ہوجانا وقتی طور پر توباعثِ تسکین ہوتا ہے لیکن یہ کسی صورت ہماری غریزی احتیاجات اور فطری میلان و آرزوؤں کی تکمیل نہیں کرتا اور ہمارے درد کی دوا نہیں بنتا۔"

لوگوں سے دوری اختیار کرنے اور عزلت نشینی کے بھی مختلف درجات ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب ناکام و نامُراد شخص اپنے دوستوں، خاندان اور معاشرہ کو یکسر ترک کردیتا ہے اور گوشہ نشین ہوجاتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے عام طور پر معاشرہ سے ناسازگاری کا احساس رکھنے والے لوگ اس درجہ پر نہیں پہنچتے۔

میں ایک انجینئر سے واقف ہوں جو اعلیٰ عہدہ پر فائز اور اپنے فن کا ماہر شمار ہوتا تھا۔ لیکن کارخانہ میں اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا رویّہ نہایت خشک اور سخت ودرشت تھا۔ تنہا کھانا کھاتا، دوسروں کے ساتھ گفتگو اور تفریح میں شامل نہ ہوتا اور ہنسی اور مسکراہٹ تو کبھی اس کے چہرہ پر دیکھی ہی نہ گئی تھی۔ کسی میں مجال نہ تھی کہ اس کی کسی بات پر اعتراض یا نکتہ چینی کرے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی اس کیفیت کی وجہ سے دلی طور پر سخت

عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ بات چیت کرے، ہنسے کھیلے، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر غذا تناول کرے اور لوگوں سے دوستی و برادری کا برتاؤ کرے۔

جب ایک نفسیات داں نے اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر اپنے ماتحتوں کی اطاعت شعاری کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ کیونکہ اس کے ماتحت اسے سربراہی کے لائق نہیں سمجھتے اس لئے ان سے سختی کا برتاؤ کرکے انہیں اپنے قابو میں رکھا جائے۔" (رشدِ شخصیت۔ ص ۱۱۱)

کتاب ایک انمول دوست

فراغت کے اوقات میں ہم اپنے لئے ایک بہترین دوست کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ یہ دوست "کتاب" اور ایسے امور کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے جو ہماری فکری نشوونما کا سبب ہوں۔ ایسے بزرگوں کی تحریروں میں غور و فکر جو صدیوں قبل اس دنیا سے سدھار چکے ہیں اور آغوشِ خاک میں خفتہ ہیں ان عظیم شخصیات کے بے بہا افکار و خیالات اور ان کے کارناموں سے آگاہی کا ذریعہ ہے۔

انسان نے مختلف علوم و فنون میں ترقی کے مدارج اچانک ایک ہی جست میں طے نہیں کرلئے۔ بلکہ یہ ترقی و پیشرفت ان طویل اور متمادی تجربات و آزمائشوں کا ماحصل ہے جو کتب و رسائل اور اسلاف کے علوم و معارف کے توسط سے نسل بعد نسل منتقل ہوتے ہیں۔ اگرچہ مفکرین کی پُرافتخار شخصیتیں

تاریخ کی تاریکیوں اور ابہامات کی نذر ہوگئیں لیکن ان کے افکار و آثار کتب میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچ گئے۔

ہم ان آثار کے مطالعہ کے ذریعہ گویا صدیوں کا فاصلہ طے کرلیتے ہیں اور ان ممتاز شخصیات کے خیالات و افکار سے آگاہ ہوتے ہیں جن کا آج کوئی نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ اور ان آثار کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کے ذریعہ عظیم و خطیر حقائق کشف کرتے ہیں۔

مطالعہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر فرد خواہ وہ دولت مند ہو یا تہیدست عالی مقام شخصیات سے یکساں طور پر فیض یاب ہو سکتا ہے اور اپنے اوقات کو تاریخ کی پاکباز اور عظیم شخصیات سے گفتگو کرتے ہوئے بسر کرسکتا ہے۔ اور صرف پڑھنا جاننے اور حرف شناس ہونے کی بنا پر ہر کسی کو ان سے گفتگو کے مواقع میسّر ہوسکتے ہیں۔ مطالعہ کے ذریعہ کاٹ کھانے والی تنہائی سے بھی نجات حاصل کی جاسکتی ہے اور سکونِ قلب سے بھی بہرہ ور ہوا جاسکتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من تسلی بالکتب لم تفته سلوة"

"جو شخص اپنی روح کو کتاب کے مطالعہ کے ذریعہ تسلی بخشتا ہے اس سے سکونِ قلب سلب نہیں ہوسکتا۔" (غرر الحکم ص۶۳۶)

"من خلا بالعلم لم توحشه خلوة"

"جو شخص علم و دانش کے ہمراہ تنہائی اختیار کرے گا وہ تنہائی کی وحشت سے امان میں رہے گا۔" (غرر الحکم ص۶۳۶)

ایک یورپی دانشور کہتا ہے کہ۔

"انسان فطرتاً تنہائی سے گریز کرتا ہے، عزلت نشینی اس کے دل کو نہیں بھاتی، اس کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوستوں سے ملے جُلے، اعزّہ و اقربا کے درمیان اُٹھے بیٹھے۔ گویا تنہائی میں اس کی زندگی ناقص ہے اور ایک غیر مرئی بندھن نے اسے دوسروں سے باندھا ہوا ہے کہ ان کے بغیر اُسے چین و قرار نہیں آتا۔ بے شک کتاب انسان کے لئے بہترین مونس و مصاحب ہے کیونکہ کتاب ہمیں عام افراد کے ماحول سے نکال کر عالی افکار و تصورات کی دنیا میں لے جاتی ہے اور عظیم لوگوں کی ہم نشینی فراہم کرتی ہے۔

تنہائی اور بے چارگی کے ایام میں کتاب سے زیادہ وفادار کوئی دوست و مصاحب نہیں۔ دنیا دار لوگوں سے میل جول اکثر اوقات ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمیں اکثر اپنے افکار و رجحانات کا تابع کرلیتے ہیں اور کیونکہ خود ہوا و ہوس کے مطیع ہوتے ہیں نتیجے کے طور پر ہمیں بھی فساد و گمراہی کی گھاٹی میں کھینچ لیتے ہیں۔

لیکن کتاب ایک جہاندیدہ بزُرگ کی مانند ہمیں پند و نصیحت کرتی ہے اور اپنے حکمت آمیز کلمات کے ذریعہ ہوس کے اثرات کو ہماری روح سے زائل کردیتی ہے۔"

"ٹائلر" کہتا ہے کہ۔

"جوانوں کے واسطے کتاب ایک ایسا رہنما ہے جو انہیں فضیلت و شرافت کی جانب لے جاتا ہے۔ کیونکہ جوانی ہیجان و خود سری کا زمانہ ہے اور سن رسیدہ لوگوں کے لئے کتاب تسلی و آسودگی کا سبب ہے

انہیں بدبختی سے نجات دلاتی ہے کیونکہ پیری دورِ وحشت ہے۔"

(در آغوشِ خوش بختی۔ص ۴۸-۴۶)

جن لوگوں نے دنیا میں عظیم انقلاب بپا کئے ہیں، سود مند و ثمر بخش تغیرات کا سبب ہوئے ہیں اور جنہوں نے انسانی تاریخ کے رُخ کو بدل ڈالا ہے ان ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ تزکیہ نفس کے لئے نہایت موثر ہے۔ اس طرح انسان کو زندگی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور اس کی روح ان بے بہا نمونوں سے فیض یاب ہوتی ہے۔

بسا اوقات تاریخی حوادث و واقعات اور جاوید ان شخصیات کے کارناموں کا مطالعہ قاری کے اندر انتہائی جوش و خروش پیدا کردیتا ہے۔

جس طرح کسی کے دوستوں کو دیکھ کر اس کے اپنے اخلاق اور شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی شخص کی کتابوں کا انتخاب اور مطالعہ سے اس کے لگاؤ کو دیکھ کر اس کے طرزِ تفکّر اور روح کی گہرائی سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے بُری صحبت کے خطرات سے بچنے کے لئے دوست کے انتخاب میں احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا ضروری ہے اسی طرح کتاب کا انتخاب کرتے ہوئے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہر کتاب قابلِ مطالعہ نہیں ہوتی اور اتنی قدر و قیمت نہیں رکھتی کہ اس کے مطالعہ میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا جائے۔ کیونکہ ایسے مطالعہ کا نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بعض کتب کے مطالعہ سے ذہن پر نقش ہونے والے زہر آلود افکار پاک و بے آلائش روحوں کو مسموم و آلودہ کردیتے ہیں۔ خاص کر نوجوان اور وہ افراد جن

کے اخلاق کی بنیادیں ابھی اچھی طرح مضبوط نہیں اور جن کی روح ہر نقش قبول کرنے کو آمادہ رہتی ہے وہ اس طرح گمراہی و زوال کی راہ پر لگ جاتے ہیں۔

بصد افسوس ہمارے زمانے میں ایسی گمراہ کُن اور فضول مطبوعات جن کے زیاں بار اور شرمناک نتائج کسی سے پوشیدہ نہیں بہت زیادہ رائج ہیں۔ یہ کتابیں ایسے رہزنوں کی مانند ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے لیکن اپنے قاری کے پاکیزہ قلب اور شفاف ذہن میں داخل ہو کر حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ اُس کے اعتقادات اور فضائل کی بنیاد پر نقب لگاتے ہیں۔

کتب کا انتخاب کرتے ہوئے اکثر جوانوں کے پیشِ نظر اُن کے مضامین اور سبق آموزی نہیں ہوتی بلکہ وہ رومان پرور اور ہوس پرور مطبوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب مطالعہ کے لئے منتخب کئے جانے والے مواد کا غور و بصیرت کے ساتھ انتخاب نہ کیا جائے گا اور پڑھنے والے کا مقصد محض خود کو مصروف رکھنا اور اپنی ہوس کی تسکین ہوگا تو تضیعِ اوقات کے ساتھ ساتھ یہ مطالعہ گمراہی، اخلاقی فساد اور قاری کی تعمیری صلاحیتوں کی بربادی کا بھی باعث ہوگا۔

ایک مغربی ماہرِ نفسیات "ریمونڈ پیچ" کہتا ہے کہ۔

"مطالعہ کا مسئلہ نوجوانوں کے پیشِ نظر رہنا چاہئے۔ آج جب کہ مختلف روزنامے، انواع و اقسام کے ہفت روزے اور ماہنامے جوانوں کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ گزشتہ زمانہ کی نسبت اب ہم بہت کم ممتاز افکار اور عقول کا سامنا کرتے ہیں۔

جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مطالعہ کے لئے فضول کتب کو منتخب کرتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان میں خوبی و بدی کی شناخت کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے، خراب کتابیں اپنے قاری کے ہیجان اور غم و غصّہ کے احساسات کو بھڑکاتی ہیں۔ اسے اخلاقی فساد کی اتھاہ گہرائیوں کے نزدیک لے جاتی ہیں۔ یہ کتب قوتِ ارادی کو ضعیف کرتی ہیں۔ فکری پستی وجود میں لاتی ہیں اور معنوی زندگی کو پست کر دیتی ہیں۔"

(ما و فرزندانِ ما۔ ص ۸۳)

پس کتب کا مطالعہ ایک نہایت مفید عادت ہے جو نا صرف یہ کہ انسان کے افکار و نظریات کو روشنی و تابندگی عطا کرتا ہے بلکہ ممکن ہے انسانی زندگی کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دے۔ اور اس کی فعالیت اور سرگرمیوں کو ایسے نئے خطوط پر استوار کر دے جو اس کی شخصیت کو ثمر بخش بنا دیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے نمایاں افراد نے اپنی اخلاقی، روحانی اور علمی قوتوں کو انہیں لبریز منابع (کتب) سے حاصل کیا ہے اور انہی کے ذریعہ مجد و تعالی کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔

"تماس ہڈ" کہتا ہے۔

"مطالعۂ کتب سے میرے قدرتی و فطری لگاؤ نے میری زندگی کی ناؤ کو اوائلِ عمر ہی میں جہالت و افلاس کے بھُنور میں غرقاب ہونے سے محفوظ رکھا۔ جو شخص میری مانند والدین کی محبت اور سرپرستی کی نعمت سے محروم ہو جائے وہ بہت ہی کم اس خوفناک بھُنور سے بچ پاتا ہے۔

کتابوں نے مجھے قمار بازی میں ملوث ہونے، شراب نوشی اور نامناسب محفلوں میں رفت و آمد سے بچائے رکھا۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص بزرگوں کے بلند افکار اور گرانقدر کلمات سے کسبِ فیض کرے، محال ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی صحبت کی جانب مائل ہو اور اوباشوں کی ہم نشینی اختیار کرے۔"

(اخلاق ساموئیل۔ ص ۱۲۴)

تیرھواں باب

اپنی ذات پر اعتماد، حق پر اعتماد

کامیابی انسان کا حق ہے

فنی' اقتصادی' اجتماعی غرض ہر شعبۂ حیات میں انسان کی حیرت انگیز اور تعجب خیز پیشرفت اور اسی مانند تاریخِ عالم میں عظیم لوگوں کو حاصل ہونے والی درخشاں کامیابیاں انسان کے اپنی ذات پر بھروسے اور مسلسل سعیٔ پیہم اور متواتر کاوشوں کے مرہونِ منّت ہیں۔ کوئی ایک فرد بھی اعتمادِ نفس کے بغیر بلند پروازی اور انسان کے لئے مقرر کردہ حدود عبور کرنے پر قادر نہیں اور جب تک اسے اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد نہ ہو وہ اس وقت تک کسی کام کی انجام دہی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی کا یقین ہی انسان کو فتح و ظفر سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ یقین اس راہ میں اٹھنے والے پہلے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان جو بھی کام انجام دیتا ہے اس کے ارادہ' اعتماد اور نظریات کا ماحصل ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں ناقابلِ توجہ اور ناقص ہوں گی تو کام کا نتیجہ بھی ایسا ہی نمودار ہوگا۔ کبھی بھی اپنے خیالات کو کام کی چھوٹائی یا بڑائی میں مشغول نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ کام کی چھوٹائی یا بڑائی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی ذات پر بھروسہ کرکے نہایت احتیاط و اخلاص کے ساتھ کام کو اس کے انجام تک پہنچانا

چاہئے۔

مختلف انسانی معاشروں میں بکثرت ایسے سیلف میڈ افراد پائے جاتے ہیں جنہوں نے اعلیٰ انسانی اہداف کے حصول کے سلسلہ میں اپنے روحانی سرمائے کے ذخائر اور باطنی صفات سے استفادہ کیا' ظاہر ہے جس قدر انسان خود میں پوشیدہ سرمائے سے استفادہ کرے گا اتنا ہی اس سرمائے میں اضافہ ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں سے بُرمحل استفادہ اور بہرہ برداری وہ عالی صفت ہے جو اپنے حامل کو نمایاں افراد کی صف میں کھڑا کردیتی ہے اور اسے مراحلِ حیات میں عظیم کامیابیوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

ضعفِ نفس اور ناامیدی جمود و زوال کا پیش خیمہ ہے۔ ایسے افراد جو اپنے ارادہ و عمل پر بھروسہ نہیں کرتے اور اپنی مادّی و معنوی سعادت و کامیابی کے حصول کے لئے دوسروں کو اپنی امیدوں کا مرکز بناتے ہیں اور ایسے صاحبانِ قدرت کے محتاج رہتے ہیں جو انہیں اپنے سائے میں لئے رہیں' ان پر کامیابی کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں اور زندگی کی موجیں انہیں مسلسل پیچھے کی سمت دھکیلتی رہتی ہیں۔ اگر کسی کے ذہن میں عدم اعتماد بیٹھ جائے یعنی وہ یہ سمجھنے لگے کہ وہ کسی کام کا نہیں تو گویا اس کی فکری صلاحیتیں اختلال کا شکار ہوچکی ہیں اور اُسے کمال و بلندی کے حصول کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔

کتنی ہی بہترین صلاحیتیں اعتمادِ نفس کے فقدان کی بنا پر اپنے ظہور سے قبل ہی نابود ہوجاتی ہیں اور انتہائی اعلیٰ اہداف و مقاصد اور آرزوئیں دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اگر کسی شخص میں پائی جانے والی صلاحیتیں تو متوسط درجہ کی ہوں لیکن وہ مضبوط اور ناقابلِ شکست خود اعتمادی کا حامل ہو تو اسے ایسی

کامیابیاں نصیب ہوتی ہیں جن سے انتہائی نمایاں صلاحیتوں کے حامل لیکن اپنی ذات پر متزلزل ایمان رکھنے والے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ایسا شخص ان قوتوں کو بروئے کار لانے سے عاجز ہوتا ہے جو مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے اور پیچیدہ و گھمبیر صورتِ حال سے نجات کے لئے ضروری ہیں۔

بہت سے لوگ جو استعداد کے لحاظ سے متوسط سطح پر تھے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل بوتے پر زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے اور درخشاں کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔ یہی لوگ اپنی باطنی اور اصل قوتوں کے سائے میں شدید بحرانوں سے نجات حاصل کرتے ہیں۔

اصولاً ایسے ہی لوگوں کی زندگی میں آنے والے پیچیدہ اور شدید بحران ان کی قسمت بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بحرانی ادوار میں ان کے اندر مصمم روح' پائیدار اور مثبت صلاحیتیں اور وہ تمام چیزیں جو مثبت عزم و ارادہ کی افزونی کا سبب ہوتی ہیں وجود میں آتی ہیں اور ضعفِ نفس اور اپنی فعالیت پر عدم اعتماد جیسے منفی عوامل کم ہونے لگتے۔

جن لوگوں کے ارادوں میں قاطعیت پائی جاتی ہے وہ پوری قوّت سے منفی افکار کو اپنے سے دور پھینک دیتے ہیں اور اپنے اندر جھوٹے ضعف و ناتوانی کے احساس کو پنپنے کا موقع نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں کو کسی بھی طریقے سے ان کی منتخب کردہ صحیح راہ سے جس پر انہیں کامل ایمان بھی ہوتا ہے پلٹایا نہیں جاسکتا۔

یہ لوگ اس بات پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں کہ خداوندِ عالم نے اِس کائنات میں زندگی بسر کرنے والے کسی ایک فرد کو بھی سعادت و کامیابی کے حصول کے

سرچشمہ سے محروم نہیں رکھا اور عجز و محرومیت کا یہ احساس جس میں بعض انسان مبتلا رہتے ہیں دراصل ان کی اپنی کج فکری کا پیدا کردہ ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ کامیابی انسان کا حق ہے۔ ایک مثبت اور تعمیری ذہن کے ساتھ اگر ایمان و نظم و تدبیر سے کام لیا جائے تو ہدف تک رسائی قطعی اور یقینی ہے۔

مغربی دنیا کا ایک دانشور "ڈاکٹر مارڈن" کہتا ہے۔

"ایمان و اعتماد ایک تخلیقی' تعمیری اور مکمل قوّت ہے۔ اس کے برعکس بے یقینی ایک منفی' پست' تخریبی اور نابود کردینے والی قوّت ہے۔

اپنی ذات پر اعتماد شک و شبہ اور غیر مستقل مزاجی کو نابود کردیتا ہے اور انسان کو اس بات کا امکان فراہم کرتا ہے کہ وہ بلاتوقف اور کوئی اضافی قوّت صَرف کئے بغیر متانت کے ساتھ آگے بڑھے۔ تمام تخلیق کار' مصلحین' سیاح' محققین' جنگجو اور فاتحین اپنی استعداد اور توانائی پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے بَرخلاف اگر ناتواں اور شکست خوردہ شخصیات کا جائزہ لیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان میں سے اکثر اعتمادِ نفس اور ثباتِ قدم سے محروم تھے۔

ہم نہیں جانتے کہ کارہائے نمایاں انجام دینے کی استعداد رکھنے والے لوگوں کو خدا نے کیا چیز ودیعت کی ہے۔ صرف یہ جانتے ہیں کہ اپنے کام میں کامیابی پر ایمانِ کامل ہی ان کی استعداد کی نمایاں دلیل ہے۔

خداوندِ عالم ایسے لوگوں کی کامیابی کے سلسلہ میں ان کا مددگار ہوتا ہے جنہیں اس نے ایمانِ مطلق کے اسلحہ سے لیس کیا ہے۔

اعتمادِ نفس کو کسی صورت ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ اور دوسروں کو بھی یہ موقع فراہم نہ کیجئے کہ وہ آپ کے اعتمادِ نفس کو متزلزل کردیں۔ کیونکہ یہی اعتماد آپ کی تمام بڑی کامیابیوں کی اساس ہے۔ اگر اس اساس کو زک پہنچی تو بنیاد ہی گر جائے گی اور اگر یہ اعتماد سالم رہا تو امید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔(پیروزی فکر ص ۸۳)

طرزِ تفکّر میں سرایت و نفوذ کی صلاحیت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے مختلف سماجی روابط میں اس کے نہایت نمایاں اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کے افکار پر جرات و اعتماد کا تسلّط ہو تو جہاں بھی قدم رکھیں گے اعتماد و اطمینان آپ کے ساتھ ساتھ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ کے خیالات میں تزلزل اور وسوسہ پایا جائے گا اور آپ کی حسِ اعتماد صفر ہوگی تو یہ دوسری چیزوں کو بھی ضعف و ناتوانی میں مبتلا کردے گی۔

بعض افراد اپنے اردگرد کی فضا کو مسموم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور ایسے اذہان میں رسوخ حاصل کرلیتے ہیں جو سعادت مندی اور آزادگی کی راہ میں مستعد ہیں۔ منفی انسان مزرعہ معاشرہ میں بے کار گھاس کی مانند ہوتے ہیں جن کا کام دوسروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو کمزور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قدرتی بات ہے کہ جس معاشرہ میں اس قسم کے افراد کی فراوانی ہو وہاں نہ صرف سعادت و کامیابی پروان نہیں چڑھے گی بلکہ قاطعیت اور اعتماد ختم ہوجائے گا اور ہر چیز سے میل و رغبت سلب ہوجائے گی۔

دوسری طرف ان لوگوں سے براہِ راست ربط و ضبط' میل جول رکھنے والے لوگوں کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے اور جوں ہی یہ لوگ ان سے دور ہوتے

ہیں انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بلا ٹل گئی ہو اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔

معاشرہ میں ایسے لوگوں سے بھی سروکار پڑتا ہے جو اس قدر ضعیف النفس ہوتے ہیں کہ کسی انتہائی معمولی کام کے لئے بھی عزمِ راسخ کرنے کی قوت سے عاری ہوتے ہیں اور حتیٰ ان حسّاس لمحوں میں بھی جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ حتمی اور آخری فیصلہ کیا جائے اور ممکن ہے اس وقت کیا جانے والا فیصلہ ان کی زندگی میں انتہائی دوررَس اثرات کا حامل ہو اس قدر بے ثباتی اور تزلزل کا شکار ہوتے ہیں کہ معمولی سے اعتراض و تنقید پر ہی فوراً اپنا فیصلہ بدل ڈالتے ہیں۔ ہرچند وہ فیصلہ صحیح اور منطقی ہی کیوں نہ ہو۔

ناتوانی اور ناکامی کے اندیشہ کے نتیجے میں انسان فوراً دوسروں کی آراء و افکار کے اثر میں آجاتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے ان کی باتیں قبول کرلیتا ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ جن کاموں کا آغاز کرچکا ہوتا ہے انہیں بھی نامکمل چھوڑ بیٹھتا ہے۔

بے شک انسان کی روح میں پایا جانے والا یہ نقص اس کو زندگی کے ایک محدود دائرے میں مقیّد کردینے کے سوا کوئی اثر نہیں رکھتا۔

جس قدر کسی شخص میں خود اعتمادی ہوگی اسی قدر دوسرے بھی اس پر اعتماد کریں گے۔ ہر شخص دوسروں پر جو اثرات قائم کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر اس کے اعتماد و ایمان سے وابستہ ہوتے ہیں۔

اگر آپ کو خود اپنے اوپر اعتماد ہے اور آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں تو آپ اپنے سے میل جول رکھنے والوں کا اعتماد بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر

آپ کو خود اپنے نفس پر اعتماد نہ ہو یا ذہن میں معمولی سی بھی دو دلی اور تردد موجود ہو تو آپ کے بارے میں دوسروں کا عقیدہ بھی فوراً دگرگوں ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ آپ کی ہر پُر اعتماد یا تردد و ہچکچاہٹ آمیز حرکت کا دوسروں پر ایک خاص ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔

فریبی آرزوؤں پر بھروسہ

جس طرح اپنی ذات پر اعتماد اور سعیٔ پیہم پر بھروسہ ہدف و سعادت کے حصول کی راہ کا عظیم سرمایہ ہے اسی طرح فعالیت اور کوشش کی بجائے لغو نفسانی خواہشات اور ناممکن الحصول آرزوؤں کو دل میں بسانا زندگی کی حقیقتوں سے گریز کا موجب ہے۔ کبھی کبھی یہ دلفریب آوزوئیں اور دھوکہ دینے والے تخیلات انسانی روح کی گہرائیوں میں اس قدر اثر انداز ہوتے ہیں کہ انسان محال تصورات میں غرق رہنے لگتا ہے اور حقائق کے ادراک اور واقع بینی سے محروم رہتا ہے۔ ایسے لوگ کسی صورت کمال و سعادت تک نہیں پہنچ سکتے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اکذب الامل ولا تثق بہ فانہ غرور و صاحبہ مغرور"

"اپنی دلفریب خواہشات کو حقیقت نہ سمجھو' ان پر بھروسہ نہ کرو کیونکہ ان پر بھروسہ کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔"

غررالحکم۔ ص ۱۱۳)

اگر کوئی شخص نامعقول اور فریبی خواہشات پر بھروسہ کرے اور وہ

خواہشات پوری نہ ہوں یا ان کے حصول میں کوئی لاینحل رکاوٹ کھڑی ہو جائے تو انسان میں ایک قسم کی نفسیاتی بیماری پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک انمول کلام میں آرزوؤں کے بَر آنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور ان کے پورا نہ ہونے کو نفسیاتی پیچیدگی (Complex) لاحق ہونے کا سبب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"ذل الرجال فی خیبة الامال"

"انسان اس وقت اپنے اندر پستی و حقارت محسوس کرتا ہے جب اس کی آرزوئیں شکست و ناکامی سے دوچار ہوں۔" (غررالحکم ص ۴۰۵)

نفسیات کے ماہرین کی نظر میں بھی شکست احساسِ کمتری کے پیدا ہونے اور اعتمادِ نفس کے خاتمہ کا ایک اہم عامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ۔

"شاید شکست اور شکست پر ملنے والی سرزنش سے زیادہ کوئی اور چیز انسان کی قدر و قیمت گھٹانے کا موجب نہیں ہوتی۔ شکست کے نتیجہ میں انسان خود کو دوسروں سے کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ جب اسے شکست کا سامنا ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ وہ دوسروں سے پست اور کمتر ہے۔ شکست انسان سے خود اعتمادی چھین کر اس کی جگہ اسے یاس و ناامیدی دے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن بچوں اور جوانوں کو مستقل شکست کا سامنا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے اندر احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔"

(روان شناسی برائے زیستن۔ ص ۲۵۲-۲۴۷)

رسولِ کریمؐ کا دیا ہوا ایک سبق

انسان سازی کے سلسلہ میں پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک روش یہ تھی کہ آپؐ اپنے پیروکاروں میں خود اپنے عمل پر تکیہ و بھروسہ کرنے کی روح کی پرورش کرتے تھے۔ مسلمان مکتبِ ارشاد و ہدایت (اسلام) کے پیشوا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات کے سایہ میں خواہشات و شہوات کی دستبرد سے بچتے ہوئے اور ویرانگر تمایلات کے فریفتہ ہوئے بغیر گہرے اعتماد، عالی ہمت اور عزمِ راسخ کے ساتھ اعلیٰ اہداف کی راہ میں گامزن رہتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرتؐ کے ایک صحابی کو سخت مالی بحران کا سامنا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ صورتِ حال ان کی برداشت سے باہر ہوگئی۔ ابھی پانی سر سے گزرنے کو تھا کہ وہ اپنی زوجہ کے مشورہ سے اپنی ناگفتہ بہ صورتِ حال عرض کرنے اور مدد کی درخواست کے ارادے سے رسولِ مقبولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن قبل اس کے کہ اپنا مدعا زبان پر لاتے انہوں نے رسولِ خداؐ سے سنا کہ آپؐ فرماتے ہیں "جو کوئی مجھ سے مدد و معاونت کی درخواست کرے گا میں اس پر احسان سے دریغ نہ کروں گا۔ لیکن اگر کوئی بے نیازی اختیار کرے اور کسی مخلوق کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرے تو خداوندِ عالم اس کی محتاجی کو دور کردے گا۔"

یہ سن کر وہ اپنی حاجت رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کئے بغیر واپس گھر لوٹ آئے۔ لیکن جب انہیں تنگ دستی اور فقر کے سخت دباؤ سے نجات نہ ملی اور اس کی شدّت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا تو وہ ایک روز پھر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن آج بھی انہوں نے سرورِ کائناتؐ کی زبانِ

مبارک سے وہی پہلے والا جملہ سنا اور وہ اپنی حاجت خدمتِ رسولؐ میں بیان کئے بغیر واپس پلٹ آئے۔

ایک روز بالآخر جب انہیں امید کے تمام دروازے بند ہوتے نظر آئے تو وہ ایک مرتبہ پھر رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس مرتبہ بھی آنحضرتؐ کی زبانِ مبارک سے وہی جملہ سنا لیکن آج اس جملہ نے انہیں ایک نئی ہمت و توانائی بخشی اور انہوں نے اپنے اندر گہرا اعتماد محسوس کیا۔ انہیں یوں محسوس ہوا گویا مشکلات کے حل کی کنجی ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ وہ واپس پلٹے، اب وہ نہایت مضبوط قدموں سے چل رہے تھے۔ گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور خود سے ہمکلام تھے کہ۔

"اب بندگانِ خدا میں سے کسی کے سامنے دستِ حاجت دراز نہ کروں گا اور ان سے مدد و مساعدت طلب نہ کروں گا، صرف اور صرف خداوندِ عالم کی قوتِ لایزال پر بھروسہ کروں گا اور اپنی صلاحیتوں سے حتیٰ الامکان استفادہ کروں گا۔ اے پروردگارِ عالم! میری مدد فرما اور مجھے بے نیاز کردے۔"

اس کے بعد انہوں نے جائزہ لیا کہ وہ کیا کام کرسکتے ہے؟ گہری سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ صحرا سے سوکھی لکڑیاں جمع کرکے انہیں جلانے کے لئے شہر میں فروخت کیا جائے۔ بالآخر وہ اپنے ارادے پر عملدرآمد کی غرض سے ہاتھ میں کلہاڑی لئے صحرا کی سمت چل پڑے۔ وہاں سے سوکھی لکڑیاں جمع کیں اور انہیں شہر میں لاکر فروخت کردیا۔ اس شام جب ان کے ہاتھ میں اپنی محنت کی کمائی آئی تو انہیں اپنے اندر ایک سُرور و لذّت کا احساس موجزن معلوم

ہوا۔ اس طرح روز ان کا یہی معمول ہوگیا۔ یہاں تک کہ کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے اس کام کے لئے ضروری اوزار اور باربرداری کے لئے جانور خرید لئے اور ابھی زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وہ نہایت دولتمند اور کئی غلاموں کے مالک بن گئے۔

ایک روز رسولِ مقبولؐ سے ان کی ملاقات ہوئی تو آنحضرتؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا :

"میں نے تم سے کہا تھا کہ جو کوئی مجھ سے مدد و تعاون کی درخواست کرے گا میں اس پر احسان سے دریغ نہ کروں گا لیکن اگر کوئی بے نیازی اختیار کرے اور کسی مخلوق کے سامنے اپنی حاجات پیش نہ کرے تو خدا اسے بے نیاز کردے گا۔"

(اصولِ کافی۔ ج۲۔ ص۱۳۹)

معروف دانشور "ساموئیل اسمائیلز" لکھتا ہے کہ۔

"ہر کامیابی کا بنیادی عنصر اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ اگر کسی قوم کے اکثر افراد اس فضیلت سے آراستہ ہوں تو وہ ملّت عظیم اور قدرت مند ہوجائے گی۔ اس میں محض اسی فضیلت کا پایا جانا اس کے ارتقاء اور قدرت مندی کا راز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں انسان کا عزم قوی ہوتا جاتا ہے جب کہ اس کے بَرخلاف دوسروں پر بھروسہ کرنے کی صورت میں اس کا عزم ضعیف ہونے لگتا ہے۔

دوسروں سے ملنے والی امداد کے نتیجہ میں اکثر انسانوں میں جدوجہد کا مادّہ کمزور پڑجاتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں انہیں محنت و کوشش

فضول محسوس ہونے لگتی ہے۔ خاص کر اس وقت جب خارجی امداد ضرورت سے زیادہ ہوجائے۔ ایسے مواقع پر انسان کے اعصاب مکمل طور پر سست پڑجاتے ہیں اور عزم و ہمت کی روح اور سعی و جہد کی قوت جاتی رہتی ہے۔

بہترین شرائع و قوانین انسان کو زندگی میں اس بات کی آزادی و خود مختاری عطا کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے بھروسے پر اپنی زندگی بسر کرے۔

لیکن انسان ہمیشہ خیال کرتا ہے کہ سعادت و آسائش کی فراہمی قوانین کی ذمہ داری ہے اس کی سعی و کاوش کی نہیں۔ اگر تھوڑا سا بھی غور و فکر سے کام لیں تو اس حقیقت تک پہنچ جائیں گے کہ وہ مفاسد و نواقص جنہیں ہم کسی ملّت سے نسبت دیتے ہیں دراصل وہ مفاسد و نواقص ہیں جو اس قوم کے افراد کی ایک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم قوانین کے ذریعہ ان مفاسد کی روک تھام کرنا چاہیں تو یہ دوسری شکل و صورت میں یا کسی دوسرے گوشہ سے سر ابھاریں گے۔ تاوقتیکہ بنیادی طور پر پوری قوم کی نفسیات و عادات ہی تبدیل نہ ہوجائیں۔" (اعتماد بہ نفس ص۱۶۔۱۴)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"من لم یتجد لم ینجد"

"جو شخص خود کو بلند نہ کرے اور اوجِ رفعت پر نہ پہنچائے تو کوئی دوسرا اسے بلند نہ کرسکے گا۔" (غرر الحکم ص۶۹۸۔۶۴۲)

"من عجز عن اعمالہ ادبر فی احوالہ"

"جو کوئی عمل و کوشش کے سلسلہ میں سستی اور سہل انگاری میں مبتلا ہوجائے تو اس کی حالت انحطاط و زوال کا شکار ہوجائے گی۔" (غرر الحکم ص ۸۹۶-۶۴۲)

ایک مغربی مفکّر کہتا ہے کہ۔

"فطرت اپنی قلمرو میں کسی چیز کو بقا کی اجازت نہیں دیتی مگر یہ کہ وہ چیز خود اپنی بقا کے لئے جدوجہد کرے۔ ایک سیارے کی زندگی اور بقاء مدار میں اس کی حرکت سے وابستہ ہے، کوئی درخت اس وقت تک اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا جب تک تیز طوفانی ہواؤں سے اپنی حفاظت پر قادر نہ ہو، تمام حیوانات اور نباتات کی زندگی کا سرچشمہ ان کی پُراعتماد روح ہے۔

لیکن اس وقت ہم ایک ایسی بے نظم جماعت کی مانند ہیں جس میں کوئی اپنی حد و سرحد کا پاس و لحاظ نہیں رکھتا۔ ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنے باطن میں موجزن صلاحیتوں کے اقیانوسِ بے کنار کو نہیں دیکھ رہا بلکہ اپنی تشنگی کی تسکین کے لئے دوسروں سے پانی کا طلبگار ہے۔

اگر ہمارے جوانوں کو جدوجہد کے پہلے ہی مرحلہ پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ مکمل طور پر ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی جوان تاجر کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے تو لوگ اسے نامُراد سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر کسی ذہین طالبِ علم کو فارغ التحصیل ہونے کے ایک سال بعد تک ملک کے کسی شہر میں کوئی ملازمت نہ ملے تو وہ خود اور دوسرے لوگ

اسے اس بات کا حقدار سمجھنے لگتے ہیں کہ اب وہ ساری عمر مایوس و نالاں رہے۔

انتہائی محنتی جوان "ورمونٹ" جس نے سالہا سال تک مختلف پیشے اختیار کرکے اپنی زندگی بسر کی کبھی کھیتی باڑی کی، کبھی مزدوری کی، کبھی مدرسہ قائم کیا، کبھی وعظ و نصیحت کی، کبھی ایک روزنامہ کی مدیریت کی ذمہ داری سنبھالی، کبھی زمین کی خرید و فروخت کا پیشہ اختیار کیا الغرض مختلف کاموں میں ہاتھ ڈالے لیکن وہ جب کبھی ناکامی کا شکار ہوتا تو بالکل اس گرتی بلی کی طرح جو چاروں ہاتھ پاؤں کے بل زمین پر آپڑتی ہے فوراً بغیر کسی خوف و خطر کے اٹھ بیٹھتا۔ یہ جوان ان سینکڑوں شہری گڈوں سے کہیں بہتر ہے۔

ایسا جوان زمانہ کے ساتھ قدم بقدم بڑھتا ہے اور کوئی بھی پیشہ اختیار کرتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتا، شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کو تلف نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے ہر ہر دقیقہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ایک کی بجائے سو مواقع ہوتے ہیں۔" (فلسفہ اجتماعی ص ۳۲۸-۳۲۴)

اس کے باوجود کہ نفس پر اعتماد سود مند ترین اور عظیم ترین اخلاقی فضیلت ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ صفت نخوت و خود پسندی نہیں کیونکہ حقیقت بینی اور خود پسندی کے درمیان کوسوں کا فاصلہ ہے۔

جو شخص اپنی توانائی سے زیادہ اور نامعقول حد تک اعتمادِ نفس کا اظہار کرے، اس بارے میں مبالغہ اور غلو کا شکار ہو اور افراط و خوش فہمی کی راہ پر

گامزن ہو تو ایسا شخص دراصل غرور و نخوت میں مبتلا ہے۔ اس سے عالمِ نخوت میں بہت زیادہ غلطیوں کا امکان ہے۔ مغرور اپنے وہم و خیال میں بسی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتا ہے۔ نیز دشواریوں کا صحیح ادراک نہ رکھنے' ان کا وزن معلوم نہ ہونے اور انہیں سہل سمجھنے کی بناء پر خود کو ان سے مقابلہ کی ضروری قوت سے لیس نہیں کرپاتا۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ بوقتِ ضرورت اپنی صلاحیت اور کاردانی کا ثبوت فراہم نہیں کرپاتا۔

اس کے بَرخلاف حقیقت بین شخص دوَر اندیش ہوتا ہے' انجامِ کار پر نظر رکھتا ہے' ایک فطری اور سالم خوش بینی کا مالک ہوتا ہے اور مقاصد و اہداف کے حصول کے لئے کام کا آغاز کرنے سے قبل نہایت گہرائی سے اپنی طاقت و قدرت کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی توانائی کی حدود میں رہتے ہوئے قدم اٹھاتا ہے۔

منفی سوچ رکھنے والے اعتماد کی روح سے عاری ہوتے ہیں

جس طرح خُود اعتمادی کے حامل شخص کے اندر قدرت و توانائی نشوونما پاتی ہے' وہ ترقی و پیش رفت کی منزلیں طے کرتا ہے اور ایک آزاد اور خوش و خرم زندگی بسر کرنے پر قادر ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایسے شخص کی تعمیری قوتیں زائل ہوجاتی ہیں اور اس کی استعداد اور سرگرمیوں کی قوت نابود ہوجاتی ہے جس پر منفی افکار اپنا تسلّط جمالیں۔

ہمیشہ حالات کی ناسازگاری کا رونا رونے والا شخص اپنے سامنے صرف اور صرف ناکامیوں کے دروازے کھولتا ہے۔ ایسا شخص بجائے یہ کہ اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں لے' حوادثِ زمانہ کا اسیر ہوکے رہ جاتا ہے۔ طوفانِ زندگی کے

تھپیڑے اسے مسلسل پیچھے کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں اور اس کے لئے اپنی آرزوؤں کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ یہی رویہ خود اعتمادی کی روح سے عاری اشخاص کی واضح اور امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔

نفسیات دان کہتے ہیں کہ۔

"جب بھی منفی سوچ رکھنے والے افراد ملتے ہیں تو کیونکہ ان کی خود اعتمادی کی حس کمزور ہوتی ہے اس بناء پر وہ خود سے مطمئن نہیں ہوتے اور انہیں اپنے اندر نقص نظر آتا ہے۔ یعنی انہیں اس بات کا اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے گا' یا جس کی انجام دہی کا ان سے تقاضا ہوگا وہ اسے پورا بھی کرسکیں گے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ان سے کسی کام کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ اس خواہش کو رد کردیتے ہیں کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ اگر خواہش کا مثبت جواب دیا اور اس کام سے صحیح طور پر عہدہ برآنہ ہوسکے تو دوسروں کو ان کی عدم توانائی کا علم ہوجائے گا جس کے نتیجہ میں ان کی بنی بنائی قدر و منزلت گھٹ کے رہ جائے گی۔ اس بناء پر یہ لوگ اپنے گرد "نہ" کا حصار کھینچ لیتے ہیں اور اس حصار کے ذریعہ اپنی حفاظت کرتے ہیں۔

منفی طرزِ فکر رکھنے والا شخص عام طور پر ہر موضوع کا اس کی مخالف سمت سے جائزہ لیتا ہے۔ ہر ایسے مسئلہ کی جس پر گفت و شنید جاری ہو مخالفت میں بولتا ہے۔ افراد' نظریات اور اشیاء کے بارے میں اس کا رفتار و سلوک منفی پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ لہٰذا بہت کم لوگوں

اور اشیاء سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ تنقید کرتا اور نقص و عیب کا متلاشی رہتا ہے۔ اس کے اندر ایک طرح کا احساسِ برتری اور آقائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ قدیم افکار سے بدظن ہوتا ہے اور افکارِ تازہ پر عدم اعتماد کا شکار رہتا ہے۔

منفی طرزِ فکر کے حامل اشخاص اجنبی لوگوں سے ایک طرح کا معاندانہ اور مخالفانہ رویّہ رکھتے ہیں اور اگر کسی اجتماع میں نئے لوگوں سے سامنا ہو تو بہت مشکل سے ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں پر تو یہ کیفیت اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ ہر کسی کے بارے میں سوء ظن رکھتے ہیں اور ہر فکر و نظریہ پر اس کا جائزہ لئے بغیر اور اسے اندر باہر سے پرکھے بغیر تنقید کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت کم دوست ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو صرف وہ لوگ پسند ہوتے ہیں جو انہی کی مانند ہوں اور وہ بھی صرف اس بناء پر کہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے رفاقت و دوستی ان کے عقیدہ و نظریہ کی پیشرفت و اشاعت کا ذریعہ ہے۔" (روان شناسی برای زیستن۔ص ۲۰۰)

اسلام اور استقلالِ نفس

انسان میں استقلال و خود مختاری کے حصول کی خواہش اس کے احساسات کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہے۔ یہ فطری خواہش اس وقت جامۂ عمل پہنتی ہے جب اس رجحان و تمایل کی بنیاد پر طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔

اسلام انسانی تمایلات کے سرچشمے کو مخلصانہ اور پاک نظر سے دیکھتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس کے تعمیری محرکات اور بنیادی باطنی خواہشات کو کچلتا نہیں بلکہ اعلیٰ اہداف کے ارتقاء کی راہ میں ان سے مدد لیتا ہے اور ایک ہی لحظہ میں تحریکی قوتوں کو بھی اور اُن بنیادی قوتوں کو بھی جو ان قویٰ کو نظم و ضبط میں لاتی ہیں غور و دقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اس وسیع اور کشادہ نظر کے بل بوتے پر وہ روح کے مختلف پہلوؤں کا موازنہ کرنے پر قادر ہو جاتا ہے اور پھر اس کی قوتوں کو مناسب اور ثمر بخش مقامات پر کام میں لاتا ہے تاکہ انسانی کمال کے مراحل محکم و استوار قدموں سے طے کر سکے اور اپنی جمع شدہ قوتوں کو زندگی کے بنیادی مقصد کے حصول اور اس اعلیٰ و ارفع مقام تک رسائی کے لئے مصرف میں لائے جو انسانیت کے شایانِ شان ہے۔

ارتقاء کا حصول انسانیت کے مقاصد میں سے ہے، لیکن اگر انسان کی قوتوں کی محدودیت کو نظر میں رکھا جائے تو پست مقاصد پر گامزن رہنے کے لئے اپنی پونجی کو داؤ پر لگا دینے کے بعد اس کے پاس اتنی صلاحیتوں کا باقی بچ جانا محال معلوم دیتا ہے جو اعلیٰ و ارفع مقاصد کی جانب پیش رفت کے لئے کافی ہوں۔

گھٹیا محرکات کا ہمیشہ مثبت جواب دینا انسان کے پستی کے گڑھے میں جا پڑنے کا اصل عامل ہے۔ اس صورت میں انتہائی دشوار ہے کہ انسان گرانقدر سرگرمیوں اور بیش بہا اعمال کا مظاہرہ کر سکے۔

اسلام انسان کے اندر مثبت قوتیں پروان چڑھا کر اسے تمام مشکلات سے مقابلہ کے لئے تیار کرتا ہے۔ تاکہ وہ کٹھن حالات میں بھی ڈٹا رہے اور مسلسل

جدوجہد کے ذریعہ ہر رکاوٹ کو مغلوب کرلے اور طاقتور لوگوں کے سامنے اپنی حیثیت کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت و استوار رہے۔ اس طرح انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور اس کے اندر حیرت انگیز اور انمول روحانی قوّت پیدا ہوجاتی ہے۔

انسان کی عظمت اور استقلال اس بات میں ہے کہ وہ کارزارِ حیات میں عالی ہمتی کا ثبوت دے اور اپنی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے مشکلات کا حل تلاش کرے۔ یہ آرزو اس وقت حقیقت کا روپ دھارتی ہے جب انسان اپنی مادّی و معنوی سعادت تک پہنچنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"من رقی درجات الھمم عظمتہ الامم"

"جو شخص بھی اپنی ہمت بلند رکھے اور اس کے اعلیٰ درجات طے کرے اس کی تعریف و تمجید کی جاتی ہے۔" (غررالحکم ص ۶۶۱)

جو شخص خود اعتمادی سے تہیدست اور استقلال و شخصیت سے عاری ہو اور ہمیشہ سہاروں کی تلاش میں رہتا ہو اور زندگی کی دشوار گزار کٹھن راہوں میں دوسروں کی حمایت کا سایہ تلاش کرتا ہو وہ اس اُمربیل کی مانند ہے جو سر بفلک درختوں کی شاخوں سے لپٹ کر اپنے آپ کو طوفانِ حوادث سے محفوظ رکھتی ہے۔

ممکن ہے کبھی یہ منفی حالت ایک طاقتور انسان کے لئے بندگی و غلامی کی حس میں تبدیل ہوجائے۔ اور جب انسان خود کو اتنا ذلیل وخوار کرلیتا ہے تو

مکمل طور پر اپنی شخصیت اور حیثیت کو گنوا بیٹھتا ہے اور معاملات پر اس کی گرفت ختم ہوجاتی ہے۔ کیونکہ وہ اب ایک رہرو ہوتا ہے، رہبر نہیں۔ اب وہ اپنی ذات کا مالک نہیں رہتا اور نہ ہی اسے اپنی آزادی و ارادہ پر کوئی اختیار رہتا ہے اور جب تک اس کے وجود پر یہ طرزِ فکر مسلّط رہے گا اس وقت تک محال ہے کہ وہ اپنا انسانی امتیاز حاصل کرسکے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"من احتجت الیہ ھنت الیۃ"

"تم جس کسی کے محتاج ہوجاؤ گے، اس کے سامنے ذلّت کا احساس کروگے۔" (غررالحکم ص ۶۶۸)

انفرادی ذمہ داری

اسلامی نظام میں ابدی اور معنوی سعادت کا حصول بھی انفرادی عمل سے وابستہ ہے۔ اصولاً انفرادی مسئولیت کا احساس ہی اسلامی تعلیمات کے نفاذ کا ذریعہ ہے۔ اسلام کی جانب سے دین و دنیا کے تمام شعبوں میں انسان پر جو وظائف و فرائض عائد کئے گئے ہیں ان کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل پر بھروسہ کرتے ہوئے ان معیّن شدہ مراحل کو طے کرے۔ سزاو جزا کا اصول جو اسلامی تعلیمات کے بدیہات میں سے ہے اسی انفرادی عمل کی بنیاد پر استوار ہے۔

قرآنِ کریم واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ انسان کو اپنی سعی و کاوش کے ثمر کے سوا کوئی پاداش نہ ملے گی۔

"کل نفس بما کسبت رھینة"

"ہر شخص اپنے اعمال میں گرفتار ہے۔" (سورۂ مدثر ۷۴۔آیت ۳۸)

"من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینه حیٰوة طیبة و لنجزینھم اجرھم باحسن ماکانوایعملون"

"جو شخص بھی نیک عمل انجام دے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انہیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔"

(سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۹۷)

آخرت میں ملنے والے اجر و عقاب کے علاوہ ہر انسان اس دنیا میں بھی اپنے کئے کا نتیجہ دیکھ لے گا۔

"من عمل سوء یجز به فی الدنیا"

"جو کوئی بھی بُرا کام کرے گا' اسی دنیا میں اپنے کئے کی سزا پالے گا۔" (نہج الفصاحہ ص ۵۹۲)

"من یزرع خیراً یحصد زغبة و من یزرع شراً یحصد ندامة"

"جو کوئی نیکی کا بیج بوئے گا فائدہ اٹھائے گا اور جس کسی نے بدی کا بیج بویا تو اسے پشیمانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

(نہج الفصاحہ۔ص ۶۲۲)

امریکی فلسفی "ایمرسن" لکھتا ہے کہ۔

"دنیا ریاضی کے پہاڑوں (Tables) کے جدول یا الجبرا کی مساوات کی مانند ہے کہ انہیں کتنا ہی اِدھر اُدھر کرلیں پھر بھی خود کو موزوں بنا لیتے ہیں' ان کا حاصل جواب ایک ہی رہتا ہے۔ ہم ریاضی کے ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے خواہ کتنی ہی راہیں اختیار کرلیں لیکن صحیح جواب وہی ایک آئے گا۔

فطرت خاموشی کے باوجود یقینی طور پر اپنے ہر راز کو بَرملا کردیتی ہے۔ ہر گناہ کی سزا دیتی ہے' ہر فضیلت کے اجر سے نوازتی ہے اور ہر زیادتی کی تلافی کردیتی ہے۔

جس چیز کو ہم عذاب کہتے ہیں وہ ایک آفاقی ضرورت ہے۔ ہم دھواں دیکھ کر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آگ سے اُٹھ رہا ہے۔ اگر کسی کے صرف ہاتھ یا پاؤں دیکھتے ہیں تو یقین رکھتے ہیں کہ ان کے پیچھے ایک پیکر موجود ہے۔

ہر عمل کے ساتھ اس کا صلہ ضرور ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فطرت کا قانون عمل میں آکے رہتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ طبیعیات کے عین مطابق ہوتا ہے یعنی ہر عمل کا اسی جیسا ردِعمل ہوتا ہے یہ حقیقی فطرت ہے اور دوسرا طریقہ فطرت کا ظاہری طریقہ ہوتا ہے جس کو ہم جزا یا سزا کا نام دیتے ہیں۔ کوئی بھی عمل ہو اس کے ساتھ اس کی جزا یا سزا ضرور ہوتی ہے اور آنکھ سے دکھائی دیتی ہے' اگر چشمِ سر سے دکھائی نہ بھی دے تو ذرا سا غور کرنے سے عقل کی آنکھ سے ضرور نظر آجاتی ہے۔ دوسرے طریقے میں جو سزا

ہوتی ہے وہ اصل کام سے جدا نہیں ہوتی البتہ اکثر ایک طویل مدّت
تک ظاہر نہیں ہوتی۔
کسی مخصوص گناہ کی سزا ممکن ہے اس کے وقوع کے سالہا سال بعد
ملے لیکن ملتی ضرور ہے کیونکہ یہ جرم کا لازمہ ہے اور زنجیر کی کڑیوں
کی مانند اس سے پیوست ہے۔ جرم اور سزا ایک ہی تنے کی شاخیں
ہیں۔ جزا وہ لذیذ پھل ہے جو یک بیک شگوفہ سے پھوٹ پڑے۔"
(فلسفۂ اجتماعی۔ص ۳۷۸)

عمل کی پرکھ کا پیمانہ

اسلام انسان کو عمل پر ابھارنے والے باطنی محرّکات پر خاص توجہ دیتا ہے
اور کاموں کو "نیت" کے محور پر استوار کرتا ہے۔
ہر عمل خوبی اور بدی کے دو مختلف پہلو رکھنے کے ساتھ ساتھ مزید دو
پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ممکن ہے کوئی عمل ایک پہلو سے
گرانقدر و ارفع اور دوسرے سے بے قیمت و پست ہو۔ اس سلسلہ میں دیکھنے
کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس نفسانی و روحانی محرّک نے فاعل کو اس فعل کی
انجام دہی پر ابھارا ہے اور انسان فکری طور پر کس مقصد کا جویا ہے۔
ان معاملات میں عام طور پر ہم عمل کے اجتماعی و خارجی اثرات دیکھ کر
فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر فاعل کی نیت نہیں ہوتی۔ اس طرزِ تفکر کی
رو سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نیک کام کرنے والے کا مقصد ریاکاری
اور نفع اندوزی تھا یا کوئی عالی محرّک اور کوئی پاکیزہ قلبی نیت اس عمل کا سبب

تھی۔ پس عام طور پر نیک عمل اسے سمجھا جاتا ہے جو معاشرہ کے لئے مفید ہو،
اس طرزِ تفکّر میں عمل انجام دینے والے کی روح کی بلندی سے کوئی غرض نہیں
ہوتی اور نہ یہ پیشِ نظر ہوتا ہے کہ کونسا عامل اس کام کی انجام دہی میں موثر رہا
تھا۔
لیکن خداوندِ عالم کے نظام میں عمل کی کمیّت پر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ
درگاہِ باری میں عمل کی کیفیت اور فاعل کی نیت اور باطنی محرّکات کو پیشِ نظر
رکھا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کو اہمیت دی جاتی ہے کہ فعل اور فاعل کے
درمیان کس قسم کا ارتباط تھا اور کس ہدف و نیت کو سامنے رکھتے ہوئے کام کیا
گیا تھا۔ اگر نیک کام سے اس کا مقصد تظاہر رہا تھا تو نہ صرف یہ کہ ایسے شخص
کی روح بلند نہ ہوگی بلکہ وہ پستی کا شکار ہوجائے گا۔ کیونکہ مذہبی نکتہ نظر سے
عمل کی صالحیت کے لئے اس کا محض معاشرہ کے لئے مفید ہونا ہی کافی نہیں۔
معاشرہ کے لئے ایک مفید عمل اس وقت روحانی کمال کے لئے سودمند ہے جب
اس میں خودنمائی اور خواہشاتِ نفس کی پرستش کا شائبہ تک نہ ہو اور مکمل
اخلاص و صفا پر مبنی ہو۔
قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ۔
"وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین"
"اور انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خدا کی عبادت کریں
اور عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں۔" (سورۂ بینہ ۹۸۔آیت ۵)
رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں۔
"انما الاعمال بالنیات"

"عمل کی قدر و قیمت نیت سے وابستہ ہے۔" (نہج الفصاحہ ص ۱۹۰)

مذکورہ ثابت و معیّن بنیاد پر اعمال کی قبولیت اور قدر و قیمت کے درجات میں تمیز کی جاتی ہے۔ درگاہِ الٰہی میں ایسا ہی عمل درجہ قبولیت کو پہنچے گا جو خالص رضاء باری کے لئے ہو اور وہی بندہ بلند درجات حاصل کرے گا جس کا عمل صرف اور صرف خوشنودیٔ رب کے لئے ہو۔

خدا پر مضبوط ایمان کی ایک دلیل خالص نیت کا حامل ہونا اور صرف اسی کی خوشنودی کا طالب ہونا ہے۔ اس صورت میں اعمال کو ایک خاص قدر و قیمت اور امتیاز حاصل ہوجاتا ہے اور اس نیت کے ساتھ عمل انجام دینے والا خداوندِ عالم کے بے کنار لطف و کرم کا حقدار قرار پاتا ہے۔ یہ بیش قیمت و محکم معیار انسان کے عمل، تحمل اور درک و احساس کی حدود سے باہر نہیں۔

جس شخص کے قلب میں عظمتِ الٰہی کی مشعل روشن نہ ہو اور جس کا دل اخلاص و ایمان سے خالی ہو اس کو عمل پر اکسانے والے محرکات نفسانی خواہشات یا ناپائیدار شہرت ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے عمل کا آغاز و اختتام بے روح اور خالی از حقیقت ہوتا ہے۔ اس کا مطمع نظر ہوتا ہے کہ لوگ اسے عزّت و احترام کی نظر سے دیکھیں اور پاک انسانی فضائل کا مالک سمجھیں۔ یہی پست ہدف درگاہِ خدا میں اس کے اعمال کے رد ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی آلودہ متاع بارگاہِ الٰہی میں کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں ہوتی اور اپنے پیشِ نظر محدود و ناچیز ہدف تک رسائی کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

وہ لوگ جو اعتمادِ نفس سے سرشار اور اپنے عمل پر بھروسہ کرنے والے ہیں وہ خودنمائی اور تظاہر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ خودنمائی ان لوگوں کا شیوہ

ہے جو فاقد العمل، اعتمادِ نفس سے عاری اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔

ایسے لوگوں کے بارے میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"لسان المرائی جمیل وفی قلبہ داء دخیل"

"ریاکاری کرنے والے کی زبان میٹھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں بیماری پائی جاتی ہے۔" (غرر الحکم ص ۱۰۶)

"الافتخار من صغر الاقدار"

"خود پر فخر کرنا آدمی کی پستی کی علامت ہے۔" (غرر الحکم ص ۶۱۰)

معروف نفسیات دان (شاختر) کہتا ہے کہ۔

"بعض لوگ ناکامی اور شکست کے بعد بھی دوسروں کی توجہ کے حصول کی غرض سے ایک اور کام کرتے ہیں اور وہ ہے لاف زنی اور خود اپنے منہ میاں مٹھو بننا۔ یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے حسبِ دلخواہ کام کرنے کے نتیجہ میں ان کی آرزو بر آئی ہے۔ یا اگر کامیابی حاصل نہ کرسکے ہوں اور اس سلسلہ میں کوئی اہم اور نمایاں کام بھی نہ کیا ہو تب بھی اپنی کارگزاری کا بار بار تذکرہ کرکے (خواہ وہ انتہائی معمولی ہی کیوں نہ ہو) اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے لوگ یہ عمل انجام دے کر خود کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں اور اس قدر جھوٹ و فریب کے ذریعہ خود اپنے آپ کو مطمئن و مسرور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ رفتہ رفتہ ہر قسم کی سعی و جہد سے دستکش ہوجاتے ہیں۔

اگرچہ خود اپنی تعریف کرنا اور ڈینگیں مارنا انسان کو تھوڑی دیر کے لئے ناکامی کے عذاب سے نجات دلا دیتا ہے اور اپنی شکست سے توجہ ہٹ جانے کی بناء پر وہ اپنے اندر آسودگی محسوس کرنے لگتا ہے اور وقتی طور پر اپنے مخاطبوں کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن بہرحال یہ درد کی دوا نہیں۔

جو شخص صحیح کام انجام دے سکتا ہے اس کے لئے کامیابی کا حصول ممکن ہے اور اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کے دلوں پر راج کر سکتا ہے۔ اسے لاف زنی اور خودستائی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے بجائے وہ سعی و عمل انجام دیتا ہے اور ہر روز دوستوں اور بہی خواہوں میں اضافہ اور عظیم کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔"

(رشدِ شخصیت۔ص ۹۲)

"شوپنھاور" کہتا ہے کہ۔

"خودستائی لوگوں کو آپ سے نفرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرف تو دروغ اور فریب کی علامت ہے اور دوسری طرف انسان کی حماقت و نادانی کا سبب ہے۔ جو شخص مسلسل اپنی کسی صفت کا دم بھرتا رہتا ہے وہ قطعی طور پر اس صفت سے محروم ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو ہمیشہ اپنی کامیابیوں، اپنی عقل و تدبیر اور قوّت و صلاحیت کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں یقین جانئے یہ لوگ ان خصوصیات سے کُلّی طور پر عاری ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جھوٹ و فریب زیادہ عرصہ نہیں چل پاتا اور ان

مذموم صفات کا حامل انسان بہت جلد اپنی عزّت گنوا بیٹھتا ہے۔"

(افکارِ شوپنھاور۔ص ۹۲)

دوسروں کو اپنے ہی جیسا سمجھنا

جب کوئی انسان آلودگی اور پلیدگی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے تو وہ دوسروں کے اعمال و کردار کی بھی اپنی ناپاک و آلودہ نیت اور کردار کی بنیاد پر توجیہ کرتا ہے اور انہیں بھی اپنی ہی مانند سمجھتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"الرجل السوء لا یظن باحد خیراً لانہ لا یراہ الا بطبع نفسہ"

"پلید و آلودہ شخص دوسروں کے بارے میں سوء ظن رکھتا ہے کیونکہ وہ انہیں بھی اپنے ہی جیسا سمجھتا ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۱۰۴)

یہ بات علمی طور پر بھی ثابت ہے اور نفسیات داں اس کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"جب دنیا ہمارے عواطف و افکار اور تمایلات کی حدود سے بھی زیادہ آلودہ ہو جاتی ہے تو مسلّم ہے کہ ہم اس میں موجود ہر چیز کو اپنی مخصوص نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا ہمارے احساسات کائنات پر سایہ فگن ہو جاتے ہیں، تیز ہوا ہمیں ناامیدی و یاس میں گرفتار کر دیتی ہے۔ نرم و لطیف بادِ بہاری ہمارے اندر سکون و راحت کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس طرح طبیعت کو ہم اپنے احساسات کے

دریچے سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنے احساسات کے فرمان کے تحت ممکن ہے کسی بلی کو ہم ایک ظریف اور پسندیدہ حیوان سے تعبیر کریں یا ایک موذی کو نفرت انگیز حیوان سمجھیں۔ احساسات و عواطف ہمارے سامنے مکمل طور پر اس دنیا کو بدل کر رکھ دیتے ہیں جس میں ہم زندگی بسر کررہے ہوں۔ باالفاظ دیگر یہ کہ ہمارے لئے ایک جہانِ نووجود میں لاتے ہیں۔

ایک روز ایک شخص نے کسی جگہ کوئی چیز بجائی اور وہاں موجود لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کس چیز کی صدا ہے؟ تمام حاضرین نے علیحدہ علیحدہ جوابات دیئے۔ ایک نے کہا مجھے سیٹی کی سی آواز محسوس ہوئی تھی، دوسرے نے کہا میں نے بگل کی آواز سنی تھی، تیسرے نے کہا کوئی انسان بول رہا تھا، علیٰ ہذا القیاس ہر ایک نے ایک نئی بات کہی۔

یہاں یہ بات مسلّم ہے کہ جو آواز ہر سننے والے کے کان میں گئی وہ اس کے تجربات کے مطابق ہوگی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے ایک صدا اس قدر مختلف اثرات نہیں رکھ سکتی بنابرایں اس آہنگ کو مختلف لوگوں کے مختلف سمجھنے کی وجہ ان کا ذاتی تجربہ تھا۔

معروف داستان "ایڈگاپور" میں قاتل بچے کے گلے سے نکلنے والی غصیلی آواز کی اسے سننے والے جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور روسی لوگ مختلف تعبیریں کرتے ہیں۔

جج اور وکیل صاحبان جانتے ہیں کہ بہت ہی کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کسی سادہ سے واقعہ کو انتہائی نزدیک سے دیکھنے والے لوگ بھی جب

گواہی کے لئے پہنچیں تو اسے یکساں انداز میں بیان کرسکیں۔"

(روان شناسی برای ہمہ۔ص ۲۵۹)

خدا پر ایمان کا حیرت انگیز اثر

اپنی ذات پر ایمان نہ صرف خداوندِ عالم پر توکّل سے منافات نہیں رکھتا بلکہ خداوندِ عالم پر اعتماد اور اس کی لایزال قدرت سے مدد چاہنا انسان کی قدرتِ نفس اور اس کی شخصیت کے انبساط کا ذریعہ ہے۔

باایمان شخص اپنی ذات پر اعتماد اور شخصیت پر استقلال کے سرمایہ کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اختیار میں موجود امکانات سے مکمل اور بھرپور استفادہ کرتا ہے۔ اور میسّر مواقع کو ضائع نہیں کرتا۔ بااین ہمہ اپنی روح کو مادّی علل و عوامل میں محصور نہیں کرتا اور اس کی انسانیت مادّی حصار میں محدود ہوکر نہیں رہتی بلکہ اس کی بلند پروازی اعلیٰ اہداف کے حصول تک جاری رہتی ہے۔

ایسا انسان جس کا قلب نورِ ایمان سے لبریز ہو اس کا بھروسہ و اعتماد اس خداوندِ عالم پر ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں تمام امورِ کائنات کی تدبیر ہے اور کسی کام میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

"ما یفتح اللّٰہ للناس من رحمة فلا ممسک لھا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ وھو العزیز الحکیم"

"اللہ انسانوں کے لئے جو رحمت کا دروازہ کھول دے اس کا کوئی

روکنے والا نہیں ہے اور جس کو روک دے اس کا کوئی بھیجنے والا نہیں
ہے' وہ ہر چیز پر غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔"

(سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۲)

بشر خداوندِ عالم کے دستِ قدرت سے بچ کر کہاں جاسکتا ہے؟ غیرِ خدا کی
آغوش میں پناہ لینے کا نتیجہ سوائے ذلّت وخواری' زبونی و پستی کے کچھ بر آمد نہ
ہو گا۔ ایسی بے آسرا و عاجز مخلوق جو ہر چیز کے لئے خداوندِ عالم کے سامنے نیاز
مند ہو اور خود سے کسی چیز کی مالک نہ ہو کس طرح دوسروں کے لئے صاحبِ امر
ہو سکتی ہے؟

بنا برایں انسان کے سامنے خُداوندِ عالم کی حمایت اور اسی کے لطف کے
سائے میں زندگی بسر کرنے سے بہتر کوئی راہ نہیں۔ اس خدا کی رحمت کے
سائے میں جس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات ہے۔

سختی اور آسائش ہر حال میں خداوندِ عالم کے سامنے فروتن و خاضع رہنا اور
اس حقیقت پر ایمانِ راسخ رکھنا کہ تمام قدرتوں اور علل و عوامل پر خداوندِ عالم
کی نامحدود قدرت حاکم و فرمانروا ہے انسان کی روح پر حیرت انگیز اور خوشگوار
اثرات مرتب کرتا ہے اور انسانی قلب و ضمیر میں ایسا اطمینان و آسودگی پیدا
ہو جاتی ہے جو کسی بھی مشکل صورت میں اس سے جدا نہیں ہوتی
اور کوئی بھی چھوٹی بڑی بات اسے مضطرب اور دلگرفتہ نہیں کرتی۔

جب انسان اپنی روح و ادراک کو مقدور بھر حق کے حوالے کردیتا ہے اور
اس کی روح خداوندِ عالم کی اطاعت سے سرشار ہو جاتی ہے تو پھر ناگوار حوادث
کے موقع پر وہ نالہ و فریاد بلند نہیں کرتا اور نہ ہی کامیابیاں اسے بدمست و مغرور

بناتی ہیں۔ ایسے تمام امور جو دوسروں کو خود باختہ کردیتے ہیں اس پر کوئی
نامطلوب اثر نہیں چھوڑتے اور استوار عزم اور اطمینانِ کامل سے سرشار روح
کی بنا پر وہ کسی صورت یاس و ناامیدی میں جو بہت سی ناکامیوں اور شکست کا
موجب ہے بتلا نہیں ہوتا۔

خدا پر بھروسہ کبھی بھی ناتوانی' ضعف اور لاتعلقی پر منتہی نہیں ہوتا بلکہ
ایک ایسی خود اعتمادی عطا کرتا ہے جو قوتِ ارادی کو مضبوط بناتی ہے اور دل سے
ہر قسم کے شک و تردید اور وسوسوں کی جڑ کو اکھاڑ پھینکتی ہے۔

انحطاط کا شکار معاشروں میں ناموافق ترین حالات میں مخرّب عوامل کے
خلاف مردانِ الٰہی کی سعیِ پیہم ایک حقیقتِ لامحدود پر بھروسہ سے قوت حاصل
کرتی ہے اور وہ اپنے اصلاحی لائحہ عمل کے اجراء اور خلقِ خدا کی رہنمائی کے
سلسلہ میں اسی نامرئی عامل سے مدد لیتے ہیں اور کیونکہ ان لوگوں کی روح خداوندِ
عالم کی لازوال قدرت کے اٹوٹ بندھن میں بندھی ہوتی ہے لہٰذا وہ نہایت
قاطعیت کے ساتھ آخری مرحلے تک اپنے ہدف کے حصول کے لئے جدوجہد
کرتے ہیں۔

خدا پر تکیہ کئے بغیر انسان کا محض خود اپنی ذات پر بھروسہ کرنا اس کی روح
کو ناراحتی و ناآسودگی سے نجات نہیں دے سکتا۔ ایسا شخص جسے ذاتِ پروردگار
پر بھروسہ نہ ہو اور جس کی نگاہ مادّہ اور مادّیات کی سرحد سے آگے نہ جاتی ہو اس
کی روح کو دشواریاں اور نامساعد عوامل توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ دریں
حالات وہ کمال و ارتقاء کے مدارج پر پیش قدمی سے محروم رہتا ہے اور انتہائی
عظیم حقائق و معارف کو درک کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اس کی

خواہشات و میلانات کے خلاف رونما ہونے والا معمولی سا حادثہ بھی اسے رنجِ گراں سے دوچار کردیتا ہے۔ یا وہ خوفناک مشکلات کے مقابلہ سے فرار اختیار کرتا ہے۔

ہم صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی روحانی کیفیت کا جائزہ لے کر' جو خداوندِ عالم پر اعتماد و یقین کا بہترین نمونہ تھے اس موضوع کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔

ایسے لوگ جو اپنے عقیدہ کی پیشرفت اور ہدف کے حصول کی جستجو میں مصروفِ کار رہے ہیں اور ایک جدید اور سعادت مند معاشرہ کی تشکیل کی غرض سے نہایت طاقت فرسا اور دشوار حالات میں سعی پیہم جن کا شیوہ رہی ہے۔ ان کی طرف کسی صورت عاجزی و سستی، منفی حالت اور بے تعلقی کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

ایسے لوگ جنہوں نے اس پر تحرک مکتب (اسلام) میں تربیت پائی ان پر کبھی بے اطمینانی غالب نہیں ہوئی اور سکون و اطمینان کے حامل ان کے ارادۂ استوار ہی کی طاقت ہے جس نے ان کے سامنے ترقی کی راہیں کھولیں اور ایک بے نظیر اور یگانہ تاریخ معاشرہ قائم کیا۔

جو شخص یہ چاہتا ہے کہ زندگی میں اپنے مقام کا جائزہ لے اور یہ جاننا چاہے کہ اس نے میدانِ حیات میں کس راہ کا انتخاب کیا ہے' خیر و سعادت کی منزل کی جانب گامزن ہے یا نکبت و فلاکت کی طرف وہ اپنی روحانی احتیاجات سے شناسائی کے بعد بخوبی ان عوامل و شرائط سے مقابلہ کرسکتا ہے جو اس کے روحانی اعتدال میں خلل کا سبب بنتے ہیں اور ان عوامل و شرائط کو کسی صورت اس

بات کی اجازت نہ دے گا کہ وہ اس کے خلاف متحد ہو جائیں۔ یہ مسلّم ہو جانے کے بعد کہ نقص و عیب نے انسان کے وجود پر تسلّط حاصل کرلیا ہے جب تک اس کے سبب کا تعیّن نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا علاج ممکن نہیں۔

ایسے لوگ جو عدم اعتماد کا شکار ہوں اور ناکامی کے خوف سے کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے کتراتے ہوں ان کے لئے بہترین راہِ حل یہ ہے کہ سب سے پہلے اس نقص کے عوامل و اسباب کی چھان بین کریں۔ کیونکہ ہر قسم کی بیماری کے علاج سے قبل اس کے علل و اسباب سے واقفیت ضروری ہے۔ اور یہی طریقہ اختیار کرکے وجود کی گہرائیوں تک راہ پائی جاسکتی ہے اور علاج کی کلید ہاتھ آسکتی ہے۔

بے شک کسی شخص پر یہ ثابت ہو جانا کہ اس میں کہاں نقص پایا جاتا ہے ان کوششوں میں سب سے زیادہ ثمر رساں کردار ادا کرتا ہے جو وہ اپنے نقائص کی تلافی اور انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کررہا ہوتا ہے۔ کیونکہ ناموافق روحانی عوامل سے مقابلہ انسان کی قدرت اور صلاحیت کے ہاتھ میں ہے۔

ہر بُری عادت اس ضعف کی علامت ہے جو اس عادت کی تکرار کی بنا پر انسان کو لاحق ہوتی ہے اور بالآخر ایک دیرینہ بیماری کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اگرچہ ابتداء میں عادت کو بدل ڈالنا ذرا مشکل محسوس ہوتا ہے لیکن بار بار کی ریاضت اور مشق کے ذریعہ عادت کو اس دوسری راہ پر ڈالا جاسکتا ہے جو سابقہ نقص سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر زیاں بار عادت پر غلبہ روحانی صفا و امتیازی خصوصیات کے حصول کی راہ میں ایک عظیم کامیابی کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

"بغلبة العادات الوصول الی اشرف المقامات"

"انسان ضرر رساں عادات پر غلبہ حاصل کر کے ارجمند و عالی درجات تک پہنچ جاتا ہے۔" (غرر الحکم ص ۳۳۵)

چودھواں باب

خوف بھی رجا بھی

غریزۂ خوف

خوف ہر ذی روح کے اساسی غرائز میں سے ایک اور ان بدیہی کیفیات کا جز ہے جن کا اظہار وہ کسی خطرہ کا سامنا ہونے پر کرتا ہے۔ کارگاہِ حیات میں جب کبھی انسان کسی ایسے دوراہے پر جا پہنچے جہاں اسے فرار کی صورت میں جان کی سلامتی نظر آئے اور قرار کی صورت میں نابودی یا کسی مشکل میں پھنس جانے کا خدشہ ہو تو خوف اسے اپنی بھرپور قوت کے ساتھ بقائے حیات کی راہ اختیار کرنے پر اکساتا ہے۔

اگر ماقبلِ تاریخ کے انسان گوناگوں خطرات سے احتراز کی روش پر گامزن نہ ہوتے تو آج نسلِ انسانی کا نام و نشاں بھی نظر نہ آتا اور انسانی حیات اسی دور میں دم توڑ دیتی۔

خوف نہ صرف انسانی جسم کو خطرات اور نابودی سے محفوظ رکھنے میں موثر ہے بلکہ انسان کے مقام و حیثیت اور مرتبہ و شخصیت کی حفاظت کے سلسلہ میں بھی کارگر ہے۔ عام تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ دوسرے ہر کسی خطرے سے زیادہ لوگوں کو اپنے اوپر دوسروں کے تسلّط کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ اس راہ سے انسان کے دامن گیر ہونے والا خوف ممکن ہے انسان کو مہینوں اور برسوں ہر قسم

کی جنبش و حرکت اور فعالیت و سرگرمی سے باز رکھے اور وہ اپنی جگہ ساکت و صامت رہے۔

درحقیقت اس خوف کی وجہ شخصیت و حیثیت کے داغدار ہو جانے یا اسے کھو بیٹھنے کا خطرہ ہے۔ اس مشکل میں گرفتار شخص محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے ہر قسم کے عزم و ارادہ کا اختیار سلب ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں دوسروں سے مدد لینا اور ان کی مدد سے اپنے لئے کسی راہ کو دریافت کرنا ناگزیر ہے۔

جس قدر انسان کو اپنی شخصیت کے چھن جانے کا احساس شدید ہوگا اسی قدر اسے وحشت ستائے گی اور بسا اوقات یہ حالت جنون کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے (اور خود ہم نے بھی گفتگو کے آغاز میں اس کا اظہار کیا) کہ خوف ذاتی غرائز میں سے ہے اور بقائے حیات کے لئے مفید ہے تو یہ اس صورت میں ہے کہ جب وہ حدِّ اعتدال میں ہو۔ خوف جب افراط کی جانب بڑھنے لگتا ہے تو وہ زیاں بخش بن جاتا ہے۔

بے بنیاد اور خیالی خوف و ہراس بے جا توہمات اور وسوسوں کا نتیجہ ہے۔ بدبختی اور ناراحتی کے واقع ہونے سے قبل ان کا امکان ظاہر کرنا ایک طرح کی تکلیف وہ بیماری ہے جو فکر و شعور کی قوتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ ماہرین کے مطابق بے شمار لوگ اس بیماری کی بنا پر اپنی صحت و سلامتی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بلکہ یہ اور بہت سے نقصانات کا سبب بھی بنتی ہے۔

بارہا دیکھا گیا ہے کہ خوف و ہراس کی بنا پر موت واقع ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات خوف و تشویش ایک ایسی بیماری کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں جو انسان میں انتہائی شدید نفسیاتی تغیرات رونما کرتی ہے۔

بعض افراد کسی مبہم اور نامعلوم وحشت میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنے خوف کی وجہ بتانے سے عاجز رہتے ہیں۔ یا پھر انتہائی نزدیکی افراد ان کے درد آشنا ہوتے ہیں۔ البتہ عمر کا تقاضا بھی خوف و اضطراب کی کیفیت پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت بچپنے کی خصوصیات میں سے ہے۔ بچپن کی سرحد عبور کرنے والے وہ تمام لوگ جو ابھی شعور و ادراک کی منزل پر نہ پہنچے ہوں اور چیزوں کو تمیز و تشخیص دے سکنے کے زمانے سے دور ہوں ان کی روح خواہ ناخواہ، کم یا زیادہ ایک طرح کے خوف و وسواس کے عالم میں رہتی ہے اور بالآخر یہ بڑا عیب انسان میں موجود پیشرفت و ترقی کی حس اور کامیابی کے تمام عناصر کو نابود کر کے رکھ دیتا ہے۔ بدن اور ذہن کی فعالیت کو گھٹا دیتا ہے اور انسان کے ہاتھوں انجام پانے والے تمام کاموں میں اس کے بڑے آثار نمایاں طور پر جھلکنے لگتے ہیں۔ نیز اس قسم کا خوف کسی طرح بھی سودمند نہیں ہوتا اور احتمالی خطرات خواہ رونما ہوں یا نہ ہوں ان سے قبل از وقت خوفزدہ ہونا وقت کے اتلاف اور معنوی اور جسمانی صلاحیتوں کے نقصان کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دیتا۔ ان مضرآت کی بنا پر بدبختی اور مشقت کے ظاہر ہونے کے وقت انسان میں ان سے مقابلہ کی جرات و قوت باقی نہیں رہتی۔

خوف و ہراس کی حالت متعدد صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر "کولز" کہتا ہے۔

"کیا آپ کو اپنی ذات پر اعتماد نہیں؟ کیا آپ خود کو حالاتِ زمانہ کا سامنا کرنے پر قادر نہیں پاتے؟ کیا آپ ایک سخت و دردناک نقص کی بنا پر نالہ و فریاد بلند نہیں کرتے؟ کیا لوگوں کا ہجوم آپ کو مضطرب

کر دیتا ہے اور کسی سے اکیلے میں ملنے سے خوف و تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ کیا واقعی آپ صرف تنہائی میں سکون و اطمینان محسوس کرتے ہیں؟

اگر مذکورہ سوالات کا جواب آپ "ہاں" میں دیں گے تو اس صورت میں آپ ڈرپوک ہیں۔"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ لوگ آپ کو بے وقوف سمجھتے ہیں؟ آپ کو اچھی طرح نہیں پہچانتے؟ ہمیشہ آپ کی مخالفت کرتے ہیں؟ کیا آپ اپنے ماضی اور ہاتھ سے گئی چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ سوچتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ماضی میں کسی چیز یا کسی شخص کی نسبت آپ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں خواہ یہ گناہ وقوع پذیر ہوا ہو یا نہیں؟"

کیا آپ ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچتے رہتے ہیں؟ کیا ہمیشہ اپنے اوپر آنے والی احتمالی مشکلات سے خوفزدہ رہتے ہیں؟ کیا لوگوں کی یاوہ گوئیاں جلد آپ پر اثر انداز ہو جاتی ہیں؟ کیا غصّہ کے موقع پر خود کو بے قابو ہونے سے بچانے کے لئے غصّہ ٹھنڈا کرنا ضروری سمجھتے ہیں؟ کیا عام طور پر لوگوں سے ملنے جلنے سے بیزار رہتے ہیں؟ کیا اپنے تعصبات میں شدّت برتتے ہیں؟ کیا لوگوں سے دوستی اور محبت کا رشتہ استوار کرنے میں تردد کا شکار رہتے ہیں؟

یہ تمام علامات خوف کے گوناگوں رنگ ہیں۔"

(غلبہ بر ترس و خستگی۔ ص ۶۵-۶۴)

جب انسان زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے طے کئے ہوئے اصولوں پر سختی سے عمل در آمد کرنے پر آمادہ ہو تو مصائب اور دشواریوں کو بہادری کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ مشکلات سے مردانہ وار نبرد آزما ہوتا ہے اور یاس و ناامیدی کو اس کے قریب پھٹکنے کی جرات تک نہیں ہوتی۔

بہت سے لوگ جو اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر زندگی میں حساس اور نمایاں مقام حاصل کرسکتے ہیں اور اپنے ذہن سے خوف و ہراس دور رکھنے کی کافی قوت رکھتے ہیں، ضروری شجاعت کے فقدان کی بنا پر شاہراہِ ترقی پر پہلا قدم بھی نہیں اٹھاپاتے لہٰذا ان میں موجود تمام صلاحیتیں برباد ہوجاتی ہیں۔

وہ چیز جو زندگی کی باگ ہاتھ سے چھوٹ جانے کا سبب بن سکتی ہے غیرذمہ داری اور ناتمام ارادے باندھنا ہے۔ اپنا وقت ضائع کرنا اور ایسے سانحوں کے بارے میں سوچنا جن کا ممکن ہے کبھی بھی سامنا نہ ہو انسان کو ناقابلِ تلافی خطرات و نقصانات سے دوچار کردیتا ہے۔

"شیکسپیر" کہتا ہے۔

"جو شخص شہد کی مکھی کے ڈنک سے ڈرتا ہو اس میں شہد کے چھتے کا مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔"

ہر زمانے میں، ہر شخص کے پاس اپنے بے جا خوف سے نجات کا امکان موجود ہے اور وہ اپنے ذہن سے فضول خیالات کو نکال کر اُن کی جگہ مفید اور امید افزا خیالات کو دے سکتا ہے۔

کسی شخص کا ارادہ خواہ کتنا ہی قوی ہو اور اس کا کمالِ مطلوب کتنا ہی ارجمند و عالی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ اپنی بعض عادات سے دفعتاً نجات حاصل نہیں

کرسکتا۔ ایسی عادات کو بتدریج ختم کرنا چاہئے۔

انسان کا صرف اپنے اضطراب کی بے بنیادی سے آگاہ ہوجانا اس سے نجات کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ اس مقصد کے لئے مسلسل کوشش ضروری ہے۔ اسے چاہئے کہ آزار پہنچانے والے اندیشوں کے سرچشمہ کو بند کرے، اور اس کے بَرخلاف مثبت خیالات کے لئے ذہن کے دریچے مکمل طور پر کھول دے۔ اسی طرح عظیم کامیابیوں کے لئے زمین ہموار ہوسکتی ہے۔

جس طرح بلب روشن اور گُل کرنے کے لئے بجلی کے بٹن کو استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح انسان کو چاہئے کہ جب اس کی روح کو وحشتناک تاریکیوں نے گھیرا ہوا ہو تو وہ فکر و شعور کی کلید کو استعمال میں لائے اور زندگی کی حقیقتوں اور روشنیوں کو دیکھے تاکہ اس کا ذہن بے جا خوف و ہراس کے بارِ گراں سے چھٹکارا حاصل کرسکے۔

ایسا شخص جو زندگی کے معمولی معمولی مسائل تک کے بارے میں بے بنیاد اندیشوں میں مبتلا ہو، اسے چاہئے کہ سب سے پہلے ان اندیشوں کی چھان بین کرے جو اس کے روحانی اور ذہنی اعتدال کو درہم برہم کئے ہوئے ہیں۔ تاکہ اسے معلوم ہوجائے کہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو کر کوئی مثبت کام انجام نہیں دیا جاسکتا بلکہ ہر کام اپنی تکمیل کے لئے چارہ جوئی کا متقاضی ہے۔ پھر اسے چاہئے کہ بے بنیاد خیالات اور لغو تصوّرات کی جگہ روح کے گلزار میں امید و آرزو کے پودے کاشت کرے اور ایک ماہر باغبان کی مانند اُن کی پرورش کرے۔

بے شک خوف و ہراس آدمی کے اپنے خیالات کی پیداوار ہے اور ایسے خطرات صرف انسان کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، خارج میں ان کا کوئی وجود

نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت روشن ہو جانے کے بعد انسان بڑی حد تک اپنے خوف و ہراس پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے اور اسے ایک انمول آسودگی میسّر ہو جاتی ہے۔

نہ بزدلی اور نہ ہی گستاخی

علمِ اخلاق کی رو سے ہر "فضیلت" افراط و تفریط کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ بنابرایں "شجاعت" وہ فضیلت ہے جو گستاخی اور بزدلی کے وسط میں واقع ہے۔ جو شخص ایک سمت سے گستاخی اور دوسری سے بزدلی سے دامن بچائے ہوئے ہو وہ "شجاع" کہلائے گا۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مختلف میدانوں میں انسانی ایجادات حتیٰ قدرتی منابع اور برِاعظموں کا انکشاف تک بہادری اور شجاعت کے مرہونِ منّت ہے۔ اسی فضیلت کے حامل افراد نے بعض علوم و فنون کو ترقی و کمال کی سرحدوں تک پہنچایا ہے۔

روحانی قوتیں ہی انسان کی ترقی و سربلندی کا اصل عامل ہیں اور زندگی کے میدان میں وہی شخص عظیم اور نمایاں کامیابیاں حاصل کرتا ہے جو طاقتور روح کا مالک ہو۔ شجاعت و شہامت کے بغیر ہرگز فکری و سماجی انقلابات کا ظہور ممکن نہیں۔

مادّی اور معنوی پیشرفت کے سلسلہ میں اس نمایاں صفت کا کردار اور اس سلسلہ میں حاصل ہونے والے عملی تجربات اس موضوع کے بارے میں بدبین ترین افراد کو بھی اس کا معتقد کردیتے ہیں۔ طاقتور روح کے حامل افراد کے کردار و عمل کی قوّت اور اثر و نفوذ بخوبی اس مسئلہ کو ثابت کرتے ہیں۔

تاریخ کی وہ عظیم شخصیات جنہوں نے اپنی قوموں کی نجات میں بھرپور اور انتہائی موثر کردار ادا کیا ہے اور انہیں جانفرسا حالات سے رہائی دلائی ہے عموماً پر تحرّک اور روحِ شجاعت سے سرشار ہستیاں تھیں۔ اور اسی صفت کے کمال کی بناء پر ان کی دوسری استعدادوں نے بھی جِلا پائی تھی۔

بنابرایں اس عظیم اخلاقی صفت (جو سودمند ترین انسانی فضائل میں سے ایک ہے) کے حصول پر توجہ دینا ہر شخص کا فریضہ ہے۔ وہ مسائل جنہیں حل ہونا چاہئے، وہ کام جنہیں انجام پانا چاہئے اور وہ نتائج جو حاصل ہونا چاہئیں گو کہ ہر کسی کے ساتھ مختلف ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کا جامۂ عمل پہننا انسان کی شجاعت سے وابستہ ہے۔

کتنی ہی مفید تجاویز، سودمند خیالات اور اصلاحی نظریات ہیں جو بعض افراد کے ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں لیکن خوف و وحشت کی بنا پر وہ لوگ ان کے اظہار سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت انتہائی استعداد اور لیاقت کے حامل ہونے کے باوجود شجاعت کی روح سے عاری ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ کیونکہ جرات نہیں رکھتے اس لئے اپنے افکار کی درستگی پر ایمان رکھنے کے باوجود کمالِ اطمینان کے ساتھ انہیں لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرپاتے۔ جب کبھی انہیں اپنے منصوبے اور پلان دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے فوراً ان پر خوف و سراسیمگی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ خود اپنے افکار کے بارے میں بے یقینی میں مبتلا ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ سماجی اور علمی موضوعات پر منعقدہ بعض مباحثوں میں دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ محض اس احتمال کی بنا پر کہ مخالف آراء کا

سامنا کرنا پڑے گا اپنے نظریات کا معمولی سا دفاع کئے بغیر ہی پسپائی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے الفاظ کو واپس لے لیتے ہیں۔ ہرچند ان کے افکار و خیالات دوسروں سے کہیں زیادہ منطقی اور مستدل ہی کیوں نہ ہوں۔

کسی انسان میں اس حالت کے پیدا ہونے کے اسباب و عوامل پر تحقیق کی جانی چاہئے، جب تک ان عوامل کی تشخیص نہ ہو جائے فکری آسودگی اور نفسیاتی شہامت کا حصول ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ شخص اپنے بچپنے میں پُر امید اور بلند ہمت رہا ہو لیکن بعض حوادث کے ظہور نے اس کی استعداد کی پرورش روک دی ہو۔ یا اس کے اساتذہ اور سرپرستوں نے اپنی غفلت یا جہالت کی بنا پر ان ثمر بخش اور بلند افکار کو پنپنے سے قبل ہی سرکوب کر دیا ہو۔

جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ کسی شخص کے اندر تعمیری صلاحیتیں کمزور پڑ چکی ہیں تو انہیں تقویت پہنچانے کے لئے بنیادی طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اگر وہ اپنے پورے وجود پر مسلّط بے وجہ کے خوف سے نجات حاصل کر سکتا ہے تو بتدریج اس کے اطمینانِ نفس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ شہامت اور شجاعت کی تعمیری قوّت کے بل بوتے پر ہی شک و تردید اور خوف و وسوسہ کی حالت سے چھٹکارا حاصل کر کے اُس کی جگہ سکون و راحت کو جگہ دی جاسکتی ہے۔

زندگی کی خصوصیات سے ناواقفیت

اضطراب کی شدّت اور اس کے ایک خطرناک خوف کی صورت میں تبدیل ہو جانے کے متعدد عوامل میں سے ایک عامل زندگی کی خصوصیات سے

ناواقفیت ہے۔ ایک شجاع انسان بخوبی جانتا ہے کہ انسانی حیات طرح طرح کی سختیوں اور مصائب کے ہمراہ ہے اور ان دشواریوں کا سامنا ہونے پر تحمل و بُردباری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ لہٰذا مشکلات پیش آنے سے پہلے ہی خود کو انہیں برداشت کرنے کے لئے تیار رکھنا ضروری ہے۔

حوادث کے واقع ہونے سے قبل ہی ان سے ہوشیار ہونے کی بنا پر انسان بڑی حد تک ان سے مقابلہ کے لئے پہلے ہی سے تیار ہوتا ہے اور یوں حادثہ اس پر غیر معمولی طور پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص حوادث کا سامنا کرنے پر تیار نہ ہو تو جوں ہی کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے وہ حواس باختہ ہو جاتا ہے اور اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔

غفلت اور بے توجہی حادثات اور ناگوار اتفاقات کو حد سے زیادہ ضرر رساں اور وحشت خیز بنا دیتی ہے۔ اس کے بَرخلاف حوادث کا سامنا کرنے پر آمادگی کی وجہ سے انسان ان کے آثار و نتائج کو حدِّ اعتدال میں رکھنے کے سلسلہ میں چارہ جوئی کر سکتا ہے اور ان سے مقابلہ کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

"والٹر" کہتا ہے۔

"انسان کو ہمیشہ تلوار کے وار کی مانند آگے بڑھنا چاہئے اور بالآخر شمشیر بکف ہی جان سے گزر جانا چاہئے۔ صرف ناداں و ناتواں افراد ہی حوادث کے تھپیڑوں کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں اور فقط ضعیف اور کمزور اشخاص ہی ہمیشہ مصائب و دشواریوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔

جب تک آپ کو خطرہ کی کیفیت اور اس کے وقوع پذیر ہونے کے

بارے میں شک و شبہ ہو اور جب تک اس حادثہ سے نجات پا جانے
کے سلسلہ میں پُر امید ہوں اس وقت تک ضعف و ناتوانی کا اظہار نا
کیجئے اور جوش و خروش کے ساتھ ثابت قدم رہیے۔"

(افکارِ شوپنھاور۔ص۷۹)

آگاہی و آشنائی خوف و ہراس میں تخفیف کا بنیادی ذریعہ شمار ہوتی ہے۔
جوں جوں انسان علمی ترقی و پیشرفت کررہا ہے اسی قدر اس پر سے جانکاہ خوف کا
دباؤ کم ہورہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے شمار عوامل جو انسانی تاریخ کے مختلف
ادوار میں وحشی اور نیم وحشی افراد کے خوف و وحشت کا موجب تھے آج اُن
لوگوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو باشعور اور علمی کمال سے بہرہ ور
ہیں۔

تجربہ اس حقیقت کا بہترین گواہ ہے کہ آگاہی و واقفیت خوف و وحشت کی
جگہ سکون و راحت کو دے دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی بنیاد پر تمام نفسیات داں
محض مجہول سے آشنائی اور باعثِ آزار خوف کی پیدائش کے اسباب سے
واقفیت کو وحشت انگیز خیالات اور تشویش کے علاج کا ایک حصّہ شمار کرتے
ہیں۔

اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اگرچہ علمی ترقی کے نتیجہ میں
قدیم وحشت میں قابلِ لحاظ کمی واقع ہوئی ہے لیکن دوسری طرف لوگوں کی
زندگیوں میں رونما ہونے والے جدید تغیّرات کے نتیجہ میں گزشتہ بے بنیاد اور
لغو خوف و ہراس کی جگہ ایک نئے اضطراب نے لے لی ہے۔ صنعتوں کے قیام
کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر وجود میں آئے ہیں۔ ان شہروں کے کثیر آبادی پر

مشتمل ہونے کے باوجود ان کے باسی دن بدن تنہا تر ہو رہے ہیں اور ان کی روح
آپسی محبت اور باہمی الفت سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ اخلاص اور مہر و محبت
جو گزشتہ زمانے کے لوگوں کے روابط پر حاکم تھے آج اُن کی جگہ اجنبیت اور
بے حسی کا احساس غالب ہے۔ لوگوں کے مختلف طبقات کی ایک دوسرے سے
دوری نے بیگانگی اور بے کیفی کا احساس شدید کردیا ہے اور اس کے باوجود کہ
سب ایک دوسرے کے جوار میں زندگی بسر کرتے ہیں ایک دوسرے کو نہیں
جانتے اور ایک دوسرے کی اخلاقی و نفسیاتی خصوصیات سے نا آشنا ہیں اور ایک
دوسرے کی مدد اور دلجوئی کی ضرورت کے وقت شدّت کے ساتھ بخل سے کام
لیتے ہیں۔

بے مہری، بے انصافی، گوناگوں خرابیاں اور اپنی ذمہ داری سے پہلوتہی
ہراس و اضطراب کا موجب ہیں۔ دراصل خوف ایک طرح کی سزا ہے جو انسان
کو فضائل کی راہ سے انحراف کی بنا پر ملتی ہے۔

ایک امریکی مفکّر کے بقول:

"اجتماعی روابط کے دوران محبت و مواسات میں کسی بھی قسم کا نقص
شدید سزا کا موجب ہوتا ہے۔ یہ سزا جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں "خوف"
ہے۔ جب تک میں اپنے ہم نشینوں سے اخلاص کے ساتھ میل جول
رکھتا تھا اُن سے ملاقات میں کسی طرح کی کراہت محسوس نہ کرتا تھا۔
ہماری روحیں بھی بے رنگ پانی کی مانند ایک دوسرے میں مدغم ہوتی
ہیں، ہوا کی مانند باہم مخلوط ہوتی ہیں۔ لیکن جوں ہی ہمارے اندر
اخلاص کی کمی واقع ہوتی ہے، ہمارے دو نیم ہونے کا عمل شروع

ہوجاتا ہے۔ ہم جو چیز اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہ دوسرے کے لئے پسند نہیں کرتے، ہمارا ہمسایہ ہم سے آزردۂ خاطر ہوجاتا ہے، وہ ہم سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے جتنا ہم اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

اب اس کی آنکھیں ہمیں تلاش نہیں کرتیں۔ ہماری فطرت کے درمیان جنگ کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اس کے دل میں نفرت پیدا ہوجاتی ہے اور میرے دل میں اس سے خوف بیٹھ جاتا ہے۔

جہاں بھی بے اعتباری اور ایک دوسرے سے خوف ہوگا وہاں لازماً فساد رونما ہوگا۔" (فلسفہ اجتماعی۔ ص ۳۸۶)

امید و بیم دونوں فطری ہیں

فطرتاً انسان میں امید و بیم دونوں پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں عناصر پیدائش کے وقت ہی سے انسان میں موجود ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ درد و رنج اور فقر و ناتوانی کا خوف وہ احساس ہے جو انسان کے باطن سے سر ابھارتا ہے۔ دوسری طرف انسان امن، راحت، تمکین اور آسودگی۔۔۔۔ کی امید رکھتا ہے، ہر آرزو کے بر آنے کے بعد بلا فاصلہ انسان کے دل میں ایک نئی آرزو جنم لے کر گزشتہ آرزو کی جگہ لیتی ہے۔

خوف و رجا زندگی کے افکار و اعمال اور ہدف و سمت کو معیّن کرتے ہیں اور انسان ان کی قسم اور پیمانے کی مناسبت سے زندگی کی راہ کا انتخاب کرتا ہے۔ ایسا شخص جس کے افکار پر مال و دولت، مرتبہ و مقام کی آرزو کا قبضہ ہو وہ اسی بنیاد پر اپنا ہدف معیّن کرتا ہے اور ایسے اقدامات اٹھاتا ہے جو اسے اس

ہدف تک پہنچانے والے ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو ایسے ہی وسائل کے حصول میں صرف کرتا ہے جن کے ذریعہ وہ جلد از جلد اپنے آمال و آرزوں تک جا پہنچے۔

لیکن ایک ایسا شخص جس نے خود کو اس قسم کی خواہشات کی اسیری سے آزاد رکھا ہو وہ کسی صورت اپنی قوتوں کو بے قید و شرط ان اہداف کی راہ میں صرف نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنے نفس کا مالک اور اس قسم کی خواہشات کی غلامی سے آزاد ہے۔

اسلام بیم و امید پر تکیہ کرتے ہوئے ہر قسم کے ایسے خوف و ہراس کو جو حالات و واقعات میں کسی تبدیلی کا موجب نہیں ہوتا بلکہ روح پر ایک طرح کا بوجھ بن جاتا ہے دور پھینک دیتا ہے۔ کیونکہ ایسی تشویش و اضطراب جو حقائق کی تلخی کو کم نہ کرسکے کسی کام کی نہیں۔ نیز یہ بھروسہ نفس کو دنیاوی امور اور زندگی کی زوال پذیر نعمتوں سے وابستگی سے بھی آزاد کرتا ہے، میدانِ عمل میں کوشش و کاوش پر ابھارتا ہے اور اسی طرح انسان کے باطن سے گمراہ کردینے والی ہر چیز نکال کر روح کو انحراف و کجی سے دور رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان گرانقدر اور طاقت ور زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور خداوندِ عالم کی لازوال قدرت و قوت کے سوا کسی اور چیز کو بھروسہ کے لائق نہیں سمجھتا۔

اسلام کہتا ہے کہ انسان کو رعب و دہشت میں مبتلا رکھنے والے عام عوامل نہ تو ذاتاً اس قابل ہوتے ہیں کہ کسی کو سود و زیاں پہنچا سکیں اور نہ ہی از خود کسی کی کوئی مدد کرسکتے ہیں لہٰذا ان سے خوف و ہراس بے جا ہے۔ صرف وہ زبردست قدرت خوف کے لائق ہے جس کے سلطہ و اقتدار اور تصرف میں تمام

موجودات کائنات ہیں اور جو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

قرآنِ کریم اس حقیقت کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کرتا ہے۔

"قل من یرزقکم من السماء والارض امن یملک السمع والابصار ومن یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی و من یدبر الامر فسیقولون اللہ فقل افلا تتقون"

("پیغمبرؐ) ذرا ان سے پوچھئے کہ زمین و آسمان سے کون تمہیں رزق دیتا ہے؟ اور کون ہے جس نے تمہیں آنکھ و کان عطا کئے؟ اور کون مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے؟ اور کون سارے امور کی تدبیر کرتا ہے؟ تو یہ سب یہی کہیں گے کہ "اللہ"۔ تو آپ کہئے کہ پھر اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔" (سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۳۱)

دوسری طرف انسان کیونکہ فطرتاً طرح طرح کی لذائذ و نعمات اور دنیاوی کامرانیوں کا خواہاں ہوتا ہے لہٰذا اسلام کسی کو ان پاکیزہ نعمات سے اور لذّتوں سے محروم رہنے کی تلقین نہیں کرتا اور دنیاوی امور سے انصراف و چشم پوشی پر نہیں ابھارتا۔ لیکن اسلام انسان کا رخ جھوٹی اور ناپائیدار خواہشات سے موڑ کر حقیقی اور واقعی آرزوؤں کی جانب کرتا ہے اور بشر کو ناپائیدار لذّتوں کے فریب سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے اور اسے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ شہوات اور نفسانی خواہشات میں اس قدر غرق نہ ہو کہ حقیقی اور جاویدانی لذّتوں کے حصول سے محروم رہ جائے۔ اور ہرحال میں اس کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے کہ پیہم خوشنودیٔ رب اور رضائے الٰہی کا طلبگار رہے۔

"وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون"

"اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے کاش یہ لوگ جانتے۔"

(سورہ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۴)

اسلامی تعلیمات میں جو بار بار خوفِ خدا کی تاکید کی گئی ہے وہ دراصل خود اپنے اعمال سے خوف کی تاکید ہے۔ اس قسم کا خوف نہ صرف زیاں کا سبب نہیں بلکہ نہایت وسیع و فراواں فوائد کا حامل ہے جو انسان کے تمام اعمال و افعال پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بُرے اعمال کے ناگوار نتائج کا خوف انسان کو ان سے پرہیز پر آمادہ کرتا ہے' ضرر رساں غرائز پر کنٹرول کرتا ہے اور انسان میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔

خوفِ خدا کے بغیر خداوندِ عالم سے محض بے انتہاء رحمت کی امید رکھنا انسان کو بے لگام کردیتا ہے اور بہت سے مفاسد کا سبب ہے۔

ایسا شخص جس کا قلب خداوندِ عالم سے فقط (رحمت کی) امید سے لبریز ہو وہ بلاخوف و خطر ہر عمل کا ارتکاب کرتا ہے اس کے باوجود ذاتِ الٰہی سے (رحمت کی) امید رکھتا ہے۔ ممکن ہے اس کے تمام اعمال و کردار تباہ و برباد ہوجائیں پھر بھی اس سے رحمت کی امید ذرّہ برابر کم نہ ہو۔

بنابرایں ذاتِ الٰہی سے بے خوفی انسان کے اعمال کی تباہی و بربادی پر منتج ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اسلامی تعلیمات تاکید کرتی ہیں کہ انسان خوف اور امید کے درمیان درمیان رہے۔ یعنی خداوندِ عالم کی بے کنار رحمت کی امید کے ساتھ ساتھ اپنے اعمالِ بد سے خوف زدہ رہے اور اپنے کردار کے بارے میں غرور و نخوت کا شکار نہ ہو۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"الخوف رقیب القلب والرجاء شفیع النفس و من کان باللہ عارفاً کان من اللہ خائفاً والیہ راجیاً، وھما جناحا الایمان، یطیر بھما العبد المحقق الی رضوان اللہ، و عنیاً عقلہ یبصر بھما الی وعداللہ و عبدہ، والخوف طالع عدل اللہ باتقاء و عبدہ والرجاء داعی فضل اللہ وھو یحیی القلب، والخوف یمیت النفس"

"خوف انسان کے قلب کا نگہبان ہوتا اور امید نفس سے اس کی خواہشات کی سفارش کرتی ہے۔ جو شخص خدا کو پہچانتا ہے وہ اس سے خوفزدہ رہنے کے ساتھ ساتھ امید بھی رکھتا ہے۔ یہ دونوں (خوف و امید) ایمان کے دو پر ہیں اور خدا کے وہ بندے جو نظامِ ہستی اور خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں ان پروں کے ذریعہ خدا کی رضا کی جانب پرواز کرتے ہیں۔ وہ خدا سے خوف و امید کو اپنی عقل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ خداوندِ عالم کا خوف انہیں اس کی عدالت جو اس کی عین ذات ہے کی طرف متوجہ کرتا ہے اور عذاب کے جو وعدے اس نے کئے ہیں ان سے ڈراتا ہے۔ جب کہ امید اللہ کے فضل و کرم کی جانب راغب کرتی ہے۔

امید دل کو حیات اور زندگی بخشتی ہے اور خوف نفس کی سرکوبی کرتا ہے۔" (محجۃ البیضا۔ ج۷۔ ص ۲۸۳)

ایسے افراد جو علم و ایمان کے اسلحہ سے لیس ہوں اور جن کے دامن گیر خداوندِ عالم کی عادلانہ سزا کا خوف ہو، الٰہی احکام و فرامین کی پابندی کے سلسلہ میں ان کا محرّک خداوندِ عالم کے اوامر کی اطاعت اور اس کے منہیات سے پرہیز ہوتا ہے۔

جیسے کسی خطرہ کا پیشگی علم انسان کو اس کے تدارک پر آمادہ کرتا ہے اسی طرح عذابِ الٰہی کا خوف انسان کو اپنے ہمہ جانبہ فرائض کی ادائیگی پر راغب کرتا ہے، گناہ کی آلائشوں سے آلودہ ہونے سے باز رکھتا ہے اور اس بات کا موجب ہوتا ہے کہ انسان ہر حال میں اور ہمیشہ اپنی حقیقی کامیابی اور سعادت کو پیشِ نظر رکھے۔

قرآنِ کریم علم و دانش کو اس عامل کے بطور متعارف کراتا ہے جو انسان میں خوف پیدا کرکے اس کو خطروں سے آگاہ کرتا ہے۔

"انما یخشے اللہ من عبادہ العلمٰؤا"

"اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں صرف صاحبانِ معرفت ہیں۔" (سورۂ فاطر۳۵۔آیت۲۸)

بے شک علم و دانش اپنے حامل کو دانشمندوں کی صف میں لے جاتا ہے، باطن کی پاکیزگی اور تہذیب و تزکیہ نفس کا موجب ہوتا ہے، حصولِ کمال کے سلسلہ میں روح کے کام آتا ہے، خداوندِ عالم کی بے پایاں قدرت اور حق کی پرستش کی جانب رہبری کرتا ہے۔ علم ہی انسانی عقل و ضمیر کو جرم و معاصی سے آلودہ نہیں ہونے دیتا بلکہ نظامِ ہستی کی خلقت اور پروردگارِ عالم کی عظمت کے بارے میں فکر کے اہم ترین اسباب میں سے ہے۔

"الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا' سبحانک فقنا عذاب النار"

"جو لوگ اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں۔ کہ خدایا تو نے یہ سب بے کار پیدا نہیں کیا ہے۔ تُو پاک و بے نیاز ہے ہمیں عذابِ جہنم سے محفوظ فرما۔" (سورۂ آل عمران ۳۔آیت ۱۹۱)

قرآنِ کریم دوُر اندیشی اور ہدایت کو بھی خوف و خشیتِ الٰہی کی پیداوار قرار دیتا ہے۔

"سیذکر من یخشیٰ"

"جو شخص ڈرتا ہے وہ نصیحت قبول کرے گا۔"

(سورۂ اعلیٰ ۸۷۔ آیت ۱۰)

ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ سے دریافت کیا کہ آیت کریمہ "والذین یؤتون ما اتوا و قلوبھم وجلۃ انھم الیٰ ربھم راجعون" (اور وہ لوگ جو بقدرِ امکان راہِ خدا میں دیتے رہتے ہیں اور انہیں یہ خوف لگا رہتا ہے کہ پلٹ کر اسی کی بارگاہ میں جانے والے ہیں۔" سورہ مومنون ۲۳ آیت ۶۰) سے مرّاد کیا ایسا شخص ہے جو چوری' زنا اور شراب نوشی جیسے قبیح اعمال انجام دیتا ہو اور خدا سے بھی ڈرتا ہو؟

آنحضرتؐ نے فرمایا : "اس سے مراد ایسا شخص ہے جو نماز قائم کرتا ہو' روزہ رکھتا ہو' دوسروں کی مدد و اعانت کرتا ہو اور ساتھ ساتھ یہ خوف بھی رکھتا

ہو کہ نہ جانے یہ اعمال بارگاہِ خدا میں قبول بھی ہوں گے کہ نہیں۔"

ضرر رساں اور مذموم وہ خوف ہے جس کا سرچشمہ پستی و کمزوری ہو۔ ایسا خوف نہ صرف سودمند اقدامات کے لئے محرّک کا کام نہیں کرتا بلکہ انسان کی سعادت' پیشرفت اور ترقی میں سدِراہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشوایانِ اسلام اپنے پیروکاروں کی تربیت و پرورش کے دوران عقل و ایمان کی قوت سے استفادہ کی تاکید کرتے ہیں اور اس طرح انہیں ایسے غیرواقعی خوف و ہراس سے چھٹکارا دلاتے ہیں جو عزم و ارادہ کو متزلزل اور اعتمادِ نفس کی حس کو نابود کردیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب خوارج کے خلاف جنگ کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو آپؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے جو علمِ نجوم سے واقفیت رکھتا تھا آپؑ سے کہا : اے امیرالمومنینؑ! اگر آپ اس وقت میدانِ جنگ کے لئے نکلے تو علمِ نجوم کی رو سے مجھے اندیشہ ہے کہ آپؑ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

یہ سن کر امیرالمومنینؑ نے فرمایا :

"کیا تمہارا خیال ہے کہ تم ایسی گھڑی کا پتہ دیتے ہو کہ اگر کوئی اس میں نکلے گا تو اس کے لئے کوئی برائی پیش نہ آئے گی اور اس لمحہ سے خبردار کرتے ہو کہ اگر کوئی اس میں نکلا تو اسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تو جس نے تمہاری بات کو صحیح جانا اور اس کی تائید کی' اس نے خدا کو جھٹلایا اور مقصد کو پانے اور مصیبت کو دور کرنے کے سلسلے میں خود کو اللہ کی مدد سے بے نیاز سمجھا۔

تم ایسی باتوں کے ذریعہ یہ چاہتے ہو کہ تمہاری باتوں کی پیروی کرنے والا تمہارے گُن گائے اس لئے کہ تم نے اسے کام کا آغاز کرنے کی اس ساعت کا پتہ بتایا ہے جو اس کے لئے فائدہ کا سبب یا نقصان سے بچاؤ کا ذریعہ بنی۔

پھر جنابِ امیر علیہ السلام اپنے سپاہیوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: "اللہ کا نام لے کر محاذِ جنگ کی طرف چل پڑو۔"

(نہج البلاغہ فیض۔ص ۱۶۸۔ خطبہ نمبر ۷۷)

یوں امیرالمومنینؑ نے اس بے بنیاد گفتگو کو خاطر میں لائے بنا اور اس کی پیش گوئی سے متاثر ہوئے بغیر سربازانِ اسلام کو خداوندِ عالم کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے محاذِ جنگ کی جانب روانگی کا حکم دیا اور بالآخر اس جنگ میں حضرت علیؑ کو فتح نصیب ہوئی اور دشمن کو شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

امیرالمومنینؑ ایک کلام میں اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ۔

" اذا خفت صعوبه امر فاصعب له یذل لک و خادع الناس عن امثاله تهن علیک"

"جب بھی کسی کام کی مشکل تمہیں خوفزدہ کرے، اس کے سامنے ڈٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ کام تمہارے لئے آسان ہوجائے۔ تمام تر دشواریوں کے باوجود اس کام کو دوسروں کے سامنے سادہ اور آسان ظاہر کرو اس طرح خود بخود تمہارے سامنے کامیابی کی راہ ہموار ہوجائے گی۔" (غررالحکم۔ص ۳۱۹)

اس بارے میں نفسیات دان کہتے ہیں کہ۔

"ہم زندگی میں روزانہ متعدد ایسے افراد سے ملتے ہیں جنہوں نے خود پر خوف و ہراس کو اس قدر مسلّط کرلیا ہے کہ اس نے انہیں گھٹنے ٹکوا دیئے ہیں۔

بہت سے ایسے ہیں جو خوف کی بنا پر اجتماعی سرگرمیوں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں اور کیونکہ خوف ان پر غالب ہوتا ہے اور یہ اس کے زیرِ تسلط ہوچکے ہیں اس لئے ہر قسم کی ذمہ داری سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

بہت سے طالبِ علم ڈر کی وجہ سے اپنے استاد سے سوال نہیں کرتے یا پھر امتحان کے موقع پر اس قدر خوفزدہ ہوجاتے ہیں کہ جواب دینے (یا لکھنے) کی قوت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض لوگ خوف ہی کی بنا پر اپنی خطاؤں کے اعتراف سے گھبراتے ہیں۔

بکثرت لوگ "نہ" کہنے کی جرات نہیں رکھتے یعنی لوگوں سے اس قدر خوفزدہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت نہ کریں گے تو گویا کسی مشکل میں مبتلا ہوجائیں گے۔ یہ طرزِ عمل انسان پر خوف کو مسلّط ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس صورتِ حال کا استمرار انسان میں سے خوف پر غلبہ پانے کی صلاحیت کم کردیتا ہے اور مشکلات روز بروز اس میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں۔

جو شخص اپنے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے اندر جرات و شجاعت پیدا کرے۔ زندگی گزارنے کے لئے ہر شخص کو جرات و شہامت کی ضرورت ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ انسان میں

بچپنے ہی سے شجاعت پائی جائے۔ اگر ہم جرات و ہمت کو اپنے اندر برقرار رکھیں تو بوقتِ ضرورت ہماری قوت وصلاحیت بڑھ جائے گی۔ ہمارے ہاتھ میں ایک اچھا طریقہ موجود ہے اور وہ یہ کہ خوف پر غلبہ کے حصول کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہے اسے انجام دیں۔ زندگی میں ہر کسی کو عمل انجام دینے کے کچھ مواقع ملتے ہیں۔ لیکن وہ (کبھی آشکارا اور کبھی مخفی) خوف کے زیرِ اثر عمل کی انجامدہی سے عاجز رہتے ہیں۔

مثلاً آپ کو کلاس میں ہونے والی بحث میں شرکت کا موقع ملتا ہے لیکن آپ کا موقف کیونکہ اپنے کسی دوست سے متصادم ہے اور وہ آپ سے محض اس بناء پر اپنے حق میں رائے لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ آپ اُس کی ناراضگی کے خوف سے اُس کی مخالفت میں رائے نہیں دیتے۔ لہٰذا آپ بحث میں بھی شامل نہیں ہوتے اور خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ کا یہ طرزِ عمل خوف کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ حالات کا جائزہ لینے کے بعد حسبِ دلخواہ کام انجام دیں تو آپ اپنے اندر شجاعت پیدا کرسکتے ہیں۔ یہی شجاعت پیدا کرنے کا راستہ ہے، اور جتنی مرتبہ آپ یہ عمل دہرائیں گے اتنا ہی آپ کی شجاعت بڑھتی چلی جائے گی اور رفتہ رفتہ آپ اپنے خوف پر غلبہ پالیں گے۔ یا جرات برقرار ہونے کی بنا پر مشکلات کے حل پر بخوبی قادر ہوجائیں گے۔" (روان شناسی برای زیستن۔ص ۲۹۹)

آج انسان نے بکثرت طبیعی عوامل کے حصول میں کامیابی حاصل کرلی ہے

اس کے باوجود وہ مستقبل میں ناکامیوں، بیماریوں اور مختلف قسم کے خطرات کی وحشت میں مبتلا ہے۔ بے بنیاد خوف اور حیاتِ انسانی کو لاحق خطرات کے اندیشہ ہی ہیں جن کی وجہ سے کتنے ہی زرخیز اور تخلیقی ذہن جمود و رکود کا شکار ہوچکے ہیں۔ اور کتنے ہی نظریات و افکار اور گرانقدر تخلیقات پر فراموشی کی گرد پڑچکی ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

"شر ما فی الرجل شح هالع وجبن خالع"

"وہ بدترین صفات جو ممکن ہے انسان کے وجود میں رچ بس جائیں ان میں سے ایک انتہائی کنجوسی اور دوسرے حد سے زیادہ خوف ہے۔" (نہج الفصاحہ۔ص ۳۸۲)

ضعفِ ارادہ

ارادے کی کمزوری نامعقول اندیشوں کی پیداوار ہے۔ ممکن ہے شک وشبہ کی حالت ایک گہرے خوف کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ کسی بھی مسئلہ کے بارے میں شک و تردید اس پر ایمان کو متزلزل کردیتا ہے۔ لہٰذا جو شخص ابھی ایمانِ کامل کی منزل تک نہ پہنچا ہو وہ مسلسل شک و شبہ کے تیروں کے ہدف پر رہتا ہے اور ایسے لوگوں میں عام طور پر تزلزل اور غیرارادی پن کی صفات پائی جاتی ہیں۔

باایمان شخص اپنے امور اور مقاصد کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ذہن آزردہ کردینے والے ہراس و اضطراب سے خالی ہوتا ہے۔

ایسا شخص جس کی روح ایمان اور خلوصِ نیت سے سرشار ہو اور جو خداوندِ عالم سے اٹوٹ بندھن میں بندھا ہو وہ دنیا کی ہر فاسد قوّت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اگر باطل سے مقابلہ کے دوران اس کی مادّی قوتیں شکست کھا بھی جائیں تب بھی وہ خود کو بے آسرا نہیں سمجھتا کیونکہ اسے خداوندِ عالم کی ذات پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے اور اسی کی حقیقی رہبری کے طفیل اس نے ہدایت پائی ہے۔

تباہیوں پر غلبہ حاصل کرنا اور گمراہوں کو راہِ راست کی ہدایت کرنا اسلامی عقیدہ کا وہ بنیادی عنصر ہے جو ایسے شخص کی سرشت میں پایا جاتا ہے اور وہ خداوندِ عالم کی لازوال قدرت کے سائے میں مادّی قوتوں کو جو کائنات کی واحد حقیقت نہیں، اپنی قوتِ ارادی کے زیرِ تسلّط لے آتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اہلِ مصر کے نام اپنے ایک مکتوب میں ایمانِ کامل کے حامل اپنے گورنر کی روحانی قوت اور شجاعت کی ستائش کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ تمہاری طرف بھیجا ہے جو خطرے کے دنوں میں سوتا نہیں اور خوف کی گھڑیوں میں دشمن سے ہراساں نہیں ہوتا اور فاجروں کی بھڑکائی ہوئی آگ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے کہ جس کی نہ دھار کُند ہوتی ہے اور نہ اس کا وار خالی جاتا ہے۔" (نہج البلاغہ فیض ص ۹۴۲۔ مکتوب نمبر ۳۸)

جنگِ صفین کے زمانہ میں معاویہ کی سپاہ نے فرات کے گھاٹ پر قبضہ کر کے حضرت علیؑ کے اصحاب اور سپاہیوں پر پانی بند کر دیا۔ امیرالمومنینؑ نے مذاکرات کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن معاویہ جو دریا کے کنارے پر قبضہ کو اپنی فتح سمجھ رہا تھا کسی صورت بات چیت پر آمادہ نہ ہوا۔

یہاں امیرالمومنینؑ کی افواج پانی کی شدید قلت کا شکار تھیں، جب سپاہیانِ اسلام کی تشنگی اپنی انتہاؤں کو چھونے لگی تو جنابِ امیرؑ اپنے اصحاب سے یوں مخاطب ہوئے۔

"قد استطعموكم القتال، فاقروا على مذلة و تأخير محلة اوردوا السيوف من الدماء ترووا من الماء، فالموت في حياتكم مقهورين و الحياة في موتكم قاهرين، الا وان معاوية قاد لمة من النواة و عمس عليهم الخبر حتى جعلوا نحورهم اغراض المنية"

"دشمن تم سے جنگ کے لقمے طلب کر رہا ہے۔ اب تمہارے پاس صرف دو راستے ہیں یا تو تم ذلّت و حقارت سے سرِ تسلیم خم کر دو یا شمشیروں کو خون سے سیراب کر کے پانی سے اپنی پیاس بجھالو۔ تمہارا ان سے دب جانا جیتے جی موت کے مترادف ہے اور زندگی یہ ہے کہ خواہ جان سے گزر جانا پڑے لیکن ان پر غالب ہو جاؤ۔ معاویہ گمراہ سرپھروں کا ایک چھوٹا سا جتھا لئے پھرتا ہے اور ان سے حقائق چھپائے ہوئے ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے سینوں کو

تمہارے تیروں کا ہدف بنالیا ہے۔"

(نہج البلاغہ فیض۔ص۱۲۹۔خطبہ نمبر۵۱)

حضرت علیؑ کے اس پرجوش خطاب نے سپاہیانِ اسلام میں ایک ولولہ پیدا کردیا، ان کی رگوں میں خونِ شجاعت زور مارنے لگا اور ان کے بھرپور حملہ سے معاویہ کی افواج گھاٹ چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اب دریا حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن آپؑ نے کمالِ عفوو درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں کو پانی سے استفادہ کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی۔

شجاعت کا وسیع مفہوم

شجاعت صرف میدانِ جنگ میں بہادری و بے خوفی کے مظاہرے ہی کا نام نہیں بلکہ یہ تمام مراحلِ حیات پر محیط ہے اور مختلف میدانوں میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

"ڈاکٹر مارڈن" مختلف مواقع پر روحانی خصوصیات کی قدر و قیمت کو یوں بیان کرتا ہے۔

"شجاعت ایسے شخص کی بھی ضرورت ہے جو کھدّر کا لباس پہنے ہو جب کہ اس کا دوست مخمل کا لباس زیبِ تن کئے ہو۔ شجاعت چاہئے ایسے شخص کو بھی جس کے سامنے لوگ دھوکہ دہی اور ہیرا پھیری سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہوں اور وہ راہِ راست پر چلتے ہوئے نادار رہے۔ شجاعت چاہئے اسے بھی جو نہایت بے نیازی سے اس وقت "نہ" کہے جب دوسرے "ہاں" کہہ رہے ہوں۔ شجاعت

چاہئے ایسے شخص کو بھی جو اپنا فریضہ خاموشی اور گمنامی سے انجام دیتا رہے جب کہ دوسرے اپنے مقدس فرائض کو ترک کرکے مال و دولت اکھٹی کرنے میں لگے ہوں اور مشہور بھی ہورہے ہوں۔ شجاعت ضروری ہے اس کے لئے بھی جو جو ہے وہی ظاہر کرے اور اپنے تمام معائب کو نکتہ چینی کرنے والوں کے سامنے ظاہر کردے۔ المختصر شکست کے نتیجہ میں طنز برداشت کرنے کے لئے بھی شجاعت درکار ہے۔"

"ایسا جوان جو آغازِ کار ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے خوفزدہ رہتا ہے وہ انجامِ کار میں حتیٰ اپنی مرضی کے مطابق غور و تامل سے بھی ڈرے گا۔

ہم اپنی مرضی کے مطابق کتنے ہی کام انجام دینے سے خوفزدہ رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کی مانند زندگی بسر کریں، لباس، طرزِ بود و باش، وسائلِ نقل و حمل خلاصہ یہ کہ ہر چیز جدید فیشن کے مطابق اپنانا چاہتے ہیں وگرنہ خود کو معاشرہ سے علیحدہ تصوّر کرتے ہیں۔"

"اس بات کے لئے بھی جرات ضروری ہے کہ انسان عام لوگوں کے خیالات کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے اور ایسے مراسم جو اخلاق کی سلامتی کے لئے ضرر رساں ہوں ان کی متابعت سے باز رہے۔"

(اسرارِ کامیابی۔ص۱۴)

اربابِ زور و قدرت اور غاصب حکمرانوں سے بے اعتنائی اور انہیں خاطر

ں نہ لانا اسلام کے تربیتی مکتب کے پیروکاروں کی نمایاں خصوصیت تھی۔ یہاں ں کہ یہ ہستیاں سخت ترین حالات میں بھی اپنی معنوی اور روحانی قوتوں کو فوظ رکھتی تھیں۔

"اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک مراسمِ حج کی غرض سے مکّہ آیا۔ ایک روز اس نے حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو دربار میں حاضر کیا جائے جو رسولِ مقبولؐ کے حضور میں رہا ہو تاکہ وہ اس سے چند مسائل دریافت کر سکے۔ خلیفہ کو بتایا گیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے اصحاب میں سے کوئی بھی اب بقیدِ حیات نہیں۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو تابعین میں سے کسی کو حاضر کرو تاکہ اس سے مستفیض ہو سکوں۔ "طاؤس یمانی" اس وقت مکّہ میں موجود تھے انہیں خلیفہ سے گفتگو اور اس سے ملاقات کی دعوت دی گئی۔

"طاؤسِ یمانی" دربار میں داخل ہوئے، عین خلیفہ کے سامنے اپنی جوتیاں اتاریں۔ اس زمانہ میں خلیفہ کو امیرالمومنین کہا جاتا تھا اور دربار میں حاضر ہونے والا خاص آداب سے دربار میں داخل ہوتا اور یاامیرالمومنین کہہ کر بادشاہ کو مخاطب کرتا تھا لیکن "طاؤسِ یمانی" نے جوتیاں اتارنے کے بعد ان تمام فضول آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلند آواز میں السلام علیکم کہا۔ بلا تکلف زمین پہ بیٹھے اور ہشام کی احوال پرسی کرنے لگے۔

ان کی بے تکلف رَوِش اور گفتگو ہشام کو بہت ناگوار گزری، طیش میں آکر طاؤس سے بولا : یہ تم نے کیا طریقہ اختیار کیا ہے؟

طاؤس نے اپنا قصور دریافت کیا۔

خلیفہ نے کہا : تم نے میرے سامنے اپنی جوتیاں کیوں اتاریں؟، مجھے امیرالمومنین کے لقب سے کیوں مخاطب نہیں کیا؟ میری اجازت کے بغیر یہاں سامنے زمین پر کیوں آ بیٹھے؟ اور اہانت آمیز لب و لہجہ میں کیوں میری احوال پرسی کی؟

طاؤس نے جواب دیا : تیرے پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں اس طرح جوتیاں اتار کر دن میں پانچ مرتبہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہوں لیکن کبھی اس وجہ سے خدا نے مجھے عقاب کا نشانہ نہ بنایا۔

تیرے دوسرے اعتراض کے جواب میں یہ کہوں گا کہ تو تمام مومنین کا امیر نہیں ہے بہت سے اہل ایمان تیری حکومت و خلافت سے ناراض ہیں اور تجھے اپنا امیر تسلیم نہیں کرتے۔

میں نے تیرا نام لے کر اس لئے پکارا ہے کہ خداوندِ عالم بھی اپنے پیغمبروں کو ان کے نام سے پکارتا ہے اور قرآن میں انہیں یا داؤد، یا عیسیٰ، یا یحییٰ سے مخاطب کرتا ہے اور کوئی اس بات کو انبیاءؑ کی اہانت قرار نہیں دیتا۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم ابولہب کو اس کی کُنیّت سے یاد کرتا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں تیری اجازت لئے بغیر زمین پر کیوں بیٹھ گیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے امیرالمومنین حضرت علیؑ سے سنا ہے کہ۔

"اگر اہلِ دوزخ کو دیکھنا چاہتے ہو تو ایسے لوگوں کو دیکھو جو خود تو

طمطراق سے بیٹھے ہوں اور دوسرے لوگ ان کے گرد حلقہ بنائے کھڑے ہوں۔"

ہشام لاجواب ہوگیا اور طاؤس سے بولا۔ مجھے نصیحت کرو۔

طاؤس نے کہا: میں نے حضرت علیؑ سے سنا ہے کہ "دوزخ میں خاص قسم کی موجودات ظالم و بے انصاف حکمرانوں کو ڈسنے پر مامور ہیں۔"

طاؤس اپنی گفتگو یہیں ختم کرکے اٹھ کھڑے ہوئے اور فوراً خلیفہ کی مجلس سے باہر تشریف لے گئے۔" (سفینۃ البحار۔ج۲۔ص۹۵)

ریاکاری خوف کا ردِّ عمل ہے

ریاکاری انسانی ضمیر میں پوشیدہ خوف و ہراس کا ردِّ عمل ہے جب کہ شجاعت انسان کو ریاکاری کی قید سے نجات بخشتی ہے اور اس کی روح کو حقائق سے پیوست کرتی ہے۔

"والڈ ایمرسن" کہتا ہے۔

"ہمیں اپنے وجود میں حالتِ جنگ ایجاد کرنے دو اور شجاعت و استقامت کو اپنے باطن میں ابھارنے دو۔ ہمیں اس کام کو زندگی کے خوشگوار اور آسودہ اوقات میں حقیقت گوئی کے ذریعہ انجام دینا چاہئے۔ اپنی جھوٹی مہمان نوازی اور جھوٹی محبت کی روک تھام کرو' اب اس کے بعد فریب خوردہ' فریب کار اور اپنے مخالف لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا چھوڑ دو۔

ان سے صاف صاف کہہ دو کہ میں نے اب تک ریاکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہارے ساتھ وقت گزارا لیکن آج کے بعد میرا اور تمہارا تعلق حقیقت پر مبنی ہوگا۔ اب میں ازلی اور ابدی قانون کے سوا کسی قانون کی پابندی نہ کروں گا۔

اگر تم لوگ جیسا کہ میں حقیقت میں ہوں اسی حال میں مجھے دوست رکھتے ہو تو خوش آمدید وگرنہ میں تمہاری نیک تمناؤں کا طلبگار ہوں۔

اب مجھے اعتماد رہے گا کہ میرے وجود کی گہرائیوں میں جو کچھ ہے وہ مقدس ہے اور میں ان کاموں کو جو میرے باطن کی شادمانی اور قلبی رجحان کے مطابق ہوں گی روزِ روشن اور سیاہ راتوں میں نہایت قوت کے ساتھ انجام دیتا رہوں گا۔

اگر ہم حقیقت کی پیروی کرنے لگیں تو بالآخر ریا کی قید سے نجات حاصل کرلیں گے۔

لازماً آپ کی نظر میں بھی اپنے دوستوں کے لئے میرا یہ رویّہ ناگوار ہوگا۔ آپ کا خیال درست ہے لیکن آپ ہی بتایئے کہ کیا میں اپنی آزادی اور قدرت کو ان کے احساسات پر فدا کردوں؟---- یقیناً ایک دن ضرور آئے گا جب سب لوگ زندگی کے بارے میں تعقّل سے کام لیں گے اور جب وہ حقیقتِ مطلّق کی قلمرو میں قدم رکھیں گے تو بالکل صحیح صحیح میرے عقیدہ کے معتقد ہوجائیں گے اور یہی کام کریں گے۔" (فلسفہ اجتماعی ص۳۲۵)

ذاتی استعداد سے شجاعت کو ایسی ہی نسبت ہے جیسی نسبت ارادہ کو قابلیت سے ہے۔ چنانچہ انسان کتنی ہی قابلیت کا مالک کیوں نہ ہو جب تک اپنے قوی ارادہ سے مدد نہ لے گا اس کے لئے کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ اسی طرح تیز ہوش اور قوی ادراک کے حامل شخص کی استعداد اگر شجاعت کے ساتھ نہ ہو تو وہ کسی عالی و ارجمند ہدف تک رسائی حاصل نہ کرسکے گا۔ بہادر آدمی کسی صورت سختیوں اور دشواریوں کے سامنے کمزور نہیں پڑتا اور زندگی میں آپڑنے والے ناگزیر مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

وہ شخص بے چارہ کہلانے کے لائق ہے جس کی امیدیں دراز ہوں لیکن اس میں شجاعت نہ ہونے کے برابر ہو۔

مفکّرین متفق ہیں کہ اپنے آپ کو امیدوں اور آرزوؤں کے حصار میں مقید ہونے سے محفوظ رکھتے ہوئے انسان کو عملی ہونا چاہئے۔ بصورتِ دیگر ضعف اور سستی اس کے سامنے ہمیشہ ممکنات کو ناممکن بنا کے پیش کرتے ہیں۔

یہ بات بھی گرہ میں باندھ کر رکھنی چاہئے کہ کارزارِ حیات میں بعض مواقع پر بڑھ کر میدان میں کودنا پڑتا ہے اور اس کے برعکس بسا اوقات فرار کو قرار پر ترجیح دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ ایسے افراد جن کا ارادہ ہے کہ اپنے معاملات کے سلسلہ میں کسی صورت سستی کا مظاہرہ نہ کریں گے اور خطرات سے منہ نہ موڑیں گے ممکن ہے اپنے عزم میں بامرّاد رہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ اپنی زندگی محفوظ رکھ سکیں۔

نامور شخصیات سب سے پہلے خوف پر غالب آجانے کا ثبوت دیتی ہیں اور زندگی کی حفاظت کے سلسلہ میں اس کی اہمیت گھٹائے بغیر خوف و ہراس کے

خلاف مقاومت و استقامت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان خوف کا اظہار کئے بغیر بعض کامیابیاں حاصل کرلے اور اس کی مساعی نتیجہ خیز ثابت ہوں۔ یہ کامیابی فعالیت کے اس پیمانے سے وابستہ ہے جو وہ خوف کے اظہار سے پرہیز کے لئے کام میں لاتا ہے۔

لیکن ان شرائط کے تحت اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی مسلسل جدوجہد کو کسی محال کام کی انجام دہی کے لئے کام میں لائے اور جب ہدف تک رسائی حاصل نہ کرسکے تو خود کو نالائق اور بے کار سمجھنے لگے اور اس طرح اس کا اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھ جائے اور اپنی بہت سی قوّت و استعداد گنوا بیٹھے جو ممکن ہے کسی اور میدان میں اس کی کامیابی کے لئے مفید و معاون ثابت ہوتی۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"---وللحزم مقداراً فان زاد علیه فهو جبن و للشجاعة مقداراً فان زاد علیه فهو تهور"

"احتیاط اور دوّر اندیشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد سے بڑھ جائے تو خوف بن جاتی ہے اور دلیری و شجاعت بھی ایک حد رکھتی ہے اگر اس سے زیادہ ہوجائے تو گستاخی ہوجاتی۔"

(بحار الانوار۔ ج ۱۷۔ ص ۲۱۸)

خوف و ہراس اور دوّر اندیشی میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ان دونوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ۔

"اذا کان القدر لا یرد فالاحتراس باطل"

"جب حوادث و تقدیر ناقابلِ تغیّر ہوں تو احتیاط بے فائدہ ہوجاتا

ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۳۱۵)

"اذا اقترن العزم بالحزم کملت السعادۃ"

"جب عزم و ارادہ احتیاط اور دوُر اندیشی کے ساتھ کیا جائے تو کامیابی اور سعادت کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔" (غرر الحکم۔ص ۳۱۵)

"برٹرینڈ رسل" کہتا ہے۔

"پوری زندگی خطرات سے پُر ہوتی ہے لیکن عاقل آدمی ناقابلِ گریز خطرات کے مقابل تجاہل سے کام لیتا ہے اور جن خطرات سے بچا جاسکتا ہے ان کا جذبات و ہیجان کی رو میں بہے بغیر نہایت احتیاط سے سامنا کرتا ہے۔

آپ موت سے گریز نہیں کرسکتے لیکن بغیر وصیت کئے مرجانے سے اجتناب کرسکتے ہیں۔ بنابراین اپنی وصیت ہمیشہ لکھ کر رکھئے۔ اس بات کو نہ بھولئے کہ آپکا وجود فانی ہے۔ بدبختیوں کا عاقلانہ انداز میں تدارک اور ان سے احتیاط برتنا خوف نہیں بلکہ حکمت کا حصّہ ہے۔

جب کہ خوف اپنی ہر صورت میں اسیری اور قید ہے۔ اگر آپ خوف سے نجات حاصل کرنے پر قادر نہیں تو کوشش کیجئے کہ آپ کی یہ خصلت آپ کے بچّوں میں سرایت نہ کرجائے۔

اپنے بچّوں میں بلند نگاہی پیدا کیجئے تاکہ وہ اس کے ذریعہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کی روک تھام کرسکیں۔ صرف اسی طرح آپ انہیں آزاد مرد بنا سکتے ہیں۔"

"ان تمام حالات میں جن میں صرف تفکّر و تعقّل کے ذریعہ صحیح راہ

دریافت کی جاسکتی ہے خوف آشفتگی و اضمحلال کا سبب شمار ہوتا ہے اور ایک ذلّت و آفت کا روپ دھار لیتا ہے۔ بنا براین ہمیں چاہئے کہ شر واقع ہونے کے احتمال کی پیش بینی کے موقع پر خوف و ہراس کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیں اور قابلِ اجتناب حوادث سے بچاؤ کے لئے اپنی عقل کو کام میں لائیں۔ ایسے شر جو حقیقتاً قابلِ اجتناب ہیں ان کا شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے۔" (در تربیت۔ص ۸۳ اور ۲۰۱)

مسلّمہ بات یہ ہے کہ خوف و ہراس کے ہوتے ہوئے زندگی میں اٹھنے والی مشکلات کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ آسودہ اور مطمئن قلب اور پُر قدرت و شجاعت روح ہی دشواریوں کی گرہ کھول سکتی ہے ایسا شخص جس کے افکار مسلسل وحشت کے طوفان کی زد پر ہوں اور جس پر خوف مسلّط ہو اس کی نظر میں دنیا تاریک اور غمگین ہوجاتی ہے۔

جو لوگ شجاعت سے عاری ہیں وہ نہیں جانتے کہ زندگی کے مہیب طوفان سے انہیں کہاں پناہ ملے گی۔ ایسے لوگ خوف کے جانکاہ رنج سے نجات کے لئے ہمیشہ خودکشی کے خطرہ سے دوچار رہتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"للشدائد تدخر الرجال"

"مردانِ لائق و شائستہ دشواریاں جھیلنے کے واسطے ذخیرہ کئے جاتے ہیں۔" (غرر الحکم۔ص ۵۸۱)

❑❁❑